اُردو طنز و مزاح پر مبنی دوماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

جولائی، اگست ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مُدیر:

نوید ظفر کیانی

مشاورت:

کے ایم خالد

خادم حسین مجاہد

روبینہ شاہین

محمد امین

ارمغانِ ابتسام

http://www.facebook.com/groups/837838569567305/

برقی ڈاک کا پتہ برائے خط و کتابت

mudeer.ai.new@gmail.com

کیا کیا کہاں کہاں

اداریہ

پرانے چاول

قندِ شیریں

چوکے ہی چوکے

ادب و دب

ہنسپتالیات

مزاحیے

کالم گلوچ

قسطوں قسط

ہزلیات و غزلیات

ولائتی زعفران

کتابی چہرے

نظمالوجی

سفر وسیلۂ ظفر

جستہ خستہ

گوشۂ یوسفی

ادار یہ

عوام کی خدمت ہمارا منشور ،ہم عوام کے تمام مسائل حل کر دیں گے، بے گھروں کو گھر دلائیں گے اور بے روزگاروں کو روزگار۔ملک سے غربت کا خاتمہ کردیں گے، اسلام اور انصاف کا بول بالا ہوگا، آپ ہمیں اسمبلی تک پہنچنے کا موقع دیں پھر دیکھیں ہم آپ کے لئے کیا کرتے ہیں۔۔۔ ہمارا انتخابی نشان۔۔۔ ہے اور۔۔۔ چودھری۔۔۔۔۔۔۔ آپ کے ووٹ کے جائز حق دار ہیں۔''

الیکشن کمپین پر نکلی ہوئی کار کے سپیکر سے مندرجہ بالا ریکارڈ شدہ پیغام بار بار نشر ہو رہا تھا۔اچانک ایک بوڑھی عورت نے اس کار کو ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیور نے ناگواری سے بریک پر پاؤں رکھا۔گاڑی رکتے ہی کار میں سے ایک شخص بولا ''کیا بات ہے مائی! کیا یہاں بھی بھیک مانگے گی؟ دیکھتی نہیں ہم کتنے مصروف ہیں؟ یہ پکڑو دس روپے اور راستہ لو۔"

''نہیں بیٹا میں بھکارن نہیں'' بڑھیا کرب سے بولی ''میں تو تم سے تھوڑی سی مدد چاہتی ہوں میری بس نکل گئی ہے اور اس کے بعد اب کوئی دوسری بس میرے گاؤں نہیں جائے گی، تم مہربانی کرو اور مجھے میرے گاؤں پہنچا دو بس چند کلومیٹر ہی دور ہے اللہ تمھیں لمبی زندگی دے۔''

''مائی ہم اتنے فارغ نہیں کسی اور کو ڈھونڈو ابھی ہمیں اعلان کرنے کئی اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈرائیور نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ بڑھیا وہاں دم بخود کھڑی تھی جبکہ گاڑی سے اب بھی آواز آرہی تھی ''عوام کی خدمت ہمارا منشور!۔۔۔''

بھیا یہ تو بتایئے کہ سیاست دانوں میں ملک و قوم سے وفاداری کے جراثیم کیسے ختم ہو جاتے ہیں؟

''پُر تعیش زندگی، غیر ملکی دوروں، گرانٹوں میں خرد برد، قرضوں کی معافی، رشوت، کمیشن اور جرائم کی سرپرستی کرنے سے ان میں ملک و قوم سے وفاداری کے جراثیم ختم ہو جاتے ہیں جس سے ملک کا مستقبل خطرے میں پڑ جاتا ہے۔''

''ہائے اللہ یہ تو بڑی خطرناک صورتحال ہے ان میں حب الوطنی کے جراثیم دوبارہ کیسے پیدا کئے جاسکتے ہیں؟''

''نیب کی دوائی ان کو وقفے وقفے سے دیتے رہیں تو صورت حال بہتر ہو سکتی ہے۔''

=====

''کشتی دیکھنے کا دل چاہ رہا ہے اکھاڑے پہ چلتے ہیں۔''

''اکھاڑے جانے کی کیا ضرورت ہے ابھی اسمبلی اجلاس کی ریکارڈنگ لگا دیتی ہوں۔''

=====

''بھئی بیگم کے ہاتھ میں تو جادو آ گیا ہے۔''

''جادو تو سیاست کا ہے۔''

خادم حسین مجاہد

ہم نے گواہی دی

ڈاکٹر عابد معز

چھٹی کا دن تھا۔ ہم گھر میں بیٹھے بور ہو رہے تھے۔ بوریت دور کرنے کے لیے اخبارات پڑھ ڈالے، دوستوں سے فون پر غیر ضروری بات کر لی اور دو کپ چائے بھی پی لی تھی لیکن بوریت دور نہیں ہوئی تھی۔ خالی بیٹھے سوچ رہے تھے کہ کیا کریں؟ کچھ سجھائی نہ دیا تو چہل قدمی کرنے کے ارادے سے گھر کے باہر نکلے۔ گھر کے سامنے لوگوں کا جم گھٹا نظر آیا۔ پتا چلا کہ بچوں کی شرارت بڑوں کی لڑائی بن گئی ہے۔ ہمارے پڑوسی جناب شرافت شریف صاحب کا مقابلہ محلّہ کے لڑاکو خاں پہلوان سے چل رہا ہے۔ لڑائی تو تو میں میں تک محدود تھی۔ ابھی ہا تھا پائی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ زبانی لڑائی میں بھی لڑاکو خاں پہلوان کا پلڑا بھاری تھا۔ موصوف گالیاں یوں دے رہے تھے جیسے ان کی مادری زبان یہی ہے۔ شرافت شریف صاحب کو عزت،

شرافت اور اخلاق نے جکڑ رکھا تھا۔ انھوں نے لڑاکو خاں پہلوان کی گالیوں کے جواب میں کہا۔' آپ چپ ہے۔ میں ہوں کہ برداشت کیے جا رہا ہوں اور تو ہے کہ حد سے بڑھتے جا رہے ہیں۔'

''تیری تو۔۔۔'' لڑاکو خاں پہلوان نے پھر ایک گالی دی۔

گالی کھا کر شرافت شریف صاحب کا چہرہ لال پیلا ہوا۔ غصہ سے پھٹی آواز میں کہنے لگے ''آپ حد سے مت بڑھ۔ مجھے دیکھ اور تو دیکھیے۔ شرافت، اخلاق اور مروت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔''

لڑاکو خاں پہلوان کو گالیوں کے بغیر بات کرنا آتا نہ تھا۔ اس نے مزید گالیاں بکیں جن میں سے اکثر گالیاں ہم نے زندگی میں پہلی بار سنیں۔ شرافت شریف صاحب کا پیمانہ صبر لبریز ہوا۔ وہ سر سے پیر تک غصہ میں کانپنے لگے۔ پھر انھوں نے آستین چڑھائی۔ پائنچے اوپر کیے۔ چپل چھوڑی۔ گھڑی اور چشمہ اتار کر بچے کے حوالے کیا اور چار قدم پیچھے ہٹ کر لڑاکو خاں پہلوان پر حملہ کرنے کے لیے دم بھرنے لگے۔

ہم نے انھیں روکا، دیگر پڑوسیوں نے انھیں جکڑا، پھڑ پھڑاتے ہوئے شرافت شریف صاحب کہنے لگے ''مجھے چھوڑ دیجیے صاحب۔ میں اسے مزہ چکھاؤں گا۔ اسے سکھاؤں گا کہ شرافت کیا ہوتی ہے اور شرفا سے کیسے گفتگو کی جاتی ہے۔''

ہمیں یقین تھا کہ اگر ہاتھاپائی ہوئی تو لڑاکو خاں پہلوان ان کا سرمہ بنا دے گا۔ ہم انھیں سمجھانے لگے۔'' آپ لڑائی کیا جانیں، وہ غنڈہ ہے موالی ہے، صبر کیجیے اور اپنے آپ کو سنبھالیے۔''

ڈھیلے پڑتے ہوئے شرافت شریف صاحب نے بھرائی آواز میں کہا ''آپ نے سنا نہیں وہ کیسی نازیبا باتیں کر رہا ہے۔ اس بے عزتی سے بہتر ہے کہ لڑ کر ختم ہو جائیں۔''

ہم نے معاملہ کی سنجیدگی کو بھانپتے ہوئے کہا ''مریں آپ کے دشمن۔۔۔ قانون آپ کی حفاظت کے لیے موجود ہے۔ آپ ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیجیے۔''

شرافت شریف صاحب نے نارمل ہوتے ہوئے سوال کیا ''گواہی کون دے گا؟''

''ہم بھی دیں گے۔'' آس پاس لوگوں کو دیکھ کر پر جوش لہجہ میں ہم نے جواب دیا۔

اس جملے کے بعد ہم نے دیکھا کہ محلّہ کے شرفا جو شرافت شریف صاحب کو تھامے ہوئے تھے، انھیں چھوڑ کر چار قدم پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ لوگوں نے گھر کی راہ بھی لی۔ شرافت شریف صاحب کے ساتھ ہم تنہا رہ گئے۔ انھوں نے پریشان ہو کر ہمیں دیکھا تو ہم نے انھیں یقین دلایا'' کوئی اور گواہی دے یا نہ دے۔ ہم ضرور آپ کا ساتھ دیں گے۔ آخر طوفان بدتمیزی کو روکنا ضروری ہے۔''

باہر ہنگامے سے نمٹنے کے بعد گھر میں داخل ہوئے تو بیوی کو محاذ کھولے ہوئے پایا، کہنے لگیں ''آپ ہی ایک خدائی فوجدار بچے ہیں۔ بیچ بچاؤ کیا۔ نیکی کی۔ اب گواہی دیں گے۔ کبھی عدالت کی سیڑھیاں چڑھی ہیں۔ کیا شرفا عدالت جاتے ہیں؟''

بیوی کی تقریر جاری تھی اور ہم حسب عادت ان کی سنتے ہوئے سوچنے لگے کہ عدالت کی سیڑھیاں چڑھنا تو دور، عدالت کے قریب جانے سے بھی ہمیں ڈر ہوتا ہے۔ لڑائی، مار دھاڑ، چوری، ڈکیتی، آبرو ریزی، قتل، غارت گری جیسے واقعات پر بحث اور مباحثے اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے قابل لوگوں کی بھیڑ۔ ہمیں خوف ہونے لگا۔ اگر گواہی دینی پڑی تو کیا ہو گا۔ غیرت نے للکارا۔ امن پسند شہری اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کریں تو کیوں کر امن قائم ہو گا۔ آج شرافت شریف صاحب پر حملہ ہوا ہے، کل ہماری باری آسکتی ہے۔ گواہی تو دینی ہے، سچ بول کر کون سا زہر کا پیالہ پینا یا سولی پر لٹکنا ہے۔ اپنے آپ کو دلاسا دے لینے کے باوجود ہم پر ایک انجانا خوف طاری تھا۔

ہم شرافت شریف صاحب سے ملنے سے کترانے لگے۔ دو مرتبہ وہ ہمارے گھر آئے۔ ہم نے سچ بات'' گواہی دینے سے ہم گھبراتے ہیں'' کہنے سے بچنے کے لیے بچوں سے جھوٹ بلوایا کہ ہم گھر پر نہیں ہیں۔ باہر گئے ہوئے ہیں۔

ایک دن شرافت شریف صاحب نے ہمیں راستے میں

پھانس لیا، کہنے لگے" آپ کے مشورے پر میں نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ آپ کو گواہی دینے آنا ہے۔"

چند دنوں بعد عدالت سے ہمارے نام سمن آیا۔ ہم نے کانپتے ہاتھوں سے وصول کیا۔ بیوی کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے کہ ان کی قسمت میں یہ دن دیکھنا بھی لکھا ہے۔ ہم نے انھیں بے بسی سے دیکھا تو انھوں نے آنسو پونچھتے ہوئے ہماری ڈھارس بندھائی کہ جیت ہمیشہ سچ بولنے والوں کی ہوتی ہے۔

ہم گواہی دینے کی تیاری کرنے لگے۔ لائبریری گئے۔ گھنٹوں قانون کی موٹی موٹی کتابوں میں سر کھپایا کہ دیکھیں گواہی دینے کے لیے کیا ہدایات دی گئی ہیں۔ کچھ پلے نہ پڑا۔ دوستوں سے مشورہ کیا تو ان کی نظروں میں ہم مشکوک ہوئے۔ آخر وکیل سے رجوع کیا۔ فیس لے کر وکیل نے استفسار کیا کہ کہیں ہمارا ارادہ پیشہ ور گواہ بننے کا تو نہیں ہے؟

ہم نے دونوں گال پیٹتے ہوئے جواب دیا" ہم ایک شریف اور ذمہ دار شہری ہیں۔ مجبوراً گواہی دے رہے ہیں کہ ہم نے کسی منحوس گھڑی میں گواہی دینے کا وعدہ کر لیا تھا۔ یہ ہماری پہلی اور آخری گواہی ہوگی۔"

وکیل نے گواہوں کی اقسام اور گواہی دینے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی۔ اس فن کے اہم نکات اور پینترے بتائے۔ وکیل نے ہمیں ڈرایا بھی کہ گواہی کو مخالف وکیل نے اگر غلط ثابت کر دیا تو گواہ کو سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ اس لیے گواہی بھی کسی اچھے اور نامور وکیل کے مشورے سے دی جانی چاہیے۔

مقررہ دن ہم نے امام ضامن بندھوایا اور گواہی دینے عدالت پہنچے۔ عدالت کی سیڑھیوں کی چڑھائی شروع ہوئی۔ ہمیں اختلاج ہونے لگا۔ ڈھیر سارے کالے جبوں کو دیکھ کر گرمی کا احساس ہوا اور پسینہ چھوٹنے لگا۔ محسوس ہوا کہ تمام وکلا فریق کی جانب سے ہمارے خلاف کھڑے ہیں۔ جوں توں کر کے ہم اس اجلاس پر پہنچے جہاں شرافت شریف صاحب کی عزت داؤ پر لگی تھی۔ ہماری نظر لڑاکو خاں پہلوان پر پڑی۔ وہ ہمیں گھور رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو 'میرے خلاف گواہی دینے آیا ہے! باہر نکل تجھے

> کسی بڈھے پنشنر کے پاس بیٹھ جائیں، اُدھر آپ اسے ملے، اِدھر اُس نے کوئی آپ بیتی چھیڑی، گویا وہ اِتنے عرصہ آپ کے انتظار میں ہی بیٹھے تھے کہ آپ ملیں اور وہ آ کی ضیافتِ طبع کا کے لئے وہ بات سنائیں۔ اگر آپ مجھ جیسی طبیعت کے مالک ہیں تو چپ چاپ بیٹھے سنتے رہیں گے، میرا مطلب ہے آپ کا انداز ایسا ہوگا جیسے آپ بیحد شوق سے سُن رہے ہیں لیکن اگر آپ میں جرأت ہے تو آپ معاً بول اُٹھیں گے" حضرت، یہ بات تو آپ نے مجھے پہلے بھی سنائی تھی۔" لیکن آپ کی یہ بے معنی بات اُنھیں پھر بھی خاموش نہ کر سکے گی۔
>
> "غبارے" از ممتاز مفتی

بھی دیکھ لوں گا۔ تیری۔۔۔' ہمیں لڑاکو خاں پہلوان کی گالیاں یاد آنے لگیں۔

ہمیں کچھ بھائی نہیں دے رہا تھا کہ ایسے میں ہمارا نام پکارا گیا۔ کسی نے ہمیں اٹھایا اور کٹہرے کی جانب دھکیلا۔ کٹہرے میں پہنچنے سے پہلے ہی ہماری حالت غیر ہوئی اور ہم میز پر رکھی قانون کی کتابوں پر گر پڑے۔ حواس بجا ہوئے تو پتا چلا کہ پیشی ملتوی کر دی گئی ہے۔

اگلی پیشی تک ہمیں خاصا وقت ملا۔ عدالت اور وکیلوں کا خوف دور کرنے کے لیے ہم کئی مرتبہ عدالت کی سیڑھیاں چڑھے اور اترے۔ مقدموں کی کارروائیاں سنیں۔ پیشہ ور گواہوں کو دیکھا اور سنا۔ ان سے بہت کچھ سیکھا۔ شرافت شریف صاحب ہماری وجہ سے پریشان تھے۔ ہمیں ان کے وکیل کے پاس لے گئے۔ وکیل نے ہمیں دیکھ کر کہا" گواہی دینا ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ کچھ روپے خرچ کریں، میں گواہوں کا انتظام کر لوں گا۔"

خفت مٹانے کے لیے ہم نے بہانہ بنایا "اس دن ہم ناشتہ کیے بغیر عدالت آ گئے تھے۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔ ہم کامیاب گواہی دیں گے۔"

وکیل نے سوال کیا" آپ کیا کہیں گے؟"

ہم نے جواب دیا" وہی جو ہم نے دیکھا، سنا اور محسوس کیا

ہے۔‘‘

’’کیا آپ کو چھ مہینے پہلے کا واقعہ یاد ہے؟‘‘ وکیل نے پھر سوال پوچھا۔

ہم اس لڑائی کو یاد کرنے لگے تھے کہ وکیل نے مشورہ دیا ’’جو کچھ ہوا تھا، اسے بھول جائیے بلکہ اب تک بھول بھی گئے ہوں گے۔ اب میں جیسا کہوں آپ ویسی گواہی دیجیے۔ ہمیں کسی بھی حال میں یہ مقدمہ جیتنا ہے۔‘‘

پیشی کا دن آ پہنچا۔ شرافت شریف صاحب نے ہمیں پیٹ بھر ناشتہ کروایا اور ہمیں ساتھ لے کر عدالت پہنچے۔ اس مرتبہ ہم نے عدالت کی سیڑھیاں سکون سے طے کرلیں۔ کمرۂ انصاف میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ منصف صاحب اونچی کرسی پر براجمان ہیں۔ ان کے آگے میدان کارزار لگا ہے۔ کٹہروں میں ملزمین اور گواہان، کالے جبوں میں وکلا اور ان کے مددگار، عدالت کے کارندے، پولس، فریقین اور ان کے حمایتی اور ہمنوا۔ اتنے لوگوں کی بھیڑ اور شور شرابے کے درمیان مقدموں کی کارروائی جاری ہے اور انصاف ہو رہا ہے۔

شرافت شریف صاحب کا مقدمہ پیش ہوا۔ رسمی کارروائی کے بعد گواہی کے لیے ہمارا نام پکارا گیا۔ ہم بغیر کسی مدد کے اٹھے اور گواہوں کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے۔ لڑاکو خاں پہلوان اور ان کے وکیل پر نظر پڑی تو کچھ خوف ہوا لیکن جلد ہی ہم نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔ سچ اور صرف سچ کہنے کے لیے قسم دلائی گئی۔ دورِ حاضر میں یہی ایک جگہ باقی رہ گئی ہے جہاں سچ بولنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور وہ بھی حلفیہ!

سچ کہنے کی قسم دلانے کے بعد شرافت شریف صاحب کے وکیل کرسی سے اٹھے اور کالا جبہ ٹھیک کیا اور ہم سے سوالات کرنے لگے۔ نام، عمر اور پیشہ پوچھا۔ دماغی صحت کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ، دن، وقت اور تاج محل کے معمار کا نام دریافت کیا اور اس ملک کا نام بتانے کو کہا جس میں دریائے نیل بہتا ہے۔ پھر شرافت شریف صاحب کی جانب اشارہ کر کے پوچھا ’’کیا آپ انھیں جانتے ہیں؟‘‘

ہم نے کہا ’’جی ہاں۔ بہت اچھی طرح۔ یہ ہمارے پڑوسی ہیں۔‘‘

ہمارا جواب سننے کے بعد وکیل نے واقعہ کی روداد بیان کرنے کے لیے کہا۔ ہم پہلے سے تیاری کر چکے تھے، فر فر سنا دیا جیسے کوئی بچہ ’’ایک کوا پیاسا تھا۔۔۔‘‘ کہانی سناتا ہے۔

وکیل نے سوال کیا ’’آپ نے کہا کہ ملزم نے شرافت شریف صاحب کو گالیاں دیں۔ وہ گالیاں کیا تھیں؟‘‘

ہم تذبذب میں پڑ گئے۔ وکیل نے اپنا سوال دہرایا تو ہم نے جواب دیا ’’ہم گالیاں کیسے سنائیں، یہ اچھی باتیں تو ہیں نہیں کہ دہرائی جائیں۔‘‘

وکیل نے سمجھایا ’’عدالت جانتی ہے کہ گالیاں خراب ہوتی ہیں۔ ہمیں معلوم تو ہو وہ کون سی گالیاں تھیں جنھیں سن کر شرافت شریف صاحب مرنے مارنے بلکہ خودکشی کر لینے پر آمادہ ہوئے۔ کیا وہ حقیقت میں گالیاں تھیں؟ کیا گالیوں کو سن کر شرافت شریف صاحب کا انتہائی قدم اٹھانا مناسب تھا؟‘‘

ہم نے اس سوال کو آخری جان کر زندگی میں پہلی اور شاید آخری بار گالیاں دینے کا قصد کیا۔ پھر خیال آیا کہ معززین ہمیں گالیاں بکتے ہوئے سن کر ہمارے بارے میں پتہ نہیں کیا سوچیں گے۔ پس و پیش میں تھے کہ وکیل نے ہمیں عدالت کا وقت ضائع نہ کرنے کی تاکید کی۔ ہم نے آنکھیں بند کیں، گردن جھکائی اور کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں اور وہ تمام گالیاں دیں جو ہم نے لڑاکو خاں پہلوان سے سنی تھیں۔

گالیاں سننے کے بعد وکیل نے کہا ’’ان گالیوں کو نوٹ کیا جائے۔ یہ گالیاں بندوق کی گولیوں سے زیادہ خطرناک ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے گواہ سے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔‘‘

ہم کٹہرا چھوڑ کر جانا چاہتے تھے لیکن ہمیں روک لیا گیا۔ ابھی وکیل مخالف کی جرح باقی تھی۔ لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل ہمیں گھورتے ہوئے اپنی کرسی سے اٹھے اور ہمارے قریب پہنچ کر سوال کیا ’’کیا نام بتایا تھا آپ نے؟‘‘

ہم نے انھیں اپنا نام بتایا۔

ہمارا نام جاننے کے بعد وکیل مخالف نے جرح کا آغاز کیا۔

''آپ نے عدالت کو بتایا کہ آپ شرافت شریف صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔''

''جی!'' ہم نے مختصر جواب دیا۔

''کتنے برسوں سے؟''

''پچھلے پندرہ برسوں سے۔''

''اس سے پہلے؟'' وکیل مخالف نے استفسار کیا۔

''ہم نہیں جانتے کہ وہ کہاں تھے۔'' ہم نے جواب دیا۔

''اس کے باوجود آپ کہتے ہیں کہ انھیں اچھی طرح جانتے ہیں، مجھے حیرت ہے۔'' وکیل مخالف نے تبصرہ کر کے عدالت سے درخواست کی کہ یہ نکتہ نوٹ کیا جائے۔

وکیل مخالف کی جرح جاری رہی ''آپ نے میرے فاضل دوست کے سوال کے جواب میں کہا کہ آپ ادیب ہیں، یعنی تخلیقی صلاحیتوں کے مالک!''

ہم خوش ہوئے کہ وکیل صاحب باذوق معلوم ہوتے ہیں اور جھوم کر جواب دیا۔''جی۔''

ہمارے ادیب ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وکیل مخالف نے تبصرہ فرمایا۔''عین ممکن ہے کہ آپ کا بیان کردہ واقعہ آپ کی تخلیق ہو۔ میرے خیال میں یہ آپ کے کسی نئے افسانے کا پلاٹ ہے اور حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

ہم چیں بہ جبیں ہوئے۔ ہمیں وہ سوال یاد آیا جو اکثر ہم سے کیا جاتا ہے۔''آپ افسانے اور کہانیاں کیسے لکھتے ہیں؟'' ہمارا مختصر جواب ہوتا۔''ہم حقیقت کو بنیاد بنا کر افسانے اور کہانیاں گھڑتے ہیں۔'' عدالت آ کر ہمیں محسوس ہوا کہ وکلا ہم سے چار ہاتھ آگے ہیں۔ وہ حقیقت کو افسانہ ثابت کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ ہم وکیل مخالف کے سوال کا مناسب جواب دینے کے لیے کچھ دیر سوچتے رہے۔ کچھ بھائی نہ دیا تو انھیں سے پوچھا ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

جواب ملا''بہت آسانی سے۔ آپ اپنی صلاحیتوں کو میرے باعزت موکل کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کاغذ کالا کرنے کی بجائے اپنی تخلیق کو حقیقی کرداروں کے ذریعہ عدالت میں بیان کردیا۔ یوں عدالت کا وقت ضائع نہ کیجیے۔''

ہمیں حیرت ہوئی کہ لڑاکو خاں پہلوان کو وکیل صاحب ''باعزت'' ہونے کا سرٹیفکٹ عطا کر رہے ہیں جبکہ اس ''باعزت'' شخص سے سارا محلہ پریشان رہتا ہے۔ ہم نے بے بسی سے شرافت شریف صاحب کے وکیل کی جانب دیکھا۔ وہ اعتراض اٹھاتے ہوئے کھڑے ہوئے اور کہا۔''معزز گواہ حلف لے چکا ہے کہ وہ سچ بولے گا۔ اس کے بیان کو جانچنے کے لیے سوالات کیے جائیں

پی ٹی کروانے کی ذمہ داری پی ٹی اسٹاف پر ہے۔ لیکن پلاٹون کمانڈر جانے کیوں صبح صبح وہاں آن براجتے ہیں۔ کیڈٹوں کی یہ متفقہ رائے ہے کہ پلاٹون کمانڈروں کی ازدواجی زندگیاں انتہائی تلخ ہوتی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کاکول کی حسین وادیاں ہوں' رنگین موسم ہو' مہکتی صبح ہو' ملگجا اجالا ہو' بادلوں کا سایہ ہو' نشہ سا چھایا ہوا اور انسان بے خود نہ ہو جائے۔ یہ لمحے جیون کے ہمراہیوں کے ساتھ گزارے جانے چاہئیں۔ پی ٹی گراؤنڈ میں انہیں کیڈٹوں پر ضائع کرنا نرم سے نرم الفاظ میں حماقت ہے اور

''موسم کا احترام نہ کرنا بھی جرم ہے''

گراؤنڈ کی ایک جانب جو چند کھمبوں سے رسے لٹکے رہتے ہیں۔ ڈارون کی تھیوری پر اگرچہ ہم کبھی ایمان نہیں لائے' خود کو ہمیشہ اشرف المخلوقات میں سے جانا لیکن مجبور کیا گیا کہ ان رسوں پر چڑھنے اترنے کی مشق بہم پہنچائیں۔ کچھ عرصہ ان رسوں پر رہنے اور ہاتھوں کے بل کھڑے ہونے (Hand Stand) کے بعد جو مہارت ہمیں حاصل ہوئی اس پر ہمیں ڈارون کی تھیوری میں کچھ نہ کچھ صداقت کی ملاوٹ کا شبہ ہو چلا ہے۔ آخر موروثی اثرات کے بغیر ان خارق عادت حرکات میں مہارت حاصل کرنا کیونکر ممکن ہے!

جنٹلمین بسم اللہ از کرنل اشفاق حسین

نہ کہ اس کے بیان کو سرے سے جھوٹ کہہ کر ہراساں کیا جائے۔‘‘
شرافت شریف صاحب کے وکیل کا اعتراض قبول ہوا اور وہ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے بیٹھ گئے۔ وکیل مخالف کو غصہ آیا۔ اپنے جبہ کے کنارے کھینچتے ہوئے، جیسے ہمارے کان کھینچ رہے ہوں بولے۔ ’’اچھا تو آپ نے فلاں تاریخ کو دیکھا کہ لڑاکو خاں پہلوان صاحب نے اپنے پڑوسی کو گالیاں دیں۔‘‘
ہم نے اثبات میں سر ہلا کر ’’جی ہاں‘‘ کہا۔
وکیل مخالف نے برہم ہوتے ہوئے کہا ’’گالیاں سنی جاتی ہیں۔ گالیوں کو کھا سکتے اور نہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ سچ سچ بتایئے آپ نے کیا دیکھا تھا۔‘‘
ہمیں غصہ آیا۔ ہم بھی آخر ادیب ہیں۔ موضوع وہی رکھ کر اندازِ بیان بدل سکتے ہیں۔ ہم نے جواب دیا ’’ہم نے دیکھا کہ لڑاکو خاں پہلوان کے ہونٹ تیزی سے ہل رہے تھے۔ کبھی دانت بھی دکھائی دیتے تھے۔ ساتھ میں وہ ہاتھ نچا رہے تھے۔ ان کی حرکات سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ کچھ بک رہے ہیں۔‘‘
وکیل مخالف نے حکم دیا ’’انھوں نے کیا کہا، عدالت کو سنایئے۔‘‘
یعنی ہمیں پھر گالیاں دہرانی تھیں۔ ہم خاموش رہے۔ وکیل مخالف نے ہماری خاموشی کا یوں مطلب نکالا ’’آپ کی خاموشی کہتی ہے کہ لڑاکو خاں پہلوان صاحب بھی چپ تھے۔‘‘
ہم نے احتجاج کیا ’’نہیں محترم لڑاکو خاں پہلوان گالیاں ارشاد فرما رہے تھے۔‘‘
وکیل مخالف نے ہمیں زیر کرنا چاہا ’’لیکن ابھی تو آپ خاموش ہو گئے تھے جس کا مطلب۔۔۔‘‘
ہم نے وکیل مخالف کو اپنا جملہ مکمل کرنے نہیں دیا اور طیش میں آ کر گالیاں دوبارہ سنائیں۔ وکیل مخالف غور سے گالیاں سنتے رہے۔
ہم خاموش ہوئے تو فرمایا۔ ’’اس مرتبہ دو نئے الفاظ کا اضافہ ہے۔‘‘
ہم نے کہنا چاہا کہ ہماری یہ فیاضی آپ کے لیے ہے، لیکن عدالت اور قانون کا احترام کرتے ہوئے چپ رہے۔ وکیل مخالف نے ہم پر جرح جاری رکھی، محسوس ہونے لگا کہ وہ ہمیں یوں آسانی سے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ انھوں نے کہا ’’حیرت ہے آپ میرے موکل کی حالت غصہ میں کہی ہوئی باتوں کو گالیاں کہہ رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان میں جنسی اعضا کا نام ہی تو لیا گیا ہے۔ جنسی اعضا کا نام لینے کو آپ گالیاں سمجھتے ہیں۔ آپ کے بیان پر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ کوئی ان الفاظ کو سن کر مرنے اور مارنے کے لیے تیار ہو سکتا ہے۔‘‘
جی میں آیا کہ کہہ دیں۔ آپ سچ کہتے ہیں۔ لڑاکو خاں پہلوان گالیاں نہیں بک رہے تھے۔ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے تھے۔ ان الفاظ سے انسانیت کی توقیر ہوتی ہے۔ لیکن صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے اپنے بیان پر قائم رہے ’’یقیناً وہ گالیاں تھیں اور ان سے کسی کی بھی بلکہ انسانیت کی ہتک ہوتی ہے۔‘‘
’’میں ایسا نہیں سمجھتا۔‘‘ وکیل مخالف نے بتایا۔
ہمارے دل نے چاہا کہ ان سے کہیں یہ آپ کی ’’گالیاں نوازی‘‘ ہے۔
شرافت شریف صاحب کے وکیل نے اعتراض کیا ’’لڑاکو خاں پہلوان کے ارشادات گالیاں ہیں یا نہیں، یہ فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ میرے گواہ کو پریشان نہ کیا جائے۔‘‘
شرافت شریف صاحب کے وکیل کا اعتراض قبول کر لیا گیا اور وکیل مخالف کو احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی گئی۔
احتیاط کی ہدایت کے باوجود وکیل مخالف نے اپنے انداز سے جرح جاری رکھی ’’آپ نے عدالت کو بتایا کہ لڑاکو خاں پہلوان صاحب کی باتیں سن کر شرافت شریف اپنے فریق پر حملہ کرنے گئے۔ ہو سکتا ہے کہ شرافت شریف کے حملہ آور ہونے کے بعد میرے موکل نے اپنی مدافعت میں غصہ کا اظہار کیا ہو گا۔ آپ یاد کر کے بتایئے۔‘‘
ہم وکیل مخالف کو جان چکے تھے اور اب ان کے چکموں میں آنے والے نہیں تھے۔ ہم نے جواب دیا۔ ’’وکیل صاحب۔ لڑاکو خاں پہلوان نے شروعات ہی گالیوں سے کی تھی۔ گالیاں کھا کر،

معاف کیجیے کھا کر نہیں سن کر شرافت شریف صاحب لڑنے مرنے کے لیے تیار ہوئے لیکن ہم نے انھیں روک لیا۔"

ہماری وضاحت پر سوال ہوا "بہت خوب، اچھا کام کیا لیکن آپ نے کیوں روکا۔"

ہم نے لاپرواہی سے جواب دیا "امن وامان قائم رکھنا ہر شہری کا فرض ہے اور یوں بھی ہمیں شرافت شریف صاحب کی زندگی عزیز تھی۔"

وکیل نے پھر وار کیا "جب آپ شرافت شریف کو روک سکتے تھے تو آپ لڑاکو خاں پہلوان صاحب کو بھی خاموش بٹھا سکتے تھے لیکن آپ نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کر رہے تھے۔"

ہم نے کہا "ہمارے بس میں جو کام تھا سو ہم نے انجام دیا۔ کیا ہمیں اپنی عزت اور جان عزیز نہیں جو ہم لڑاکو خاں پہلوان کو چھیڑتے۔ ہم شرافت شریف صاحب کا حشر دیکھ رہے تھے۔"

اس موقع پر شرافت شریف صاحب کے وکیل نے پھر اعتراض اٹھایا۔ ایک مرتبہ پھر لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل کو غیر ضروری سوالات سے پرہیز کرنے کی ہدایت ملی۔ ہم سوچنے لگے کہ اگر وکلا غیر ضروری سوالات کر کے گواہوں کو پریشان نہ کریں تو انھیں اپنے بیان سے کیسے منحرف کروا سکتے ہیں۔ سوالات کا مقصد شاید یہ ہوتا ہے کہ گواہ کو سچ بولنے کی قسم دلا کر مطلب کی باتیں اگلوا لیں۔

لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل خاموش ہوئے۔ ہم شش و پنج میں مبتلا کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ بے بسی سے کبھی شرافت شریف صاحب کے وکیل کو دیکھتے تو کبھی چور نگاہوں سے منصف کا جائزہ لیتے کہ سرکار کے کیا ارادے ہیں۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ منصف نے لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل سے پوچھا "کیا آپ کو مزید کوئی سوال کرنا ہے؟"

لڑاکو خاں پہلوان کے وکیل ہمیں گھورتے ہوئے کٹہرے کے قریب آئے۔ راستے میں رکھے ہوئے اسٹول کو پاؤں سے دھکیلا۔ ہم "جل تو جلال تو، آئی بلا کو ٹال تو" کے وظیفہ کا ورد کرنے لگے۔ کٹہرے کی منڈیر پر وکیل مخالف نے ہاتھ مارا اور کہا "اچھا۔ عدالت کو بتایئے کہ لڑاکو خاں پہلوان صاحب کی باتوں یا غصہ کے اظہار کے جواب میں شرافت شریف نے کیا کہا۔"

"وہ خاموش تھے۔" ہم نے جواب دیا۔

"کیا وہ گونگے ہیں؟" ہمارے جواب پر سوال ہوا۔

"نہیں میرا مطلب تھا کہ گالیوں کے جواب میں انھوں نے کوئی گالی نہیں دی۔" ہم نے وضاحت کی۔

"آخر انھوں نے کیا کہا؟" وکیل مخالف نے آواز اونچی کر کے، شاید ہمیں ڈرانے کے لیے پوچھا۔

"گالیوں کے جواب میں شرافت شریف صاحب نے کہا کہ مجھے چھوڑ دیجیے۔ میں اسے مزہ چکھاؤں گا۔ اسے بتاؤں گا کہ شرافت کیا ہوتی ہے۔" ہم نے جواب دیا۔

وکیل مخالف نے ہمارے اس بیان پر کہا "عدالت نوٹ کرے کہ شرافت شریف صاحب نے معمولی اور بے ضرر باتوں کے جواب میں میرے موکل کو دھمکیاں دی ہیں۔ انھیں مزہ چکھانے اور مارنے کی باتیں کی ہیں۔"

ہم صرف حیرت سے وکیل مخالف کو تکتے رہے جو اپنا نکتہ بیان کرنے کے بعد خاموشی سے کچھ دیر سوچتے رہے۔ پھر انھوں نے ہم سے کہا "مجھے کچھ نہیں پوچھنا ہے۔ آپ جا سکتے ہیں۔"

ہم تیر کی طرح عدالت سے نکلے اور سیدھے گھر پہنچے، پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا کہ مبادا پھر گواہی دینے کے لیے بلا لیے جائیں۔

عابد معز صاحب کا تعلق حیدرآباد (بھارت) سے ہے۔ پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ اُردو ادب سے ان کی محبت بہت پرانی ہے۔ طنز و مزاح ان کا خصوصی میدان ہے۔ اُردو طنز و مزاح سے حوالے سے ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ماہنامہ "شگوفہ" حیدرآباد کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ "شگوفہ" کے علاوہ بہت سے ادبی و غیر ادبی جرائد میں ان کے مزاحیہ مضامین تسلسل کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ بہت نفیس طبعیت کے مالک ہیں۔

جمہوریت ۔ ایک طنزیہ

مراد علی شاہد

عرصہ دراز سے ایک تعلیمی ادارے میں سیاسیات کا مضمون پڑھاتے ہوئے جمہوریت کی خوبیوں اور خامیوں پر تبصرہ کرنا پڑتا ہے۔خوبیوں کا تو پتہ نہیں مگر جو خامیاں ایک کلاس میں جمہوری نظام کی دیکھنے میں آئیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری پارلیمنٹ کا حال بھی کچھ میری کلاس اور طالب علموں جیسا ہی ہوگا۔مثلاً کلاس میں داخل ہوا، بچوں کو مخاطب کیا اور پوچھا کہ بچو! آج ہم جمہوریت کی خوبیوں پر تبصرہ کریں گے۔

کلاس کے آخر سے ایک مخنی سی آواز بلند ہوئی کہ سر آج ہم لیکچر نہیں لیں گے اور یہ میری نہیں ہم سب کی رائے ہے۔اور اکثریت کی رائے کا احترام کرنا ہی جمہوریت کا حسن اور جمہوری اداروں کا فرض ہے۔

ایک کلاس میں مارشل لا کی خوبیوں کا تذکرہ کرنا چاہا تو سب سے نالائق طالب علم نے گریبان کا بٹن کھولتے ہوئے، دوست کو آنکھ دباتے ہوئے مجھ سے کچھ اس انداز سے مخاطب ہوا کہ ”سر فرد واحد کس طرح پوری کلاس کی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔اس لئے آج ہم فری کلاس کا مطالبہ کرتے ہوئے گراؤنڈ میں جا کر کھیلنا چاہتے ہیں۔“

سر پکڑ کے بیٹھنا بنتا تھا کہ یہ کیا جمہوریت اور مارشل لا ہے کہ جنہیں ہم نہ اپنی زندگی اور نہ ہی ملک میں اس کا اطلاق کرسکتے

ہیں۔اس لئے ایک مذکر دوست سے دوسوال پوچھے تو جواب مخنث پایا۔ایک بلبل کا کیسے پتہ چلے کہ مذکر ہے یا مونث،دوست موصوف ارتجالاً گویا ہوئے کہ بلبل کا مذکر و مونث ہونا آپ دو طرح سے چیک کرسکتے ہیں۔آسان فہم الفاظ میں گاتا ہے تو مذکر اور اگر گاتی ہو تو مونث۔اور دوسری پہچان اگر "جگہ مخصوص" بہت سرخ ہو اور دم اٹھائے رکھے تو مونث وگرنہ مذکر خیال کیا جائے۔

میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ بچھو کو آپ کیسے جان سکتے ہیں کہ نر ہے یا مادہ،تو ایسے ہی بلا تردد اور نان سٹاپ فرمانے لگے کہ اس کی "پوچھل" کو ہاتھ لگا کے چیک کرلو اگر تو ڈنگ کے اثر سے ہلکی سی "سی" ہو تو شوہر نامدار کی طرح مذکر وگرنہ "مونث" کا تو کام ہی "سی سی" کروانا ہوتا ہے۔

ابھی اسی مخمصہ میں ہی تھا کہ ایک اور سوال نے سر اٹھانا شروع کردیا اور سوچا کہ اس کا جواب بھی دوست موصوف سے ہی لے لیا جائے تو علمی افاقہ ہوسکتا ہے۔وہ یہ کہ آپ ملک کے لئے جمہوری نظام کو بہتر پاتے ہیں یا آمرانہ نظام کے حق میں ہیں۔اب سرکار ذرا گہری اور فلسفیانہ سوچ میں غوطہ زن ہوئے،ذرا توقف فرمایا اور بولے کہ جناب جواب تو بہت سادہ اور آسان فہم ہے کہ بس بلبل کی جگہ آپ عوام کو رکھ لیں تو جواب سمجھنے اور جاننے میں آسانی رہے گی۔

عرض کیا "جان من سوال گندم اور جواب جو والی بات نہ کریں،کہاں پرندے اور گزندے اور کہاں کارہائے ریاست و سیاست،کیا یہ بعد المشر قین نہیں ہے؟"

"نہیں جناب آپ میری بات کو سمجھ نہیں پائے۔عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تو عوام کی پوچھل سرخ ہو تو سمجھ لو جمہوریت آہنی دستانے پہنے اوچھے ہتھکنڈے آزما رہی ہے اور حکومتی پوچھل زہر سے لبریز ہو تو ملک پر آمریت کا راج ہے۔"

اب کی بار بات ذرا پلے پڑی کہ موصوف کیا سمجھانا چاہ رہے ہیں؟ یعنی دونوں صورتوں میں عوام کی پوچھل کو ہی "سرخ و لال" ہونا ہے،خواہ ملک میں مارشل لا ہو یا جمہوریت۔عوام کی تشریف کو ہی سرخ کرنا مقدر ٹھہرنا ہے۔بالکل ایسے ہی جیسے پنجاب پولیس بے جرم ملزم کو مار مار کے ایسی "تشریف" سرخ کرتی ہے کہ نرم و گداز بستر بھی خار مغیلاں ہی محسوس ہوتا ہے کہ جس پہ ذرا تشریف رکھی تو سائیکل پنکچر کی طرح ٹیوب سے ہوا کی ایک لمبی "شو" نکلی اور سائیکل چلنے سے معذور۔۔۔

اظہر جاوید،ظفر اقبال اور کچھ دوست "حریت" لاہور کے دفتر میں جمع تھے۔بات چیت کے دوران ظفر اقبال نے کہا "بھئی کیا کریں،محمد علی صدیقی چونکہ نقاد ہیں اس لئے ان سے دوستی بنا کر رکھنے میں بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔"
اس پر اظہر جاوید نے فقرہ کسا "کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ اتنی محنت اپنی شاعری پر کریں تا کہ نقاد کا سہارا نہ لینا پڑے۔"

جمہوریت،جمہور کو راس آئے نہ آئے،"شریف زادے" خوب پھلتے پھولتے ہیں بلکہ پھول پھول کر فٹ بال سے مشابہ ہو جاتے ہیں،ویسے شریف زادوں کی بھی عجیب سائیکی ہے۔ملک میں ہوں تو شریف زادے اور ملک سے باہر ہوں تو "حرام زادے" یعنی ہر گناہ میں ملوث۔از راہ کرم پرسنل نہ لیا جائے مراد ملک میں شریف باہر جا کر بدمعاش ہوتے ہیں۔اور ہر گناہ میں ملوث پائے جاتے ہیں۔

اگر پاکستان کی تاریخ کو نچوڑا جائے تو ملک میں دو طرح کی جمہوریت نے ہر آن جمہور کا خون نچوڑا ہے۔فوجی مارکہ اور عوامی مارکہ۔فوجی مارکہ،فوج کے زیر اثر ایسی سہمی دکھائی دیتی ہے جیسے رضیہ غنڈوں کے نرغے میں آکر سہمی سہمی پائی جاتی ہے۔فوجی مارکہ جمہوریت مونث ہوتی ہے اور برائے نام حرکت میں ہوتی ہے۔اس لئے کہ فوج اس دور میں جمہوریت کی ہر ہر حرکت پہ نظر رکھے ہوتے ہیں اور اس کی حرکت کو گندی حرکت ہی خیال کرلیا جاتا ہے۔عوامی جمہوریت میں عوام سہمے ہوئے رہتے ہیں،فوجی جمہوریت میں فوج کا عمل دخل اتنا ہی ہوتا ہے جتنا کہ عوامی میں عوام کا۔فوجی مارکہ میں "فوجی" جمہوریت کا دلہا ہوتا ہے جبکہ عوامی مارکہ میں عوام کا خادم۔فوجی مارکہ میں عوام اور فوج کو تولا جاتا ہے جبکہ عوامی مارکہ میں دونوں کو گنا جاتا ہے۔ستر سالوں میں ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جمہوریت ہی وہ واحد سسٹم ہے جس میں ہر چیز کو

تول کرلیا جاتا ہے خواہ وہ رشوت کے نوٹ ہی کیوں نہ ہوں؟ اگر نہیں تولا جاتا تو وہ سیاستدانوں کے گناہ ہیں جو کسی ترازو کے پلڑے میں نہیں تولے جا سکتے، اسی لئے تو جمہوریت ان سیاستدانوں کی محبوب و مرغوب لونڈی ہے جب چاہیں لوٹ لیا جب ضرورت ہو کھالیا کون پوچھنے والا ہے کہ یہ واحد سسٹم ہے جس میں چور ہی چوکیدار ہوتا ہے۔ تو جناب سانپ کو سانپ لڑے تو زہر کس کو چڑھے؟ جمہوریت واحد طرزِ حکومت ہے جس میں حکمران واحد ہوتا ہے اور لوٹنے والی ایک فوج ظفر موج اپنی اپنی موج مستیوں میں لگی ہوتی ہیں جبکہ فوجی مارکہ میں حکمران کے ساتھ پوری فوج ہوتی ہے کیونکہ فوجی جمہوریت فوج کے بغیر نہیں آ سکتی۔ فوجی مارکہ من مانی ضرور کرتی ہے تاہم موج مستی سے کچھ پرہیز ہی کرتی ہے اسی لئے تو جب آجاتی ہے پھر گیارہ سال سے قبل جانا ان کا جانا بنتا نہیں۔ گیارہ سال کے بار بار اقتدار افواج سے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ہماری فوج کا کوئی نہ کوئی تعلق بابا گیارھویں شریف والے کے ساتھ ضرور ہوگا، اسی لئے تو جب فوج آجاتی ہے گیارہویں کے سالانہ بڑے ختم سے پہلے جانے کا نام ہی نہیں لیتی، بس یا تو سیاسی آسمان کو چھوتی ہے یا پھر سیدھا ایک دھماکے سے آسمان کی طرف جاتی ہے۔ جمہوریت میں از خود کوئی برائی نہیں مگر جمہوریت میں برائی کو چھپانا اب مشکل ہو گیا ہے۔ اور برائی کا عالم یہ ہو گیا ہے کہ جمہوری حکومتوں میں "لچا سب توں اچا" نہ صرف نظر آتا ہے بلکہ ہم نے اسے من وعن تسلیم بھی کر لیا ہے۔ اسی لئے تو کہتے ہیں کہ پاکستانی سیاست میں سچے بندے کا کوئی کام نہیں ہے۔ جبکہ مارشل لا میں نہ صرف برائی چھپ کے کی جاتی ہے بلکہ برائی کرنے والے بھی منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ جمہوریت میں ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں، دورِ حاضر میں تو گیارہ گنا ہو کر اور گیارہ گنا وصول کر بھی گناہ چھپانے کی ذرا برابر بھی کاوش نہیں کی جاتی بلکہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق شریفانہ طریقے سے بدمعاشانہ انداز سے کہ رہے ہوتے ہیں "مجھے کیوں نکالا، مجھے کیوں نکالا" جمہوریت کا حسن اس بات میں ظاہر کیا جاتا ہے اس میں آزادی تحریر و تقریر و دیگر آزادیاں ہوتی ہیں جیسے آزادی نسواں، آزادی دھوم دھڑکا، اور تو اور فلم کی مشہور اداکارہ میرا کو ایک پروگرام میں گاتے دیکھ کر جمہوریت زندہ باد کا نعرہ لگانے کو دل چاہا کہ اس سے بڑی اور آزادی کیا ہو سکتی ہے کی میرا کھلے عام ٹی وی پر گا سکے۔ البتہ مارشل لا یا جمہوری مارکہ میں آزادی پابند سلاسل اور

ناسازی طبیعت کا بہانہ کرتے دکھائی دیتی ہے۔ اسی لئے فوجی مارکہ میں "کمشن" کی کوئی بات نہیں کرتا بس مشن کی بات کرتے ہیں، جمہوری مارکہ میں تو کمشن لینے کے لئے بھی کمشن دینا پڑتا ہے، بقول شاعر

لے کے رشوت پھنس گیا ہے، دے کے رشوت چھوٹ جا

سیاستدانوں اور آئین کی آنکھ مچولی کا اگر ہم جائزہ لیں تو نتیجہ میں ہمیشہ مارشل لا ہی برآمد ہوا ہے۔ ہر مارشل لا کے بعد اگر جمہوریت کو نقصان پہنچا ہے تو آئین میں ترامیم سے سیاستدانوں نے جمہوریت کے چہرے کو مسخ کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ جمہوری روح پر یہ پیوندکاریاں اتنی لگیں کہ اب پیاز کے چھلکے کی طرح اوپر سے اتار کر جمہوریت کو دیکھنے کی کوشش کی جاتی ہیں۔ اب تو جمہوریت عام آدمی کے لئے "لارا" متوسط کے لئے "صرف اور صرف وعدہ" جبکہ خواص کے لئے "فائدہ ہی فائدہ" ہے۔ خواہ وہ عوامی مارکہ ہو یا فوجی مارکہ۔ اس لئے کہ بھی سب سیاستدان ہی ہیں جو عوامی اور فوجی دونوں فریم میں فٹ آ جاتے ہیں۔

مراد علی شاہد صاحب کا بنیادی طور پر تعلق کمالیہ (پاکستان) سے ہے جبکہ سترہ برسوں سے بسلسلۂ روزگار قطر میں مقیم ہیں اور ایک پاکستانی کالج میں بطور صدر شعبۂ پاکستان اسٹڈیز فرائض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ پسندیدہ اصناف افسانہ نگاری اور طنز و مزاح ہے۔ "قندِ شیریں" کے عنوان سے کالم نگاری کرتے ہیں۔ فکاہیانہ و انشائیانہ اندازِ تحریر میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

مجیب ظفر انوار حمیدی

ایک اور پروفیسر

ارے یہ کیا؟ صرف دس رُپے؟ اُفوہ! اس دورِ بے مہار میں دس رُپے تو بچہ عیدی بھی نہیں لیتا۔"

مُسکرا کر فرمایا "آسان مثال دیا کریں، کیونکہ اسی لت کی بنا پر آپ کی پون جماعت خالی اور حاضری ادھوری ہوا کرتی ہے، مثلاً آپ یہ مثال بھی دے سکتے تھے کہ دس رُپے تو اِس دور میں بھکاری بھی نہیں وصولتا۔"

ہم نے کہا "بندۂ خدا، یہ ملازمت تو ایک طرف، مثال بھی آپ کے شایانِ شان نہیں، کہاں ایک پروفیسر اور بھلا کہاں یہ دُکان!"

ہرگز ملول نہ ہوئے، بتایا "دیکھئے، سرکاری ٹیچنگ تو بڑی 'اُستادی' ہوا کرتی ہے، اصل "جاب" تو یہی ہے، پروفیسری تو پارٹ ٹائم ہے۔"

اتنا فرما کر دس رُپے احتیاط سے اُس عفیفہ کے "غلّے" میں امانتاً رکھے اور کُرسی پر لیٹ گئے۔

بقول پاکستانی پروفیسر "موصوف عمر کے اُس حصے میں ہیں جب آدمی کو ہر چیز کے دو پہلو نظر آیا کرتے ہیں، ایک تاریک، اور دوسرا زیادہ تاریک۔"

موصوف کی عمریا:

پروفیسر پاکستانی حلفیہ بیان جاری رکھتے: "بھائی میرے، یہ صاحب دُکان داری ایسی عمر میں کر رہے ہیں جب انسان موچنے سے اپنے ہی سر کے بال اکھاڑتا ہے، یاد رکھیے، صرف کالے بال۔ غالباً موصوف کو بھی اپنی "سنجیدہ عمر" کا احساس ہو چکا ہے اس لیے صرف بال بچے دار خواتین ہی پر ان کی طبیعت آتی ہے، نظر اور بدن دونوں موٹے ہو چکے ہیں۔ قیاس ہے کہ ستر سالہ عفیفہ بھی انہوں نے منفی سات کی عینک لگا کر ملاحظہ فرمائی ہوگی، اور وہ حرافہ بھی ان سے اپنی اولاد جیسا برتاؤ کیا کرتی ہے، یعنی، سب کے سامنے بچوں کو بلاوجہ ڈانٹا ڈپٹنا اور تنہائی میں مارنا بھی۔

موصوف عمر کے اس اسٹیج پر ہیں جہاں آدمی اپنی ہی عمر کے لوگوں سے اس ڈر سے ہاتھ نہیں ملاتا کہ ہر مصافحہ کے بعد اُس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔" اتنا کہہ کر پروفیسر پاکستانی نے دم لے کر ارشاد فرمایا "یہ عینک تو سازِ سخن بہانہ ہے، کوئی دن جاتا ہے کہ لڑکیاں، بالیاں موصوف کے چشمے کا لحاظ کیے بغیر، دائے، ورے، ننھے اِن کے سامنے پھرا کریں گی۔"

موصوف شاید سمجھ گئے کہ پروفیسر پاکستانی اُن کے "نو آورد" ہونے کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں، چنانچہ وہ انہیں "مسلمان نظروں" سے دیکھنے لگے۔ بقول پروفیسر پاکستانی: "مسلمان نظریں،

مسلمانوں نے صرف حلال جانوروں کے لیے سنبھال رکھی ہیں۔"

موصوف کی "ہاٹ" (دکان) کی بدولت آس پاس کے لدھڑ سے لدھڑ پڑوسیوں کی چال میں اس قدر چستی اور چابک دستی پیدا ہو چکی تھی کہ جب بھی کوئی گاہک ان کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو اُس کی چال میں ایک چستی، مستی، تندی اور تیزی کے جلوے کوندا کرتے، مبادا موصوف اُسے اپنے دکان میں کھینچ کر "منت کرم داشتن" کے مرتکب ہو جائیں۔

خیر، دن گزرتے رہے۔ موصوف کی دکان یوں چلتی رہی جیسے قرۃ العین حیدر کی کہانی۔

ایک روز ہم نے باتوں باتوں میں پوچھا "فرض کیجیے، دکان چل پڑتی ہے، تو پھر آپ کیا کریں گے؟"

لیٹھے لیٹھے کسی اور دنیا میں پہنچ چکے تھے، دھڑ سے جواب دیا "خودکشی کرلوں گا۔"

اس پر پروفیسر پاکستانی بولے "یعنی تاریخِ وفات، آلۂ قتل اور موقعِ واردات کا انتخاب حضرت خود ہی کریں گے، یار یہ تو اپنی کتاب کا مقدمہ آپ لکھنے کے مترادف ہوا۔ اور پھر تم تو ایسا جرم کرنے جا رہے ہو جس کی سزا کم از کم اُس وقت ملتی ہے جب بندہ ارتکابِ جرم میں ناکام ہو جائے اور ناکام ہونا تو تم نے سیکھا ہی نہیں، مثلاً دکان ہی کی مثال لے لیجیے، برسوں میں بند ہوتی دکان آپ نے ایک ہی جھٹکے سے دنوں، بلکہ منٹوں میں بند کر دی۔"

ہرگز بُرا نہ مانے، مسکرا کر فرمایا "لیکن میرا تجربہ اس قدر وسیع ہو جائے گا، اس میدان میں کہ، میرا مستقبل آپ "سینئرز" جیسا تاریک ترین تو نہیں ہوگا۔۔۔"

پروفیسر پاکستانی نے بات اُچک لی "بلکہ اس سے بھی انشاء اللہ دو آتشہ ہی ہوگا۔ یار، دراصل، موصوف کا مستقبل واقعی انتہائی روشن ہے۔ وہ جو، دھوبی کا گدھا دن بھر سخت محنت مشقت کیا کرتا، دھوبی اُسے کھانے کو نہ دیا کرتا، کام پہ کام لیا کرتا، لیکن جب کبھی غصے میں ہوتا تو اپنی باغی، جوان چھوکری کو ڈپٹتا، کہ میرا بس چلا تو تیری شادی کسی گدھے سے کر دوں گا۔ اسی آس و نراس میں وہ غریب دن بِتاتا رہا۔"

ہمارا جب کبھی بے تحاشا "ریلیکس" ہونے کا موڈ ہوا کرتا تو ہم "دکانِ بے چلن" کا رخ کیا کرتے۔ کئی مرتبہ اپنے قیمتی "کمپیوٹر" کی ونڈوز میں چھینک چھینک کر اور کھانس کھانس کر انتہائی خطرناک "وائرس" داخل کیا کرتے کہ موصوف کی دکان پر جانے کا موقع تو مل جائے گا۔

موصوف کا شمار اُن "بچوں" میں کیا جائے گا کہ جس بچے نے اپنی ماں سے کہا تھا کہ امّی۔۔۔ امّی مجھے اندھیرے میں ڈر لگتا ہے اور ایک بڑا سا کالا دیو نظر آتا ہے۔ ماں نے جواب دیا "تو مرد بچہ ہے، بیٹا، اب کے وہ دیو تجھے نظر آوے تو آگے بڑھ کر وار کرنا، وہیں پتا چل جائے گا کہ حقیقت ہے یا محض تیرا وہم۔" بچے نے پوچھا "اور امّی اگر اُس کالے دیو کی امّی نے بھی اُسے یہی نصیحت کی ہو تو؟"

موصوف اس قدر محتاط تھے کہ بقول پروفیسر پاکستانی "یار اس آدمی کو اگر آبِ حیات بھی مل جائے تو اُبال کر پیے گا!"

مثل مشہور ہے فقیر کی گالی، عورت کے تھپڑ اور مسخرے کی بات سے کوئی آزردہ نہیں ہوا کرتا، یہ قول ہمارا نہیں، ایک "اور" کا ہے۔

پروفیسر "ایک اور"

بقول پروفیسر پاکستانی "تم جیسا مزاح گو تو بڑے خوش نصیب ہوا کرتے ہیں کہ تمہاری فاش سے فاش غلطی کو بھی پڑھنے والے مزاح کا کوئی پہلو سمجھتے ہیں، لیکن کیا کرا جائے، کہ تم پروفیسر "ایک اور" کو ہنسا کر دکھاؤ تو جانیں۔"

ہم بولے "وہ خدا کا بندہ پورا ہفتہ پابندی سے کالج آئے، تو بات بنے نا۔ دو چار دن بعد آتے ہی اسٹاف روم میں کرسیاں الٹ دیتا ہے، میز کے پائے توڑ دیتا ہے، پانی کا جگ زمین پر پٹخ دیتا ہے اور فرسٹ ائر میں جا کر 'سیکنڈ ائر' کی کلاس لیتا ہے۔ اُس روز چاہے کچھ پہنے، نہ پہنے، سیاہ گاؤن ضرور پہنتا ہے، لوہے کے بھاری بوٹ جیسے فوجی بوٹ ہوا کرتے ہیں، پہنتا ہے، لوہے کا خود سر پر دھرے انتہائی کرب کے عالم میں کلاس لے کر ثابت کر دیتا ہے کہ پورے دانش کدے میں اِک وہی "چلن بے شتر" ہے۔ اس کی ہر بات میں کسی نہ کسی طرح سے موسم کی خرابی چھپی

ہوتی ہے۔ کبھی گیلے کپڑے نہ سوکھنے کا شکوہ کرتا ہے تو کبھی جامعۂ شہر کے ''کنٹرولر ایگزامینیشن'' کے نامہرباں رویے پر کھکھیاتا ہے۔''

اس پہ پروفیسر پاکستانی گویا ہوئے ''ذات کا بھی پیچھے سے رانگڑ ہے، زبان اور قواعد کی پابندی کو تکلف بھی نہیں سمجھتا۔تم جتنی کوشش اور کاوش سے غلط زبان لکھتے ہو، جاتے ہی محض ایک ڈسٹر سے تمہارا چھاپا ، پورا تختۂ سیاہ بالکل'' سیاہ'' کر کے دَم لیتا ہے۔صاحب ، یہ تو سانس بھی اُلٹی گنتی کی طرح لیتا ہے ، واضح رہے،اس کی دوسانسوں کے درمیان سو سے ایک تک کی اُلٹی گنتی ہوا کرتی ہے۔اُس روز کی مثال ہے لے لو، پرنسپل نے بار بار اِسے،اپنی شکارگاہ(آفس) میں بلایا تو اِس نے اپنے چہرے سے ایسے اوچھے'امپریشن' دئے کہ پرنسپل تو مغلظات پر اُتر آیا۔اِس کا فائنل ٹرم کا بنایا ہوا ،امتحانی پرچہ نکال کر اُس نے جابجا اوچھے نشانات مثلاً '' ''۔؟! لگانے شروع کر دئے اور بالآخر پورے مسودے پر قلم پھیرتے ہوئے فرمایا: ''کسی ایک زبان کا انتخاب کیجئے ، بچے آپ کے تبحرِ علمی کی تاب نہیں لا سکیں گے!''

اس پہ وہ ''ایک اور'' بولا ''اجی جانے دیجئے ، ہمارا تبحرِ علمی تو آپ کے خاندان کے مقابلے میں کچھ نہیں ، یاد نہیں ، آپ کے باوا آدم ، مسجد غیر مسلم کی ٹنکی میں زنجیر سے بندھے گلاس سے استنجا کر کے سڑکوں پر سُکھاتے پھرتے تھے۔چلے ہیں ہمیں زبان کی تعلیم دینے والے۔''

تس پہ پروفیسر پاکستانی نے حلفیہ اقرار کیا'' یہ گالی سُن کر پرنسپل کالج بذاتِ اُس کی ہمشیرہ کو اپنے نکاح میں لینے اور وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی خواہش کا فی الفور اظہار کیا ، بعد ازاں سر پھٹول کے بعد دونوں نزدیکی سرکاری اسپتال میں پٹیاں کرواتے پائے گئے۔

پروفیسر'' ایک اور'' ، اچانک ، آسمان کی غیبی قوتوں سے فی الفور رابطہ کر کے بھیانک آواز میں حالی پانی پتی کی ''مناجاتِ بیوہ'' کے شقی القلب اشعار پڑھنا شروع کر دیتا، کوئی دس نو سال پہلے ڈاکٹر صاحب بھی ''سایۂ پدری'' سے محروم ہوئے تھے ، اس لئے ''مناجاتِ بیوہ'' کو''مناجاتِ والدہ'' جان کر دن کی کمائی اُس مکار کے ہاتھوں پر دھر دیا کرتے۔

ایک بار ہم نے جل کر کہا'' اس بدمعاش کو کسی نزدیکی جیل میں دھانس دوں گا اگر دوبارہ نظر آیا مجھے!''

''سر!سر!ایسا غضب نہ کیجئے گا ، میری پی ایچ ڈی کی ڈگری رُل جائے گی اس کی بیوی میری مقالہ سُپر وائزر ہے !'' وہ گھگھیائے۔

''واجد!سلطنتِ مُغلیہ کی تباہی کی وجہ تو ظاہر ظہور ہے لیکن ''جامعہ'' کی زبوں حالی کی وجہ ''سُپر وائزرز'' کا انتخاب ہے، ہمارے ملک کا المیہ یہی ہے کہ ''زیرِ تعلیم''، ''وزیرِ تعلیم'' ہوتا ہے، ووٹ کا ''وُ'' اُڑا کر اور جسے خود برس ہا برس تحقیق و لاعلاج بیماریوں کی تشخیص کی ضرورت ہوتی ہے ، وہ خود ڈاکٹریٹ کا ''سپروائزر'' ہوتا ہے، یار یونیورسٹی نے کوئی ''کرائٹ ایریا'' تو رکھا ہوتا''نگراں مقالہ'' کا!''

ہمارے ڈائلاگ سُن کر اُنھوں نے فوری چائے منگوالی ، جو ظاہر ہے اُن کی سرکاری تنخواہ کی تھی ،دُکان پر تو وہ اُلٹا لگا رہے تھے۔

''سر!دُکان چلانے کی کوئی ترکیب بتائیں!'' وہ چائے کی چُسکی لیتے ہوئے بولے۔

''کوئی میڈیکل اسٹور ، فاسٹ فوڈ سینٹر یا کسی مستجاب الدعوات بزرگ کا آستانہ کھول لو!''

''وہ کیسے؟''

''مطلب یہ کہ ملازمت پیشہ آدمی '' بے توقیری '' کو HazardProfessional سمجھ کر قبول کرتا ہے، فیوڈل عہد کی روایت ، خُو بُو ، بلکہ سچ پوچھو تو بدبو اور خواری جاتے جاتے جاتی ہے۔یا اس دُکان کی مالکہ سے تنخواہ میں ''نمک'' لینا شروع کر دو کہ روم میں قدیم عہد میں ملازمین کی قیمت نمک کی صورت میں ادا کی جاتی تھی اور تنخواہ تقسیم کرنے والا محکمہ ''بخشی خانہ'' کہلاتا تھا۔تم ذہنی سکون اور بے فکری چاہتے ہو تو اس دُکان میں یتیم خانہ ڈال لو، دنیا کے کسی ملک میں دیکھ لو ، جتنی عزت ، پروفیسروں ، بیواؤں اور یتیموں کو ملی اتنی مولویوں اور حجاموں کو بھی نہیں ملی ، حالانکہ دونوں

طبقات کے ''مسلمان'' پر بے پناہ احسانات ہیں ،لیکن بمع ''اذیت''۔آج بھی تم دیکھ لو کہ جب بھی مشرق میں ہم کسی کو کوئی دعا دیتے ہیں تو ''عزت'' کا آنکڑا ضرور لگاتے ہیں ،مثلاً: آپ عزت سے سبکدوش ہوں ،آپ عزت سے رہیں یا اُٹھیں ،یعنی ،ہم لوگ صحت ، عافیت ، کثرتِ اولاد، آسودہ حالی ،افزونیٔ ایمان، حسنِ کارکردگی، ترقی ،درجات اور بلندء منصب کی دعائیں جانتے ہی نہیں ،بس ''عزت'' پر سارا زور ہے۔اب تم یہی دیکھ لو کہ اس دکان کی بانی ،منتظمہ ،مہتمہ ،سرپرست ،خازن اور خائنہ ،وہ تمہاری مقالہ سپر وائزر ہے، تمھیں ایک بجے کالج سے بھوکا پیاسا بلاتی ہے اور بھوکوں مارتی ہے ،وہ اپنے شوہر سے بھی نیک چلنی کا سارٹیفیکیٹ مانگی ہوگی، تبھی بڈھے نے ہر بار چالان، مچلکہ، وارنٹ گرفتاری، مصدقہ نقل حکم سزا یابی یا تم الیکشن میں جس جیل میں گئے تھے کچھ گھنٹوں کو، وہاں کے ''بستہ الف'' بدمعاشوں کے ریکارڈ کی عکسی نقل، سبھی کچھ اُس حرافہ کو پیش کر دیا لیکن اُس کا تردد برقرار رہا ،جو کچھ ایسا بے جا بھی نہ تھا۔اُس بڈھے نے جو اپنا حلیہ بنا رکھا ہے ،اُس یعنی منڈا ہوا سر، آنکھوں میں سُرمے کی لکیر، اٹنگا پاجامہ ،سر پر مخمل کی رام پوری ٹوپی سیاہ رنگ والی، پیر میں کھڑاؤں ،اس حلیے کے ساتھ وہ چاہے بھی تو ''نیک چلنی'' بلکہ ''نامردی'' اور ''نیک چلنی'' کے سوا اور کچھ پیش نہیں کرسکتا ،نیک چلنی اُس کی مجبوری ہے لیکن اختیاری وصف نہیں واجد ماور اس ملعون کا حلیہ ،اُس می نیک چلنی کا ثبوت نہیں، بلکہ سائن بورڈ ہے ،تم بھی نیک چلن بن جاؤ اور اس دکان میں یتیم خانہ ڈال لو، یاد رکھو، یتیم تن درست، مستنڈے نہ ہوں ،صورت سے مسکین معلوم ہوں ،خوش خوراک نہ ہوں، نہ اتنے چھوٹے ٹوییاں کہ کہ چونچ میں چوگا دینا پڑے،، نہ اتنے ڈھوے کے ڈھوے اور پیٹو کہ روٹیوں کی تھئی کی تھئی ٹھور جائیں اور ڈکار تک نہ لیں۔ایسے گُل بدن بھی نہ ہوں کہ گال پر ایک مچھر کا سایہ بھی پڑ جائے تو شہزادہ گلفام کو ملیریا ہو جائے ،پھر بخار میں دودھ پلاؤ تو ایک ہی سانس میں بالٹی کی بالٹی ڈکوس جائیں ۔بیجا بعضا لونڈا ٹخنے تک پولا ہوتا ہے یتیم باہر سے لاغر لیکن اندر سے بالکل تن درست ہونے چاہئیں ۔ایسے نازک بھی نہ ہوں کہ نہانے کو گرم پانی کی بالٹی اٹھاتے وقت اُن کی ناف ٹل جائے، جب دیکھو حرام کے جنے کمر لچکائے بستر پہ پڑے ہیں، اب اپنی ٹلی ہوئی ناف مجھے کیا دِکھا رہا ہے، اپنی میّا کو دکھا یا حکیم کو، میانہ قد اور درمیانہ عمر کے ہوں، اتنے بڑے اور ڈھیٹ نہ ہوں کہ تھپڑ مارو تو ہاتھ گھنٹے بھر تک جھنجھناتا رہے اور ان حرامیوں کا گال بھی پیکا نہ ہو ،جاڑے میں زیادہ جاڑا اور گرمیوں میں زیادہ گرمی نہ لگتی ہو، رات کو بستر ے میں پیشاب نہ کرتے ہوں، خاندان میں 'دِق' اور سر میں جوئیں ،لیکھیں نہ ہوں ،اُٹھان میانی ہو، نہ کہ ہر سال کپڑے جوتے چھوٹے ہوتے رہیں ،اندھے ،کانے ، گونگے ، لنگڑے ، لولے، بہرے نہ ہوں مگر لگتے ہوں۔یتیم لونڈے خوش شکل بھی ہرگز ہرگز نہ ہوں، منھ پر مہاسے اور ناک لمبی نہ ہو!''

''وہ کیوں سر؟'' واجد صاحب نے ایک دم گھبرا کر پوچھا۔غالباً وہ ہماری گفتگو سُن سُن کر اپنے معصومانہ ذہن میں کسی ''آئیڈیل یتیم'' کا ماڈل چہرہ بنانے لگے تھے۔

''ایسے لونڈے آگے چل کر لُوطی نکلتے ہیں!''

''استغفراللہ!!! سر، آپ کو میڈم یاد کر رہی ہوں گی گھر پر، لیکن ٹھہریے ٹھہریے، ایسے یتیم ملیں گے کہاں؟'' واجد بے قراری سے بولے، غالباً یتیم خانہ والا آئیڈیا اُن کے دل کے تار جھنجھنا گیا تھا۔

''میاں، ایک تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے گھنٹہ بھر سے!''

کراچی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر ڈاکٹر مجیب ظفر انوار حمیدی اُردو کے ایک بہت بڑے ادیب جناب انوار (عنیگ) کے بہت بڑے صاحبزادے ہیں۔یہ بچوں کے معروف ادیب ہیں۔اب تک انہوں نے بچوں کے لئے سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں کہانیاں لکھ لی ہیں اور مسلسل لکھ رہے ہیں۔ پروفیسر صاحب کے اندازِ بیان کا طرۂ امتیاز شگفتگی اور بیساختگی ہے۔خصوصاً قلمی خاکے لکھنے میں تو اِن کا جواب ہی نہیں۔ حالات و واقعات کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ تصویر سی بنا کر رکھ دیتے ہیں۔''ارمغانِ ابتسام'' کو فخر حاصل ہے کہ یہ اس کے لئے تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

دلشاد نسیم

مرغ نامہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب بچے ابھی چھوٹے ہی تھے اور بچوں کے باپ نے چھوٹے بچوں کے نازک دلوں میں جانوروں کی ایسی محبت بھر دی کہ میں احساس کمتری کا شکار ہونے لگی تھی۔ تقریباً ہر شام ایک گھنٹے سے ڈیڑھ تک جانوروں ور پرندوں کی باتیں ہوتیں اور یہ بھی کہ ہم کون سا جانور یا پرندہ لائیں گے۔ ایک بار تو بچوں کے شوق کی وجہ سے ہمارے ہاں گائے بھی لائی جا چکی تھی۔ اسی طرح ایک شام جب خالد صاحب آفس سے آئے حسن اور حمزہ کے ساتھ فیوچر پلان کر رہے تھے تو خالد صاحب نے بچوں کا آتشِ شوق اس طرح بھڑ کایا۔

''یار منڈی میں صبح صبح ہی مرغے آ جاتے ہیں ان کو اسی وقت لینا چاہیے کیوں کہ بعد میں دکاندار ان کو آٹا کھلا کے خوب پانی پلا پلا کر موٹا کر دیتے ہیں جس سے ان کی قیمت بڑھ جاتی ہے اور وہ صحت مند دکھنے لگتے ہیں۔'' طے پایا وہ اتوار کی صبح نکلیں گے اور دو دن کے بعد آنے والے اتوار کو وہ تینوں ہم سب سے پہلے اٹھ بھی گئے۔

''فجر پڑھنے تو اٹھتے نہیں مرغے خریدنے چلے جائیں گے۔'' امی نے روایتی ماؤں والا جملہ ادا کیا اور کروٹ لے لی۔

یوں ہوا کہ اتوار کی صبح وہ تینوں اپنے پروگرام کے تحت منہ اندھیرے ہی چلے گئے۔ میں نے گیٹ بند کیا اور آنے والے ممکنہ مسائل کی سوچوں میں گم پھر سو گئی۔ کوئی سات بجے کا وقت تھا جب غیر مانوس آوازوں نے مجھے جگایا۔ ککڑوں ککڑوں، ککڑوں صبح خیز مرغ اپنا فرض ادا کر رہے تھے۔ ایک مرغے کو دوسرے مرغے کی بات کا یقین نہ آتا وہ اپنی آواز کا جادو جگانے کے لیے آواز اور بڑھا دیتا۔ میں یہی خیال کرتی رہی کہ شاید میں خواب دیکھ رہی ہوں کیوں کہ یہی کچھ سوچتے ہوئے سوئی تھی۔ بہت ڈھیر غیر مانوس آوازوں میں سے ایک انتہائی مانوس محبت بھری آواز آئی ''دلشاد۔۔۔''

یہ خالد صاحب کی آواز تھی۔

میں جھٹکے سے اٹھی اور صحن کی طرف سے آتی ہوئی آوازوں کی طرف لپکی اور میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ پانچ مرغے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی خواہش میں بانگ پہ بانگ دیے جا رہے تھے اور مجھے اقبال کا بانگِ درا اور بانگِ مرغ کے فرق کا پہلی بار احساس ہوا۔ حسن اور حمزہ باری باری مرغوں کے پنجوں کو ٹونٹی کے نیچے کر کے صابن سے دھو رہے تھے تا کہ ان کے جراثیم ختم کیے جا سکیں اتنے میں پاپا میرا مطلب ہے بچوں کے پاپا

نے مجھے آرڈر دیا۔ ''جلدی سے چائے رس لے آؤ۔''

''مگر آپ تو چائے رس نہیں کھاتے؟'' میرا حیرت بھرا جواب آیا۔

خالد صاحب نے مصروف سے انداز میں کہا۔ ''میں اپنے لیے نہیں مرغوں کے لیے منگوا رہا ہوں اور ہاں پتی نہ پھینکنا وہ بھی رس کے ساتھ ہونی چاہیے۔'' حکمیہ لہجے میں سنائی دیا۔

امی پریشان سی کارروائی دیکھتے دیکھتے بولیں ''بیٹا کوئی مرغی بھی لے آتی تھی۔ اتنی بیٹھیں صاف کرتی ہے تو کم سے کم کچھ فائدہ ہی ہوتا۔ انڈے ہی ملتے۔''

حسن نے تقریباً مذاق اڑایا ''دادی ماں وہ تو بازار سے مل جاتے ہیں۔''

حمزہ نے مرغیوں سے عام نفرت کا اعلان کیا ''ہم لڑکے ہیں ہم لڑکے مرغے ہی پالیں گے۔''

امی کا چہرہ ہنسنے کی وجہ سے سرخ ہو گیا۔

''دادی ماں آپ کا رنگ میرے گولڈن پف جیسا ہو رہا ہے۔'' حمزہ نے خوش ہو کر کہا۔

''بری بات ہے بیٹے دادی ماں کو ایسے نہیں کہتے۔'' خالد صاحب نے بہت عام سے لہجے میں سرسری سا ٹوکا۔

''بابا جی سے۔'' چھ سال کے حمزہ نے بھولے تاثرات کے ساتھ جتایا اور گولڈن پف کو دادی ماں کے چہرے کے ساتھ لگایا۔

''پاپا ٹھیک کہتے ہیں حمزہ۔ بڑوں کا ادب کرنا چاہیے۔'' سیانا حسن بولا۔

اسی عرصے میں سارے مرغے اپنے پاؤں دھلوا چکے تھے اور چائے رس کھانے کے لیے چوکنے ہو چکے تھے۔

''پاپا چائے رس کیوں کھلاتے ہیں۔'' حمزہ کا سوال آیا۔

''یہ ضروری ہوتا ہے تاکہ راستے میں کچھ ایسا ویسا کھایا ہو تو وہ نکل جائے ہے ناں پاپا۔'' حسن نے جواب دیا۔

''پاپا ایسا ویسا کیا ہوتا ہے؟''

حمزہ کے سوال ایسے ہی ہوتے تھے کہ ایک لمحے کو جواب دینا مشکل ہوتا۔

''تائیں ناں۔'' اس کو جواب کی اتنی عجلت تھی کہ بتائیں کا ''ب'' بھی غائب کر گیا۔

''بس کھا لیتے ہیں مرغ کچھ۔''

''پتھر؟'' حمزہ نے آنکھیں پھیلائیں اور سوال کیا۔

''بے وقوف پتھر کیسے کھا سکتے ہیں۔'' حسن نے تقریباً اس کو احمقی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

ابھی یہ سوال جواب چل رہے تھے میں نے پریشان ہو کر بلکہ روتے ہوئے امی جی سے کہا ''ہمارے پاس تو کوئی ڈربہ بھی نہیں ہے۔ ہم ان کو کہاں رکھیں گے۔''

میرا سوال خالد صاحب نے سن لیا ''ڈربے کی کیا ضرورت ہے؟ ایسے ہی پھریں گے گھر میں۔''

''کیا۔'' کاش میں بے ہوش ہو جاتی۔

کرکٹ نام کا ایک کیڑا جو ہر دوسرے پاکستانی کے دماغ میں ہے اور یہ کیڑا عمر کے ساتھ ساتھ نشوونما پاتا ہے۔ مضبوط ہوتا ہے جوان ہوتا ہے۔ بوڑھا ہوتا ہے اور اکثر تو یہ موت تک ساتھ دیتا ہے۔ یہی کیڑا ایک عمر میں سپر سٹار بننے کے خواب دیکھتا ہے۔ سٹیڈیم میں تماشائیوں کے سامنے بیہودہ کرنے کی باتیں سوچتا ہے۔ پھر وقت گزرنے اور عمر کے ڈھلنے کے ساتھ ساتھ خود کو دلاسہ دینے کے لیے کرکٹ کے پرانے بڑی عمر والے کھلاڑیوں سے اپنا موازنہ کرتا اور کہتا ہے اگر یہ لوگ کھیل سکتے ہیں تو میں بھی کھیل سکتا ہوں۔ اور پھر آہستہ آہستہ ہلکی پھلکی مایوسی کے ساتھ سٹیڈیم میں کراؤڈ کے ساتھ بیٹھ کے کرکٹ دیکھنے کی پلاننگ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن بھوک اور افلاس کا مارا یہ کیڑا روزی روٹی کے چکر میں ایسا پھنستا ہے کہ اکثر اس خواہش کو بھی قتل کر دیتا ہے۔ مگر پھر بھی اس کو چین نہیں ملتا اور عمر کے ایک خاص حصے میں گھر بیٹھ کر ڈیوٹی اور دوسرے کاموں سے ٹائم بچا کر ٹی وی پر کرکٹ دیکھنے کی کوششیں کرتا رہتا ہے۔

اس کیڑے کی سب سے ہلکی کمزور اور تقریباً آخری سٹیج میں یہ دوسروں سے پوچھتا پھرتا ہے۔ کتنے سکور ہو گئے کتنے آؤٹ ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔

عمر کے ڈھلنے دیگر دنیاوی کام کاج وقت کی قلت اور کچھ واپڈا والوں کی مہربانیوں کی وجہ سے یہ بیچارہ کیڑا بوڑھا کمزور اور لاغر ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن روایتی حریف سے میچ ایک ایسی نایاب دوا ہے جو بوڑھے سے بوڑھے کیڑے کو جوان اور کمزور سے کمزور کیڑے میں جان ڈال دیتی ہے۔

ارسلان بلوچ

"خالد صاحب ڈربے کے بغیر مگر کیسے؟" مجھے رونا آرہا تھا۔

"امی آپ نے چک جھمرے میں، چنیوٹ میں مرغے رکھے ہوئے تھے ایسے ہی۔" انہوں نے یاد دلایا۔ "تو یہاں بھی رہ لیں گے۔"

"بیٹا وہ کچی زمین تھی۔" امی نے ان کے یاد دلانے پر ان کو احساس دلایا۔

"خالد صاحب اس کی تو بد بو ہی بہت ہوتی ہے۔"

"ماما جانوروں سے پیار کرنے کا بہت ثواب ہے میری بک میں لکھا ہے۔"

حسن نے کہا تو میری جی چاہا۔ مگر کوئی فائدہ نہیں مجھے مرغے قبول کرنے ہی پڑیں گے۔ میں نے ہار مان لی لیکن میرے بدبو والی بات پر تو خالد صاحب نے مجھے ایسے دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں "بڑی آئی تم پیرس سے۔۔۔"

قصہ مختصر، مرغے جس میں دو گولڈن پف اور تین اصیل تھے، گھر میں رہنے لگے۔ رہ گئی میں مجھے تو سمجھیں کہ ملازمت مل گئی۔ صبح چائے رس۔ دس بجے پیاز لہسن اور کھیرا پالک دوپہر روٹی پکا کر ان کے بھورے کرنے اور مرغوں کو لنچ کراتی۔ دوپہر بچے سکول سے آجاتے تو وہ باجرہ، گندم اور چاول سلاد کھلا دیتے۔ رات کو بقول خالد صاحب ہلکی غذا دینی چاہیے سوڈبل روٹی کھایا کرتے۔ اگر میں یہ بتاؤں کہ صبح کا نظارہ کیا ہوتا تھا تو آپ سب کو میری حالت پہ ضرور ترس آئے گا۔ کاش میں ان سب مرغوں کو پیمپر لگا سکتی۔ سمجھ تو آپ گئے ہوں گے۔

ہر دوسرے تیسرے دن ہومیو پیتھک کی کچھ ادویات بھی دی جاتیں تا کہ وہ ممکنہ بیماریوں سے محفوظ رہیں بچوں کے پاپا ڈاکٹر بھی تو تھے۔

جوں جوں بچوں اور بچوں کے پاپا کی مرغوں سے محبت بڑھ رہی تھی توں توں میری مرغوں سے نفرت دو چند ہوتی جا رہی تھی اور کیوں نہ ہوتی بچے اور کیا بچوں کے پاپا آتے ہی پوچھتے۔ مرغے ٹھیک ہیں ناں؟

ایک دن مجھے ڈائریا ہو گیا اور شدید طبیعت کی خرابی میں خالد صاحب کو فون کیا اور بتایا کہ "طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی انفیکشن سا لگتا ہے بخار بھی ہو گیا ہے الٹیوں کے ساتھ۔ آہو۔"

انہوں نے گھبرا کے کہا۔ "پانی میں چند قطرے ایکونائٹ ملا کے پلا دو۔۔۔ حسن حمزہ سے کہو وہ پلا دیں گے۔ سب مرغوں کو ویسے کون سا مرغا بیمار ہے۔"

"لیکن۔" میں کچھ کہنا چاہ رہی تھی۔

وہ سخت برہم ہو گئے کہنے لگے۔ "تم تو چاہتی ہو کہ مرغے زندہ ہی نہ رہیں۔"

"یار میں اپنی بات کر رہی تھی۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اوہ" وہ قطعی شرمندہ نہ ہوئے۔ "تو بتانا تھا۔ خیر تمہارے لیے بھی یہی خوراک ہے۔ ابھی ٹھیک ہو جاؤ گی۔"

میری دردناک داستان ایسے کیسے ختم ہوتی تھی۔ میرا بس چلتا تو ایک ایک مرغے کو پکڑ پکڑ کے خود مار ڈالتی لیکن میری پریشانی دیکھیے کہ اگر غلطی سے کوئی مرغا بے وقت بانگ بھی دے دیتا تو اس کی طبیعت کی خرابی کی باقاعدہ فکر ہو جاتی اور بیماری کی وجہ دلشاد ہوتی۔

وہ گرمیوں کے دن تھے جب میری نند بچوں کے ساتھ رہنے آئی۔ اب گھر میں کرکٹ میچ کا سا حال تھا جتنے بچے اتنے مرغے باقی ہم سب حاضرین۔ ایک ایک مرغے کی شان میں ایسے قصیدہ گوئی ہوتی کہ میں ان کے چلنے کے قصے ان کے کھانے کے انداز پہ باتیں۔ اُف۔ ایک شام نندوئی بھی آ گئے تو مارے محبت کے امی نے روک لیا۔ وہ گھر کے نچلے پورشن میں سو رہے تھے ہم اوپر۔

صبح اٹھے میرے نندوئی بہت غصے میں تھے۔ نند شرمندہ امی نے وجہ پوچھی تو نندوئی جی تو پھٹ ہی پڑے کہنے لگے۔ "حد ہوتی ہے امی۔ رات تک تو ٹھیک ہے لیکن فجر کے وقت سے آپ کے شہزادوں نے جو بانگیں دینا شروع کیں سونا عذاب کر دیا۔" میتوں اپنا غصہ آیا۔ پا بھی میں تے لایا چھتر تے ساریاں نوں دو مارے فیر وی کم بختاں نے سون نئیں دتا۔" (میں نے سب کو جوتیاں

ماریں پھر بھی انہوں نے سونے نہیں دیا۔)

امی شرمندہ ہوئیں لیکن حسن حمزہ اور خالد صاحب نہایت اطمینان سے بولے۔ ''مرغے ہیں بانگ تو دیں گے اب لوری تو دینے سے رہے۔'' یہ بات ہنستے ہوئے سوائے خالد محمود کے کون کہہ سکتا تھا۔

''تو پھر آج آپ نیچے میں اوپر سوؤں گا۔''

لیکن یہ نوبت نہیں آئی۔ وہ شام کو چلے گئے۔ امی جان تھوڑا خفا بھی ہوئیں مگر مرغوں کا عشق غالب رہا۔ شام ہوئی تو دونوں بھائی گھر میں آئے سانس پھولی ہوئی اور بابا سے کہنے لگے۔ ''راجہ بھائی ہیں نا راجہ بھائی۔''

انہوں نے اس لڑکے کا نام لیا جو ہمارے محلے میں فارمی مرغیاں بیچا کرتا تھا۔ ''اس کے پاس ایک بہت اچھا تگڑا مرغا ہے اور پاپا صرف ڈیڑھ ہزار کا ہے۔''

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ''ڈیڑھ ہزار؟''

''کتنا سستا ہے نا پاپا؟'' حسن نے ایسے پوچھا جیسے ڈیڑھ ہزار بات ہی نہ ہو۔ یہ میں بتاتی چلوں آج سے تقریباً پندرہ سولہ سال پرانی بات ہے۔

''اگر وہ ہزار کا دیتا ہے تو لے آؤ۔'' ہائے حاتم طائی۔

''خالد بیٹا بچوں کے ساتھ تم بھی بچہ بن جاتے ہو۔'' امی کی معصومیت۔

''امی بچوں کا شوق ہے۔ کوئی بات نہیں۔''

''اب اگر گھر میں کوئی اور مرغا آیا تو اس میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گی۔'' میری للکار پر سب نے مجھے یوں دیکھا جیسے یہ منہ اور مسور کی دال۔ شاید یہ محاورہ ٹھیک ہو لیکن ۵۔ خالد سٹریٹ میں سب غلط ہو رہا تھا۔

''دلشاد معصوم مرغے تمہیں کہتے کیا ہیں؟''

''دیکھیں خالد صاحب میں سچ کہہ رہی ہوں ان کو بھی بھیجیں نہیں تو میں نے ذبح کرا لینے ہیں اور۔۔۔''

ابھی میرا غصہ ادھورا تھا کہ ایک چتکبرا مرغا جس کا وزن کم سے کم تین ساڑھے تین کلو ہوگا۔ حمزہ کی گود سے اچھلا حسن اور حمزہ ایسے فاتحانہ انداز میں پاپا کو دیکھ رہے تھے کہ جیسے پی ایچ ڈی کا گولڈ میڈل لے کے آئے ہوں۔

مرغے نے اڈاری بھری اور صحن کی دیوار پہ چڑھ گیا۔ خالد صاحب کی تعریفی نظر نے مرغے کی اڈاری کے ساتھ سفر کیا اور بچوں کی تعریف کی۔ ماشااللہ کس قدر خوبصورت ہے۔

''ایک ہزار کا لے کے آئے ہیں۔'' حسن نے بتایا۔

''مشکل سے مانا تھا۔'' حمزہ کا لقمہ۔ ''مگر ہم لے کے آگئے۔''

جس دیوار پہ اڈاری بھر کے مرغا استراحت فرما رہا تھا وہ ہماری اور پڑوسیوں کی سانجھی تھی۔ شاید دوسری طرف سے کسی نے مرغے کو نیچے کودنے پر مجبور کیا۔ اب مرغے کو خود سوچنا چاہیے تھا کہ اتنا وزن لے کے اول تو دیوار پہ چڑھنا ہی نہیں چاہیے تھا اور اب اگر چڑھ گیا تو کودنے کے لیے کوئی محفوظ Posture اختیار کرے۔ لیکن وہ پھڑ پھڑاتا ہوا نیچے آیا اور اٹھ نہ سکا۔ یقین کیجئے میرا کوئی قصور نہیں تھا لیکن بچوں اور خالد صاحب نے مجھے موردالزام ٹھہرایا کہ میں نے بددعا دی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ مرغا واپس کر دیا گیا کچھ پیسے دینے پڑے سرجری کے لیے شاید۔ لیکن آج تک سنتی ہوں کہ بے چارے کے آنے سے پہلے ہی منحوس جملے نکالے جانے کی وجہ سے اس کی ٹانگ ٹوٹی۔ آپ نے میرا مرغ نامہ سنا آپ بتائیں میرا احساسِ کمتری بنتا ہے کہ نہیں۔ باقی مرغوں کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ اگلی کسی کہانی میں سناؤں گی۔

دلشاد نسیم صاحبہ کا میکہ تو کراچی ہے مگر روایتی ہجرت کے بعد مستقل سکونت زندہ دلانِ شہر لاہور میں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا شوق بچپن سے۔۔۔افسانہ۔۔۔ناول۔۔۔ناولٹ۔۔۔ڈرامہ بھی کچھ لکھتی ہیں۔ بہت سے ڈرامے مختلف چینلز سے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ اِس کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن بھی فرماتی رہتی ہیں۔ اِن کا قلم مزاح کے میدان میں خوب چلتا ہے۔ فیس بک پر ادبی گروہ ''ادبیکا'' کی منتظم بھی ہیں اور شعراء کو مشقِ سخن کروانے کے سلسلے میں خاصی متحرک ہیں۔

نورم خان

معصومیت

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہمارے ایک مردانی دوست کے مردان میں قائم سوات متاثرین کے ایک کیمپ میں ایک صاحب کے یہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تو انہوں نے ان میں سے ایک کا نام صوفی محمد اور دوسرے کا فضل اللہ رکھ دیا تھا، یہ سنتے ہی ہم پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ ابھی ہم یہ سوچ ہی رہے تھے کہ ان صاحب تک اسکی مبارک باد کیسے پہنچائیں کہ ایک دوست کا فون آگیا۔ انہوں نے بغیر سلام ودعا کے اس واقعہ پر اپنی گہری تشویش ظاہر کرتے ہوئے ہماری رائے جاننا چاہی، مطلب یہ کہ وہ اس بات پر سخت پریشان تھے کہ آخر ایسے عالم میں کہ جن لوگوں کی ہٹ دھرمیوں کی وجہ سے لاکھوں پرامن شہری اپنے گھروں سے دور اس قیامت خیز گرمی میں خیموں میں اذیت برداشت کر رہے ہیں، ان کے ناموں پر ان پھول جیسے بچوں کے نام رکھ کر ان کے والدین کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟

بظاہر اس واقعہ سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا یعنی ہم سے پوچھ کر ان بچوں کے نام نہیں رکھے گئے تھے لیکن ان کی تسلی بھی ضروری تھی کہ ان کے خیال میں ہم "واں نہیں تو واں کے نکالے ہوئے تو ہیں"۔ تاہم مناسب الفاظ کے انتخاب میں وقفہ طویل ہوا تو انہوں نے کچھ اور سمجھا اور بھنا کے لائن کاٹ دی۔ ہم نے بھی سکون کا سانس لیا کہ چلو چھٹی ہوئی۔ لیکن سکون کا یہ لمحہ عارضی ثابت ہوا۔ فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ بھی وہی سوال کسی اور صاحب کی جانب سے ایک نئے پیرائے میں ہمارے سامنے رکھا گیا۔ ابھی ہم جواب کے لئے سٹارٹ ہی لے رہے تھے کہ لائن ڈراپ ہوگئی۔ کچھ دیر بعد ایک بار پھر ہم سے جواب طلبی کی گئی تو ہم نے خود ہی لائن کاٹ دی۔ لیکن یہ سلسلہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ فون آف کر کے لمبی تان کے سو جائیں۔

تاہم اپنی بدتہذیبی کا احساس ہوتے ہی ہم یہ کالم لکھنے بیٹھ گئے ہیں تا کہ ان تمام دوستوں کو فرداً فرداً جواب دینے کی بجائے باجماعت سمجھا سکیں کہ مردان کیمپ میں اگر کسی نے اپنے بچوں کے یہ نام رکھے ہیں تو خدارا ان کی نیت پر شک نہ کیا جائے۔ کیمپوں میں کسمپرسی کی حالت میں رہنے پر مجبور یہ لوگ نہ یہ مولانا صوفی محمد صاحب کے پرستار ہیں نہ مولانا فضل اللہ کے ہمدرد۔ یہ سیدھے سادھے لوگ ہیں اور اپنی سادگی میں اس عظیم نقل مکانی کو یادگار بنانے کے لئے انہوں نے ان بچوں کے یہ نام رکھ دیئے ہونگے۔ لیکن اسکے علاوہ ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ہمارے سادہ دل

پٹھان بھائی اپنے بچوں کے ناموں کے سلسلے میں کافی فراخ دل واقع ہوئے ہیں۔ کم از کم اس معاملے میں وہ کسی افراتفری کا شکار نہیں ہوتے۔ جب کہ ترقی یافتہ شہروں میں بچے کی پیدائش سے بہت پہلے والدین یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوتے رہتے ہیں کہ خاندان کے بزرگ ان کے بچے کا نام ایسا ویسا نہ رکھ دیں کہ جس پر بعد میں انگلیاں اُٹھیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچے کا نام ایسا ہو کہ محلے کے چاروں طرف چالیس چالیس میل دور کسی اور بچے کا نہ رکھا گیا ہو۔ اس مقصد کے لئے وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اسلامی اور غیر اسلامی ناموں کی ایسی کتابیں خریدتے ہیں جس میں عربی، اردو، فارسی، ہندی، انگریزی، لاطینی، فرانسیسی اور پتہ نہیں کن کن ملکوں اور زبانوں کے سینکڑوں نام موجود ہوتے ہیں۔

ان کتابوں میں سب سے پہلے بچیوں کے ناموں کی فہرست ہوتی ہے، اس کے بعد بچوں کی باری آتی ہے۔ ان ناموں پر تبصرہ کرنے کے لئے پوری کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے۔ مختصراً یہ سمجھ لیں کہ اچھے اچھے ناموں پر پہلے ہی خاندان کے کسی نہ کسی بچے کا رکھا جا چکا ہوتا ہے۔ باقی ماڈرن قسم کے ناموں سے یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کسی مغرب زدہ پڑوسی کے کتے کا نام نہ نکل آئے۔ کچھ نام اتنے مشکوک ہوتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ لڑکے کے لئے ہے یا غلطی سے اسے لڑکیوں والی فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔ کچھ ایسے نام بھی ہوتے ہیں جو دونوں حصوں میں موجود ہوتے ہیں۔ کچھ شاعرانہ نام ہوتے ہیں جو بلا جھجک دونوں کے لئے استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ شاید اسی لئے ہمارے اکثر شعراء شاعری شروع کرتے ہی اپنے اصلی ناموں مثلاً اللہ دتہ وغیرہ کو نسیم سحر جیسے معطر ناموں سے بدلنے کے لئے انہی کتابوں کا سہارا لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا ہے کہ ان کتابوں کی ایک عجیب بات یہ ہوتی ہے کہ لڑکوں سے پہلے لڑکیوں کے نام ہوتے ہیں۔ اسکی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو کہ ننھیالی رشتے داروں کو یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہ ہو نہ ہو اس بار بھی بچی ہی ہوگی تو دوسرے حصے کی ورق گردانی میں کیوں وقت ضائع کریں؟

خیر۔۔۔ جو لوگ کتابوں کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہتے، وہ

شادی بیاہ کی تقریبات کو ہم نے خوراک کھانے کے مقابلوں کی تقریبات بنا رکھا ہے۔ ادھر کھانا لگتا ہے ادھر مہمان پل پڑتے ہیں؛ جو خود بڑھ کر اٹھا لے ہاتھ میں مرغا اسی کا ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی غیر ملکی ہمارے اسلوبِ خورد و نوش کا نظارہ کرے۔

پہلے شادی بیاہ کی تقریبات میں زیادہ سے زیادہ دو تین ڈشیں ہوا کرتی تھیں؛ اب تو ماشاءاللہ روسٹ مرغ، بالٹی گوشت، کلیجی پالک، انڈے کوفتے، قیمہ مٹر، بادا موں سے اٹا ہوا قورمہ، مرغ پلاؤ، آلو بخارے کی چٹنی، بادام، پستے، کرونڈے اور رس گلوں کی دبیز تہوں میں دبا ہوا تنجن اور پھر موسم کے سارے پھل، اس کے علاوہ قلفی، فالودہ اور پھر پانی کے بجائے سیون اپ اور کوکا کولا۔

پہلے کھانے والے بھی راحت میں رہتے تھے اور کھلانے والے بھی۔ ان تقریبات میں آلو گوشت پکانے کا رواج بھی ہوتا تھا۔ شوربا بھی کوئی قابل اعتراض چیز نہیں تھا جو اب مانع ممنوع ہو کر رہ گیا ہے۔ اور آلو سستا ہونے کے باعث اس قابل نہیں سمجھا جاتا کہ اسے گوشت کے ساتھ میل ملاپ کی اجازت دی جائے۔ ''نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نئیں پایا''

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کھانے اتنے مرغانہ اور مرغن نہ ہوں تو کیا نکاح میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے۔ اگر سادگی سے کیا جائے تو کیا ولیمہ ادھورا رہ جاتا ہے؟ کیا یہ فرض ہے کہ قرض لے کر بہت ساری دیگیں پکائی جائیں۔ کھانے والوں کی جان بن جائے اور کھلانے والوں کی جان پر بن جائے اور پھر یہ بھی تو ہے کہ کثرت سے کھانا پکایا جائے تو کثرت سے ضائع بھی ہوتا ہے۔ یہ زیان بے جا ناگزیر تو نہیں۔

بات سے بات از انور مسعود

محلے کے مولوی صاحب سے درخواست کرتے ہیں کہ قرآن دیکھ کر کوئی اچھا سا مبارک نام تجویز کردیں۔ کچھ لوگ اپنے تمام پڑھے لکھے رشتہ داروں میں جا جا کر کہہ آتے ہیں کہ وہ اپنے پسندیدہ ناموں کی فہرست ولادت سے پہلے پہنچادیں۔ تب سارے لوگ اپنے کام کاج چھوڑ کر اس دھندے پر لگ جاتے ہیں۔ خاندان کے کچھ نوجوان باقاعدگی سے نوجوانوں کے وہ پروگرام دیکھنے لگتے ہیں جن میں خاصے ماڈرن ناموں کے حامل نوجوان آتے جاتے رہتے ہیں اور کچھ ہر وقت ایف ایم ریڈیو پر پسندیدہ گانوں کی فرمائشیں بھیجنے والوں اور والیوں کے نام نوٹ کرنے میں جت جاتے ہیں۔ ان تمام رشتہ داروں کی مہربانیوں سے اسلامی اور غیر اسلامی، روایتی اور ماڈرن ناموں کی ایک طویل فہرست حاصل ہوجاتی ہے جو آیندہ سات نسلوں کے لئے کافی ہوتی ہے۔

لیکن ہمارے پٹھان بھائی ایسے موقوں پر کسی جھمیلے میں نہیں پڑتے۔ بلکہ دیکھا جائے تو اس معاملے میں ان سے زیادہ ''لبرل'' کوئی نہیں ہوتا۔ اس بارے میں پیشگی سوچ بچار کو وہ وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں اور پیدائش کے فوراً بعد حالات و واقعات اور موقع محل کی مناسبت سے جو چیز فوری طور پر انہیں متاثر کرتی ہے، اسی پر اپنے بچوں کے نام رکھ دیتے ہیں مثلاً زبردست خان، شیر خان، پہاڑ خان، باز خان، دہشت خان، بادل خان، طوفان خان وغیرہ۔ پنجاب سائیڈ میں مقیم پٹھانوں کے یہاں دریا خان اور کراچی کے ساحلی علاقوں میں سمندر خان جیسے نام بھی عام ہیں۔ ویسے ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ناموں کے بارے میں زیادہ سنجیدہ ہونا تضیعِ اوقات ہے۔ مرشدی شیکسپیر کا بھی یہی ارشاد ہے کہ'' ناموں میں کیا رکھا ہے؟ گلاب کو جس نام سے پکارو ،گلاب ہی رہے گا''۔

دنیا کی دوسری مہذب قومیں بھی اس سلسلے میں وقت ضائع نہیں کرتیں۔ شاہانِ انگلشیہ بھی اس مسئلے میں کسی تردد میں نہیں پڑتے تھے، بڑے مزے سے ہنری اول ،دوم، سوم۔۔۔۔ اور جارج اول، دوم، سوم وغیرہ جیسے نام رکھتے چلے جاتے تھے۔ وہاں سکولوں میں ٹیچر جب کسی بچے سے اسکے والدین کا نام پوچھتی ہے تو وہ بڑے آرام سے جواب دیتا ہے کہ اسکے والدین کا نام'' پاپا اور ماما'' ہے۔ اسی طرح ایک اور بچے نے مشہور ''ڈم وارسٹار'' کا نام'' مکی ماؤس'' بتایا تھا۔ ہمارے یہاں بھی بعض بچوں کو اپنا اصل نام اسکول جا کر معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً کچی جماعت کے ایک بچے سے، جسے گھر والے پیار سے''منا'' کہتے تھے، سکول سے واپسی پر پوچھا گیا کہ اس نے سکول میں اپنا پہلا دن کیسے گزارا اور کیا سیکھا؟ تو بچے نے منہ بناتے ہوئے جواب دیا: ''مجھے تو آج پتہ چلا ہے کہ میرا اصل نام'' منا'' نہیں، مہتاب ہے''۔ ایک دوسرا بچہ، جسے اس کی ماما'' جان'' اور پاپا'' بلائے جان'' پکارتے تھے، ٹیچر کے نام پوچھنے پر بولا ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میں ''جان'' ہوں یا ''بلائے جان''۔

ان وضاحتوں کے بعد ہم امید کرتے ہیں کہ ہمیں فون کر کر کے جواب طلبی کرنے والے مطمئن ہوگئے ہونگے کہ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ یہ ایک بے گھر والدین کی معصومیت تھی کہ انہوں نے اپنے بچوں کے نام صوفی محمد اور فضل اللہ رکھ کر اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ بڑے ہوکر یہ دونوں اپنے آبائی علاقوں کی ترقی و خوشحالی اور امن و آشتی کے لئے کام کریں گے۔ اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ ان میں بڑا، صوفی محمد تو کمال بردباری سے ابھی تک صبر و سکون کا مظاہرہ کر رہا ہے مگر ننھا فضل اللہ ضبط نہیں کر پا رہا اور زیادہ تر وقت چیخ چیخ کر دوسروں کو متوجہ کرنے میں گزار رہا ہے۔ تاہم ہمیں امید ہے کہ یہ دونوں بڑے ہوکر ضرور اپنے والدین کو خوابوں کی تعبیر بنیں گے۔

نورم خان (نور محمد خان) کا تعلق کراچی سے ہے۔ طنز و مزاح ان کا میدان ہے۔ نثرِ لطیف میں نہایت شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ اخبارات میں طویل عرصہ سے نہایت دلجمعی کے ساتھ مضامین اور کالم نگاری کے ''مرتکب'' ہو رہے ہیں۔ فیس بک پر طنز و مزاح پر مبنی ایک گروپ کے منتظمِ اعلیٰ بھی ہیں۔ برقی مجلّے ''ارمغانِ ابتسام'' میں خاصی مستقل مزاجی سے لکھ رہے ہیں۔

"السلام علیکم" ---میں نے پہلی بیل پر موبائل فون آن کیا تو کوئی بولا ---

"وعلیکم السلام!"

میں نے جواب دیا تو بے تکلف ہوتے ہوئے فرمانے لگے "لگتا ہے سو رہے تھے؟"

مجھے حیرت ہوئی، میں نے حیرت کو قابو میں کیا اور عرض کی "حضور آپ کی پہلی بیل پر میں نے موبائل آن کر لیا اور آپ کے سلام کا جواب سانس لیے بغیر دے دیا۔"

" اچھا ٹھیک ہے آپ جب دل چاہیں سوئیں ---جاگیں---دوستوں کو کبھی کبھار فون ضرور کر لیا کریں۔"

وہ بولے اور فون بند ہو گیا تھا۔ شاید بات کرتے کرتے سو گئے تھے؟ ملتان سے یہ کال تھی، جب بھی فون آیا فرماتے ہیں "سو رہے ہو؟"

"ہیلو"---"ہیلو"---"ہیلو"---پہلی بیل کے بعد میں نے فون آن کیا تو دوسری طرف سے کسی نے تین بار زور زور سے ہیلو کیا۔ اگر میں کانوں سے بہرہ بھی ہوتا تو کہہ ڈالتا "میاں آہستہ بولو---کان مت کھاؤ۔"

"افضل"---"افضل"---"افضل" پھر تین بار بولے۔

"جی ہاں"---"جی ہاں"---"جی ہاں" میں نے پہچان لیا۔ میری اس وضاحت کا نوٹس لیے بغیر پھر گرجے "لگتا ہے کھانا کھا رہے تھے---کھانا---کھانا---"

"حضور میں کھانا کھا رہا تھا یا آپ؟" میں نے وضاحت چاہی تو بولے "گرمیوں میں تیتر بٹیر مت کھانا، عقل ماری جاتی ہے"

"آپ نے اب کھانے چھوڑ دیے ہیں یا نہیں؟" یہ پہلی بات تھی جو انہیں سمجھ آ گئی، جس پر انھوں نے خوشی کا اظہار اس طرح کیا "ہاہا---ہاہا---ہاہا---چھوڑ چکا---چھوڑ چکا---چھوڑ چکا---"

یہ افضل صاحب گوجرانوالہ میں رہتے ہیں۔ لکھاری ہیں لیکن گھر داری کے لیے مٹھائی کا کام کرتے ہیں۔ مٹھائی کھانے کا نہیں مٹھائی تیار کرنے کا۔ تیس سال کے ہیں اور بتانے والی بات یہ کہ اٹھائیس سال سے شوگر کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کسی کو بتاتے نہیں، مبادا کوئی مٹھائی اور دوائی اکٹھی کھانے سے روک دے۔ ویسے آپ کوشش نہ کریں بات کبھی نہیں مانتے۔ کسی کی بھی نہیں---کہتے ہیں مزاح نگار ہیں مگر میں نے کبھی انھیں ہنستے نہیں دیکھا (حالانکہ عطاء الحق قاسمی صاحب فرماتے ہیں کہ "جس

کے چہرے پر ہنسی نہیں، گفتگو میں قہقہہ نہیں وہ مزاح نگار کیسے ہوسکتا ہے) جنازوں میں شریک نہیں ہوتے کہتے ہیں ہنسی آجاتی ہے کہ جب میرا جنازہ اٹھے گا تو بڑے بھائی جان کی شامت آجائے گی کیونکہ میں نے چالیس پچاس لوگوں سے ادھار لے رکھا ہے اور اگر بھائی جان نے غلطی سے جنازہ اٹھنے سے پہلے پوچھ لیا کہ افضل مزاح نگار نے کسی سے ادھار لیا ہو تو میں حاضر ہوں اور پھر بھائی جان کو لوگ ''غائب'' کر دیں گے۔ بھائی جان جانیں، لوگ جانیں۔۔۔''وہ تو فرشتوں سے گفتگو میں محو ہوں گے۔''

''ٹرن ٹرن''۔۔۔فون بند۔

یہ مس کال تھی۔۔۔پھر ''ٹرن ٹرن''۔۔۔پھر فون بند

پھر ''ٹرن''۔۔۔ پھر مس کال تھی۔۔۔ پھر صرف ''ٹر'' ۔۔۔پھر کچھ وقفے کے بعد ''ٹر''۔۔۔کیا پریکٹس ہے مس کال دینے کی۔۔۔ٹرن ٹرن کی بجائے صرف ''ٹر''۔۔۔''ٹر''۔۔۔یہ آپ غلط فہمی کا شکار نہ ہوں مینڈک کا فون نہیں ہے۔۔۔یہ فیصل آباد سے ہمارے دوست ہیں شیخ اصغر ندیم آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ یہ تین ٹیکسٹائل ملز کے مالک ہیں، مجھے نہیں یاد کبھی انہوں نے پوری کال کی ہو۔ ہمیشہ مس کال دیتے ہیں اور اگر دو منٹ کے اندر اندر جواب میں آدھ گھنٹے کی کال نہ کروں تو بہت ناراض ہوتے ہیں اور رات وقفے وقفے سے ''ٹر''۔۔۔''ٹر'' سے مجھے سونے نہیں دیتے۔ میں جب کال کرتا ہوں تو سلام دعا نہیں کرتے، سیدھا پوچھتے ہیں ''بارش تو نہیں ہو رہی لاہور میں؟''

''کیوں شیخ صاحب؟''

''یار بارش ہوگی تو سردی جلد آنے کا اندیشہ ہوگا اور سردی جلد آگئی تو میری فیکٹری کی بنی لون کون خریدے گا؟''

شیخ صاحب چاہتے ہیں بارہ مہینے موسم گرم رہے اور ان کی فیکٹری کی بنائی لان سدا بکتی رہے۔ پورے خطے کا موسم بدل ڈالنے کا ارادہ ہے موصوف کا۔۔۔گرمی ہی گرمی سارا سال گرمی، حالانکہ پاکستان میں ''الیکشن'' کی گرمی بھی جون جولائی میں عوام کو

ہوا یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست اس کتاب کا ایک باب ''ہلال'' میں پڑھ رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ پڑھنے کے دوران آپ ایک دو مرتبہ مسکرا دیئے۔ اس معمولی سے واقعہ سے ہم نے نیوٹن کی طرح ایک اہم نتیجہ نکالا اور وہ یہ کہ اگر یہی کیفیت ہر قاری پر گزرے تو علم ریاضی کی رو سے لازم آتا ہے کہ ملک میں مسکراہٹوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور مسکراہٹوں کا جو توڑا ہمارے ملک میں ہے اس کا تو آپ کو علم ہی ہوگا۔ بیورلی نکلز (Beverly Nichols) نے اپنی کتاب Verdiction India میں لکھا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں فی مربع میل ناخوشی دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے' چنانچہ سوچتا ہوں کہ اگر اکثر خواتین و حضرات کی توجہ دوسرے مشاغل سے ہماری کتاب کی طرف بٹ جائے تو نہ صرف فی مربع میل ناخوشی میں کمی کا امکان ہے' بلکہ شاید فی مربع میل آبادی بھی گھٹنے لگے۔ بہر حال آبادی بڑھے یا گھٹے' کتاب کا پیغام ضرور ہے اور یہ وہی مشہور پیغام ہے جو ایک عارف افیونی نے ایک عارف افیونی کو صرف چار لفظوں میں دیا تھا۔ دونوں دوست ترنگ میں جا رہے تھے کہ کم عارف افیونی کنوئیں میں لڑھک گیا۔ عارف نے دوست کو غائب پایا تو چلایا۔

''کہاں ہو دوست؟''

کنوئیں سے فریاد اٹھی۔ ''یہاں ہوں۔''

عارف نے فی البدیہہ پیغام دیا۔ ''اچھا دوست' جہاں رہو خوش رہو۔'' اور آگے چل نکلا۔

بجنگ آمد از کرنل محمد خان

"آنکھیں دکھا" رہی ہے۔

"ٹوووں"۔۔۔"ٹوووں"۔۔۔"ٹوووں"۔۔۔ یہ جانی پہچانی کال ہے کراچی سے بھائی نورم خان کی "ٹوووں" ۔۔۔"ٹوووں"

میں موبائل آن کرتے ہی بول پڑتا ہوں "ہاں جی بھائی نورم خان ۔۔۔ضرور ضرور اخبار آ گیا ہے۔۔۔ مجھے یاد ہے۔۔۔ خبریں پڑھنے سے پہلے آپ کا ابھی کالم پڑھتا ہوں۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔رائے بھی دوں گا۔۔۔تنقید بھی کروں گا۔"

حالانکہ مجھے نہیں یاد میں نے کبھی نورم خان کے کالم پر تنقید کی ہو۔ایک بار کی تھی انھوں نے ایک ایک نکتے پر تنقید کی وجہ پوچھی، تفصیل مانگی اور تقریباً ایک گھنٹہ بات کی کال میری طرف سے تھی۔اتنے وقت میں بندہ پورے کا پورا مشتاق احمد یوسفی یا ابن انشاء پڑھ لیتا ہے۔

"غررر"۔۔۔"غررر" یہ عجیب سی بیل ہے لیکن یہ بھی جانی پہچانی ہے۔

"غررر"۔۔۔"غررر"۔۔۔"غررر"

"یار مظفر، وہ کل پھر منی بس میں سفر کر رہا تھا کہ میرا فون گن پوائنٹ پر پھر کسی نے چھین لیا" یہ ہمارے کراچی والے صحافی دوست شوکت علی مظفر ہیں۔

"شوکت علی مظفر بھائی گھبراؤ مت، مجھے پتہ ہے آپ نے اب کے سات سو روپے کا خریدا تھا۔۔۔ چور بے چارہ ستر روپے میں بیچ پائے گا۔"

شوکت بھائی کی کال ہو اور دردبھری خبروں کے علاوہ کچھ اور ہو۔۔۔ممکن نہیں۔۔۔ پھر بیل پہ بیل۔۔۔ دسویں بیل پر اٹھایا ۔۔۔پھر بند۔

پھر میں نے خود کال کی "اپنا ہیلو"

"اپنا مظفر بھائی بول رہا ہے" ۔۔۔"اپنا کیہ حال اے؟"۔۔۔"پتہ چلا ہے۔۔۔اپنا۔۔۔خدا بخش خوشاب والے کے ساتھ پھر فراڈ ہو گیا ہے"۔۔۔"ہور سن ...... اپنا ہمارے محلے میں کراچی کی صابری نہاری والوں کی۔۔۔اپنا۔۔۔سنا ہے برانچ

برہان پور، بھارت کے ایک شاعر مشاعرے میں بے تحاشہ داد و تحسین کے شور میں اپنی نظم سنا رہے تھے۔اس پر سمیلن اندپور نے فقرہ کسا "بہت اچھے، آخر تم پٹھے تو میرے ہی ہوناں!"

اس پر شاعر نے مائک پر جواب دیا "افوہ، یہ راز مجھ پر اب کھلا کہ لوگ مجھے اُلو کا پٹھا کیوں کہتے ہیں۔"

کھل رہی ہے"۔۔۔"اپنا۔۔۔میری بلی نے پھر بچے دیئے ہیں ۔۔۔اپنا۔۔۔دس ہزار روپے ادھار چاہیے اپنا۔۔۔بجلی کا بل دینا ہے اپنا۔۔۔اپنا السلام علیکم اپنا" (مجھے گلا ہے شوکت سے کہ انہوں نے مجھے نہ کراچی بلایا نہ مشتاق احمد یوسفی سے اب کے ملوایا اور وہ بیچارے فوت بھی ہو گئے حالانکہ سید بدر سعید سمیت ہم نے "پینل" انٹرویو کرنا تھا مشتاق احمد یوسفی صاحب کا، بہرحال ایک مزاح نگار کی وفات پر زیادہ سنجیدہ ہونا)؟

فون میں نے کیا ہے، مجھے بولنے نہیں دیا گیا۔

"اپنا اپنا۔۔۔میں۔۔۔میں" اپنی سنائی اور فون بند۔

اس دوران میں بھی بھول گیا کہ۔۔۔ اپنا۔۔۔ میں نے بھائی چوہدری امجد گجر کو کیوں فون کیا تھا" یہ لاہور سے لاہور کی جانے والی کال کا تذکرہ تھا۔

"ٹاں"۔۔۔"ٹاں"۔۔۔"ٹاں" یہ پشاور سے ملک گلاب خان کی کال تھی۔

"ہیلو" یار بھول گیا۔۔۔کیا کہنا تھا مظفر بھائی۔۔۔ وہ کتاب آپ نے پھر نہیں بھیجا؟"

گلاب خان! میں نے برادر بکسٹال والوں کو آرڈر کے مطابق دس کاپیاں بھیجا ہے!"

"اوہو۔۔۔تم نے نیو برادر والوں کو بھیجا ہو گا۔۔۔ میں خالی برادر پہ چلا گیا تھا۔۔۔ ابھی گیا۔۔۔اور ہاں سن وہ طالبان کے خلاف زیادہ نہ لکھا کرو۔۔۔ادھر تمہاری کتابیں بیچنے والوں کی دوکان اڑا دیں گے وہ ظالم بارود سے!!"

خوفناک پیغام دیا اور کال بند۔۔۔گلاب خان گیا۔

منڈی ڈھاباں سنگھ ایک جگہ ہے وہاں سے ایک کالج کا

طالب علم شہر یار بارود گلی والا مجھے اکثر فون کرتا ہے۔ اس کا فون اکثر اس وقت آتا ہے جب میں کھانا کھا رہا ہوتا ہوں یا ''واش روم'' میں ہوتا ہوں۔

''سر جی مجھے شاعری میں اپنا شاگرد بنا لیں۔'' اس بے چارے کو کیا پتہ کہ میں نے خود اخبار میں اشتہار دے رکھا ہے کہ شاعری کی اصلاح کے لیے ایک عدد استادِ محترم کی تلاش ہے۔

''شہر یار یہ تم نام کے ساتھ بارود والی گلی کیوں لکھتے ہو؟ کہیں یار، تمہارا تخلص تو نہیں؟؟؟''

ہمارے ایک دوست ہیں بابر عباس خان ماڑی باڈی والے۔ اُن کا پورا نام لیں تو گھبرا جاتے ہیں ایسے ہی۔۔۔ مجھے یہاں جھانپڑ دشمن آبادی یاد آ گئے۔ ان کی ایک غزل دیکھیے۔

کیا بتاؤں جب سے وہ مجھ کو ملی چکر میں ہے
پہلی تو چکر میں تھی اب دوسری چکر میں ہے
رُوبرو ہے وہ مرے اور گھورتی ہے وہ مجھے
اب غزل میں کیا سناؤں، کھوپڑی چکر میں ہے
اس کے باوا نے لگا رکھے ہیں پہرے رات دن
دل لگی دل کی لگی جب سے ہوئی چکر میں ہے
ایک دھوبن سے مری جب سے ملاقاتیں ہوئیں
دیکھ کر کپڑے نئے بیگم مری چکر میں ہے

ایک فون کوئٹہ سے میرے بھانجے علی کا آتا ہے۔ نہ سلام نہ دعا۔

''ماموں۔۔۔ آپ حج پر کب جا رہے ہیں، میرے لیے وہاں سے آب زم زم بہت سا لیتے آنا۔۔۔ یہ جو ابلا پانی مجھے ماما پلاتی ہے، یہ کڑوا لگتا ہے۔۔۔ خدا حافظ!''

اس کال کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟ اللہ ہی جانتا ہے۔ ایسی باتیں سمجھنے سے بہتر ہے بندہ بس خوش ہو۔۔۔ جیسا کہ ''ایک صاحب پینٹر کو گھر لائے اور شام کو دفتر سے گھر آئے تو پینٹر نے اپنی مہارت سے پینٹ کر کے گھر کی حالت ہی بدل ڈالی تھی۔۔۔ وہ صاحب خوش ہوئے اور طے شدہ اُجرت کے علاوہ پانچ سو روپے انعام دیے اور دیتے ہوئے کہا ''آج رات بیگم کے ساتھ فلم دیکھنے چلے جانا'' پینٹر دعائیں دیتا چلا گیا۔ رات کو گھر کے باہر کسی نے دستک دی۔ اُن صاحب نے دروازہ کھولا، سامنے پینٹر کھڑا تھا

''کیا بات ہے، کوئی چیز بھول گئے ہو؟'' اُن صاحب نے پوچھا۔

''جی نہیں'' پینٹر نے جواب دیا ''میں تو بیگم صاحبہ کو سینما لے جانے کے لیے آیا ہوں۔''

موبائل فون غلط فہمیاں پیدا کرتا ہے، ضرورت بھی پوری کرتا ہے، بڑے بڑے مشکل مرحلوں میں کام بھی آتا ہے۔ نیند کی خرابی کا باعث بنتا ہے، اچھے اچھے میسج پڑھنے کو دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ گوجرانوالہ سے فون آئے گا تو بات کھانوں کی ہوگی، کھابوں کی ہو گی، نان کی ہوگی، کبابوں کی ہوگی، پیٹ کی بیماریوں یعنی نت نئے عذاب کی ہوگی۔ ملتان سے فون آئے گا نیند کی بات ہوگی، سونے کا ذکر ہوگا اور گرمی کے تذکرے ہوں گے۔ لاہور سے فون آئے گا فراڈ کا ذکر ہوگا، چوری ڈاکہ کی خبر ہوگی اور لمبی بات ہوگی۔۔۔ بے مقصد۔۔۔ گویا ہر شہر ہر قصبے کے اپنے اپنے رسم و رواج طور اطوار ہیں۔ یہی حال مختلف ممالک کا ہے۔ ہم پاکستان میں بیٹھ کر انگلینڈ، امریکہ، جرمنی، فرانس کے بارے میں کچھ خواب دیکھتے ہیں، وہاں جا کر پتہ چلتا ہے کہ واقعی یہ سب خواب ہی تھا۔

حافظ مظفر محسن صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے ان کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آ رہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں ان کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں ''طنز و مزاح'' کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری ان کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

قندِ شیریں

خمارِ گندم

ساجدہ غلام محمد

"یہ گورے روٹی یا چاول نہیں کھاتے، توان کا پیٹ کیسے بھرتا ہے؟ یہ کھاتے کیا ہیں؟" دماغ نے سوال اٹھایا۔

"وہی کھاتے ہیں جوان کا دل کرتا ہے۔" دل نے جواب دیا تھا۔

"لیکن پھر بھی۔۔۔" دماغ سوچ میں پڑ گیا اور سوچ میں تو ہم بھی جب سے انگلینڈ آئے ہیں، ڈوبے ہوئے ہیں کہ یہ گورے اپنا پیٹ کیسے بھرتے ہیں! ہمیں تو جب تک دوپہر یا رات کے کھانے میں روٹی یا چاول نہ ملیں، ہمارا گزارا نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی تو ناشتے میں بھی ڈبل روٹی کی بجائے پراٹھا کھائیں تو حوصلہ ہوتا ہے کہ ہاں، آج کچھ کھایا ہے۔ اور یہ گورے! ایک پیالہ کارن فلیکس دودھ کے ساتھ اور ساتھ میں چائے یا کافی اور بس، ان کا ناشتہ ہو گیا۔ یا پھر گوروں کی ایک اور پسندیدہ چیز ہے، پین کیک، جسے یہ بڑے اہتمام کے ساتھ بناتے اور کھاتے ہیں۔ ہمارے میاں کو ایک دن شوق چڑھا پین کیک کھانے کا، سو ہم سے فرمائش کر ڈالی۔ ہم نے نیٹ سے ترکیب ڈھونڈ کے پانچ چھ پین کیک بنائے اور میاں کے آگے رکھ دیے۔

"اِسے کھانا کیسے ہے؟" میاں نے سوال کیا تھا۔ جناب یقین مانیں، یہ سوال نہایت اہم اور سنجیدہ تھا۔

"پتا نہیں۔ نیٹ پہ تو جو تصویر تھی، اس میں اس کے اوپر کیلے اور سٹرابری رکھی تھی، اور ساتھ میں چاکلیٹ ساس۔" میاں نے کوشش کی، ایک پین کیک پہ کیلے کے ٹکڑے اور تھوڑی سی کریم ڈالی۔

"اب؟"

"اب کیا؟"

"اب کیسے کھاؤں؟ میرا مطلب ہے کہ رول کر کے کھاؤں، روٹی کی طرح لقمے توڑ کے یا کانٹے چھری سے؟" یہ سوال بھی معقول تھا!

"رول کر کے کھالیں۔ نہ اچھا لگے تو باقی پین کیک کسی اور طریقے سے۔" ہمارا مشورہ مانا گیا لیکن پہلا لقمہ لیتے ہی ان کے چہرے کے جو تاثرات تھے، اس پہ ہماری ہنسی نکل گئی۔

"اچھا لگ رہا ہے۔" زبردستی کی مسکراہٹ کے ساتھ میاں نے زبردستی لقمہ نگلا۔ اگلے پین کیک پہ چھری کانٹے سے زور آزمائی کی گئی لیکن وہ بھی کامیاب نہیں ہو سکی۔ آخر تنگ آ کر انہوں

نے ہماری پلیٹ سے تھوڑا سا آملیٹ اٹھایا اور اسے اپنے پین کیک کے ساتھ روٹی کی طرح کھایا۔ تو جناب ثابت ہوا کہ ہم ایشیائی لوگوں کے اندر خون نہیں بلکہ گندم روٹی کی شکل میں گھومتی ہے!

انگلینڈ آنے کے بعد سب سے بڑا cultural shock بھی کھانے سے متعلق ہی تھا۔ ہم کہیں گھومنے گئے تو وہاں ایک جگہ مینو کارڈ پہ لکھا تھا، corn on the cob یعنی آسان الفاظ میں، ''ہمارے ہاں چھلیاں (بھٹے) دستیاب ہیں۔''

ہمارے تو منہ میں پانی آ گیا، تصور میں وہ چھلیاں گھوم گئیں جو پاکستان میں ہماری یونیورسٹی کے گیٹ پہ پٹھان بھائی بیچا کرتے تھے، خوب چٹ پٹی سی ابلی ہوئی۔ میاں ہمارے بے حد اصرار پہ دو چھلیاں لے آئے۔

''یہ کیا؟؟ یہ تو پھیکی ہیں!'' پہلے لقمے پہ ہی ہم پہ انکشاف ہوا۔

''او ہاں، یہ دو پڑیاں بھی ساتھ میں دی تھیں نمک اور کالی مرچ کی۔'' میاں جی نے دو ننھی منی سی پڑیاں ہمارے حوالے کیں۔ ہم جو پہلے ہی صدمے سے دوچار تھے، مزید دکھ میں گھر گئے۔

''وہ مرچ مسالہ، وہ لیموں کا ٹکڑا۔۔۔'' ہم بس یہی کہہ سکے۔

''محترمہ، یہ انگلینڈ ہے۔ یہاں ایسی ہی چھلیاں ملتی ہیں۔'' یہ صدمہ ہمارے لیے ٹھیک ٹھاک بڑا تھا۔ اس دن سے ہم تو پاکستانی چھلیوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ جب پاکستان جانا ہوتا ہے تب وہاں چھلیوں کی فصل کٹ کے سوکھ چکی ہوتی ہے۔ اور یہاں کی چھلیاں ہمارے ذوق اور معیار کی نہیں۔ اب تو یہی حال ہے

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ ''چھلیاں'' کیے ہوئے

کھانے پہ بات شروع ہو ہی گئی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ یہاں یعنی مغرب میں گرم مصالحوں کی بڑی دھوم ہے۔ غالباً انہی گرم مصالحوں کی خوشبو انگریزوں کو برصغیر کی طرف کشاں کشاں کھینچ لائی تھی اور وہ ایسے دیوانے کہ برصغیر کے ہی ہو بیٹھے۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے قائداعظم اور دوسرے رہنماؤں کا کہ ان گوروں کو چلتا کیا۔ اور اب یہ حال ہے کہ ان کا بس نہیں چلتا کہ سب چیزوں میں پسی دار چینی، پسا ہوا ادرک ڈال دیں۔ ایک دفعہ ہمیں ادرک والے بسکٹ biscuitsginger کھانے کا اتفاق ہوا اور وہ بس پہلا اور آخری ہی اتفاق تھا۔ اس کے بعد دوبارہ کبھی ان بسکٹس کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بھئی ہم اپنے دیسی کھانوں میں خوب ادرک ڈال لیتے ہیں اس لیے ہم ایسے ہی بھلے۔

ہمیں پچھلے سال ایک دن کے لیے ہسپتال داخل ہونا پڑا۔ دوپہر کے ٹائم ایک نرس نے آ کر مینیو کارڈ دیا کہ جو کھانا ہے، اس پہ نشان لگا دیں۔ ہم نے کارڈ پہ نظر دوڑائی۔ سب حلال تھا۔ ''واؤ، چکن قورمہ۔'' ہم نے اس کے اور چنے کی دال کے آگے نشان لگا دیا۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون مجھے ایک ٹرے دے کے چلی گئیں۔ بڑے شوق سے چکن چاولوں پہ ڈال کے چکھا اور سارے ارمانوں پہ اوس پڑ گئی۔ پتا نہیں وہ کیا، کون سا، کہاں کا، اور کس طرف سے چکن قورمہ تھا، کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آج بھی جب گوروں کے سپر سٹورز میں کسی ولایتی کمپنی کے 'چکن قورمہ' پیسٹ کے ڈبے دیکھتے ہیں تو ان بے چاروں کے حسِ ذائقہ پہ افسوس، ہنسی اور تعجب ہوتا ہے۔ 'بندر کیا جانے ادرک کا سواد' کے مصداق یہ ولایتی لوگ کیا جانیں اصل قورمے کا مزا۔

تو جناب، بات گھوم کے پھر وہیں پہ آ ٹھہری جہاں سے شروع کی تھی کہ ان لوگوں کا روٹی چاول کھائے بغیر پیٹ کیسے بھرتا ہے۔ ہمارا دماغ بھی سوچ رہا ہے، ذرا اپنے دماغوں کو بھی اس کام پہ لگا لیں!

ساجدہ غلام محمد کا تعلق پاکستان سے ہے لیکن کئی برسوں سے انگلستان میں مقیم ہیں۔ کہانیاں لکھنے میں کمال رکھتی ہیں۔ بچوں کے ادب سے خاصا لگاؤ ہے۔ اندازِ تحریر نہایت جاندار اور شگفتہ ہے۔ اپنے انگلینڈ میں موجود واقعات کو نہایت چلبلے اور بیساختہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی خصوصی کرم فرما ہیں۔

حنیف عابد

منشی منقیٰ کا فنِ خوش خوراکی

اللہ بھلا کرے ہمارے ہمسائے کا۔ موسم کوئی بھی ہو وہ تقریب کا بہانہ ضرور نکال لیتے ہیں۔ ہمارے تعلقات اپنے ہمسائے کے ساتھ ویسے تو بھلے ہیں لیکن اندر ہی اندر کہیں کوئی چیز ایسی ہے جو انہیں ہم سے شاکی رکھتی ہے۔ وہ کوئی بھی موقع لفظی چوٹ لگانے کا جانے نہیں دیتے۔ ابھی پچھلے دنوں رمضان میں احباب سے ملاقات کے لئے موصوف نے ''افطار پارٹی'' کا منصوبہ بنایا۔ گلی محلے کے جو دوست تھے انہیں تو مدعو کیا ہی تاہم اپنے بچپن کے کچھ دوستوں کو بھی دعوت دے ڈالی ۔جس دن دعوت افطار تھی اس دن دوپہر سے ہی انتظامات شروع کر دیے گئے ۔گلی میں شامیانہ لگایا گیا، قناتوں سے شامیانے کو ڈھک کر اندر سلیقے سے ٹیبل اور کرسیاں جمائی گئیں ۔بہترین بوفے لگایا گیا، ساتھ ہی ٹھنڈے شربت اور ٹھنڈے پانی کی ٹیبل بھی لگائی گئی۔ ہم نے حق ہمسائیگی نبھاتے ہوئے دن میں دو مرتبہ ان سے دریافت کیا کہ ہمارے لائق کوئی خدمت ہو تو انہوں نے شکریہ کے ساتھ ہماری خدمات لینے سے معذرت کر لی ۔معلوم نہیں اس کے پیچھے کیا وجہ پوشیدہ تھی؟ ہم سے پھر بھی نہیں رہا گیا اور ہم عصر کی نماز ادا کرتے ہی دعوت میں شرکت کے لئے پہنچ گئے ۔ہمیں دیکھتے ہی ہمارے ہمسائے نے اپنی جیب سے موبائل

نکالا اور اس کی اسکرین ایسے دیکھنے لگے جیسے کسی مس کال کو چیک کر رہے ہوں، پھر ہماری طرف دیکھتے ہوئے ہلکا سا مسکرائے اور رسمی طور پر ہمارا استقبال کیا۔

ہمارے اس استفسار پر کہ ابھی مہمان نہیں آئے انہوں نے بر جستہ کہا کہ "مہمانوں کو مغرب کا وقت دیا ہے" پھر ایک زوردار قہقہہ لگا کر بولے "آپ تو میزبان ہو اس لئے جلدی آگئے ہو ناں!"

ہم بھی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے بولے "ارے یار یہ بھی کہنے کی بات ہے کیا؟ ہمسایا ماں جایا ہی ہوتا ہے۔"

اس بات پر انہوں نے ترپ کا اِکا لگا دیا کہ "شکر ہے ماں جایا ہوتا ہے، اگر باپ جایا ہوتا تو وراثت میں بھی حق دار ہو جاتا۔"

اُن کے اس غیر متوقع حملے سے ہم کچھ حواس باختہ سے ہو گئے۔ ابھی ہم ان کے طنز کی شدت سے تلملا ہی رہے تھے کہ ہمارے ایک مشترکہ دوست وارد ہو گئے جس کی وجہ سے وہ ان کی طرف متوجہ ہوئے تو ہمیں اپنی سبکی سہنے کا موقع مل گیا۔

مغرب سے نصف گھنٹہ قبل تک اچھی خاصی تعداد میں مہمان آگئے۔ روزہ کھلنے سے قبل تمام لوازمات مہمانوں کی تواضع کے لئے لگا دیے گئے۔ اُدھر اذان ہوئی اور مہمان افطار پر ٹوٹ پڑے۔ جلدی جلدی سموسے، پکوڑے، چھولے کی چاٹ، دہی بڑے، فروٹ چاٹ، چکن رول اور دیگر اشیاء پلیٹوں کی زینت بن گئیں۔ سخت گرمی کی وجہ سے ہر شخص نے اپنے ساتھ ایک گلاس دودھ والے شربت اور ایک گلاس سادے شربت کا رکھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے کھانے کی اشیاء معدے میں اترتیں ویسے ویسے شربت اور پانی کی سپلائی جاری رکھی جا رہی تھی، یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کھانا منہ سے حلق تک بمشکل پہنچایا جا رہا تھا اس کے بعد شربت کا ریلا اسے بہا کر پیٹ میں لے جا رہا تھا۔ بیس منٹ کے بعد جب نماز کا اعلان کیا گیا تو آدھے مہمان تو اس حالت میں تھے کہ ان سے اٹھنا محال ہو رہا تھا چند افراد مسجد میں نماز پڑھنے کا کہہ کر چلے گئے، بعض نے گھر جا کر نماز پڑھنے کو ترجیح دی۔ کچھ دیر کی گپ شپ کے بعد کھانا لگانے کا جب کہا گیا تو بعض احباب نے کہا کہ گنجائش نہیں ہے۔ بہر حال کھانا لگایا گیا جو نہایت پر تکلف تھا۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اپنی جگہ لیکن پیٹ کا دائرہ اس حد تک پھیل چکا تھا کہ مزید اس کے حدود اربع میں توسیع کی گنجائش باقی نہیں بچی تھی۔ چند بلا کے خوش خوراک افراد کے علاوہ تمام مہمانوں نے کھانا رسماً چکھا، حیرت اُن پر ہوئی جنہوں نے اس کھانے کے ساتھ بھی ڈٹ کر انصاف کیا۔ ان کے پیٹ شیطان کی آنت کی مانند معلوم ہو رہے تھے۔ ہم بوجھل معدے کے ساتھ رخصت لے کر گھر آگئے اور اس پر تکلف افطار کے نتیجے میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہونے کی ہمت خود میں نا پاتے ہوئے آرام کو ترجیح دینے لگے۔

اگلے دن چھٹی تھی سحری کر کے نماز پڑھی اور پھر سو گئے۔ دوپہر میں ہمارے دوست منشی متقی تشریف لائے تو ڈرائنگ روم میں ہمارے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ طبیعت میں کسلمندی ہے، فوراً بھانپ کر بولے "میاں! کہیں دعوت میں بے تکے انداز سے معدہ شکنی کے مرتکب معلوم ہوتے

ہمارے ایک دوست جو درمیانے درجے کے سرکاری افسر ہیں بن بلائے مہمانوں کو ٹالنے کے ایک فول پروف طریقے پر عمل پیرا ہیں۔ جب ان کا کوئی ملاقاتی آ کر جانے کا نام نہیں لیتا تو وہ اپنے نائب صدر کو بلا کر کہتے ہیں "ریسرچ کا فائل لے آؤ۔" تربیت یافتہ نائب قاصد آفس سپرنٹنڈنٹ کو جا کر بتاتا ہے کہ کوئی "چیکو" صاحب کی جان کو آئے ہوئے ہیں۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً اپنے افسر کے کمرے میں آ کر کہتے ہیں "سر، آپ کو بڑے صاحب نے سلام کہا ہے۔" یہ سن کر ہمارے دوست ایک ہاتھ میں فائل سنبھال کر اٹھ کھڑے ہونے کا تاثر دیتے ہیں جسے دیکھتے ہیں "چیکو" مجبوراً کہتے ہیں "اچھا تو میں اب چلتا ہوں۔" افسر کو سیٹ پر سے پوری طرح اٹھنے یا باہر نکلنے کی نوبت نہیں آتی۔ لیکن بقول ان کے کوئی کوئی ایسا سخت جان ثابت ہوتا ہے کہ بگ باس کے کمرے تک ان کے ساتھ باتیں کرتا ہوا جاتا ہے اور وہ کمرے کے باہر اس سے پیچھا چھڑا کر واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھتے ہیں۔

پہاڑ تلے از ایس ایم معین قریشی

ہو؟''

اُن کے منہ سے یہ سن کر ہم چونک گئے، ہم نے برملا پوچھا ''یار آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

بولے''میاں رمضان میں دعوت کھانا ایک فن ہے اس سے تمہارے جیسے چغد تو بالکل ہی نا آشنا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کھانے پر بھوکوں کی طرح ٹوٹتے ہیں اور پیٹ کا ستیاناس مار لیتے ہیں۔ پھر دو دن تک بوجھل طبعیت کے ساتھ پڑے رہتے ہیں۔''

منشی متقی کی بات سن کر ہماری تجسس کی رگ پھڑ کنے لگی ہم نے کہا ''یار منشی ہمیں بھی اس فن کی سوجھ بوجھ عطا کرو، معلوم ہوتا ہے تم تو اس فن میں طاق ہو۔''

منشی ہماری بات سن کر ہنستے ہوئے، بولے''میں میاں یہ فن بڑی ریاضت کے بعد حاصل کیا ہے، اِتنی آسانی سے تو ہم اسے تمہاری جھولی میں ڈالنے سے سے رہے۔''

ہم نے لجلجاتے ہوئے منشی جی کو خوشامدانہ انداز میں رام کرنے کی کوشش کی تو موصوف نے فوراً گفتگو کو رخ بدلتے ہوئے کہا''ارے تم نے سنا ہے کہ نگراں وزیر اعظم کا نام فائنل ہو گیا ہے بھی یہ مشکل حل ہونے سے وقت پر انتخابات کی راہ ہموار ہو گئی ہے۔''

ہم نے ہونقوں کی طرح منشی جی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ''منشی جی یہ بیچ میں نگراں حکومت کا قضیہ کہاں سے آ گیا آپ تو ہمیں افطار کرنے کے فن سے آشنا کروانے جا رہے تھے۔''

منشی جی کہا ''ارے میں یہ سب کچھ اتنی آسانی سے نہیں ہو جاتا۔ اس کے لئے آپ کو ہماری دو چار دعوتیں کرنی پڑیں گی ہم جب آپ کے سامنے افطار اور کھانے سے بیک وقت مستفید ہونے کا عملی مظاہرہ پیش کریں گے تب آپ کی عقل سلیم میں کوئی بات ٹھسے گی ورنہ آپ جیسے گھامڑ کو کچھ سکھانا ایسا ہی جیسے لوٹے بھر پانی سے سورج کی آگ بجھانا۔''

منشی جی کی مثال پر ہم تلملا تو گئے لیکن یہ فن سیکھنے کے لئے ہم نے اپنے آپ کو نہایت فرمانبردار ثابت کرتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد منشی جی نے ہمیں بتایا کہ اکثر لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ افطار کے وقت روزہ کھلتے ہی سب کچھ اوپر نیچے ٹھونس لیتے ہیں۔ ایسا کرنے سے ایک تو وہ صحیح طریقے سے کھا نہیں پاتے دوجا ان کو بوجھل محسوس الگ ہونے لگتا ہے۔ اس ضمن میں بہتر یہ ہے کہ صرف پانچ سے سات کھجوروں سے روزہ کھولیں، چار پانچ گلاس شربت وقفے وقفے سے لیں، ایک دو دو پلیٹ فروٹ چاٹ، دہی بھلے، چنا چاٹ وغیرہ کی لے لیں۔ سموسے پکوڑے وغیرہ محض منہ کا ذائقہ تبدیل کرنے کے لئے لیں۔ کچھ وقت گزارنے کے بعد دو پلیٹ پلاؤ یا بریانی مع باربی کیو لے لیں، ساتھ ہی میٹھے کی کوئی چیز چکھ لیں۔ ایک سے ڈیڑھ گھنٹے بعد آپ سالن کی ایک یا دو پلیٹ کے ساتھ ایک یا دو چپاتی لیں۔ سحری کا طریقہ بھی کسی وقت آپ کو بتا دیں گے۔ لیکن یہ سب کیسے لیا جائے گا یہ آپ کو اس وقت پتہ چلے گا جب آپ اس خاکسار کا دو چار بار روزہ افطار کرائیں گے اور اتنی ہی بار سحری کا اہتمام بھی آپ کو کرنا ہوگا۔

منشی جی کی باتیں سن کو ہمارا منہ تو کھلے کا کھلا رہ گیا۔

حنیف عابد شاعر، ادیب، نقاد، کالم نگار، مضمون نگار، فکشن نگار، ناول نگار، بچوں کے ادیب اور سینئر صحافی ہیں۔ آپ کا تعلق کراچی سے ہے۔ ۳۰ سال سے زائد عرصے سے صحافت سے وابستہ ہیں۔ موصوف اپنی غیر جانبدار اور دوٹوک رائے رکھنے کے حوالے سے بدنام ہیں۔ بہترین تجزیہ کار ہیں، ان کی رائے کو رد کرنا عمومی طور پر ممکن نہیں ہوتا۔ ملکی اور عالمی سیاست پر گہری نظر رکھتے ہیں. پرنٹ کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں بھی کام کرنے کا تجربہ رکھتے ہیں۔ موصوف کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں ایک شاعری کا مجموعہ بھی شامل ہے۔ مزید کئی کتابیں زیر ترتیب ہیں جو جلد ہی منظر عام پر آنے والی ہیں۔ ایک سال سے زائد عرصے سے ارمغانِ ابتسام میں لکھ رہے ہیں اور تسلسل سے لکھ رہے ہیں۔

بیگم! کچھ پتہ چلا روزے کب شروع ہو رہے ہیں'' شفیق صاحب نے بیوی سے پوچھا۔

''جی پکا پتہ تو رمضان کا چاند نکلنے پہ چلے گا لیکن اسلامک سنٹر کے مطابق تو چھبیس جون سے پہلا روزہ ہے۔'' فاخرہ بیگم نے جواب دیا۔

''اچھا اچھا، ویسے میرا بھی کچھ یہی اندازہ تھا۔۔ جون شون میں ہی رمضان پاک کا اقدس مہینہ شروع ہونے جا رہا ہے۔۔۔ اللہ پاک سب کو روزے رکھنے کی توفیق دے۔ دیکھنا پتہ بھی نہیں چلے گا، جھٹ پٹ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مہینہ گزر جائے گا۔''

''آمین، بالکل جی بالکل چوہدری صاب، سارا سال تو ہم اپنی مرضی سے زندگی جیتے ہیں۔ یہ ایک ہی مہینہ اللہ کا، سوائے بھرپور طریقے سے گزارنا چاہیئے۔ نیکیوں میں پیچھے نہیں ہٹنا چاہیئے۔''

''تو اور کیا بیگم۔۔۔ بڑا منفعت بخش مہینہ ہے یہ۔۔۔ ایک کا دس۔۔۔ ویسے بیوی تم نے رمضان کی کوئی تیاری بھی کی ہے؟''

''ہر سال کی طرح کی ہے جی۔۔۔ سموسے اور کباب بنا کر فریز کر لیے ہیں۔ آج بڑے (بھلے) بنا کر فریز کرنے کا ارادہ ہے۔ نئی ترکیب ملی ہے مجھ کو۔ خستہ پاپڑی بھی بنا لوں گی۔۔ چاٹ، دہی بھلے اور سموسہ پلیٹ کے ساتھ (چٹخارے لیتے ہوئے) بہت مزہ دے گی۔'' فاخرہ نے جواب دیا۔

''بیگم، ویسے تمہارا بس چلتا تو تم شائد فروٹ چاٹ بھی بنا کر فریز کر لیتیں۔ لیموں پانی، املی کی چٹنی کی ڈلیاں بھی جما لیتیں۔۔

خیر چلو اچھا، تمھارا بڑا کام نپٹ گیا۔۔۔سارا وقت تمھیں کچن میں گھسنا نہیں پڑے گا۔ پانچوں نمازوں کے لیے بآسانی وقت نکل آئے گا۔ میں تو کہتا ہوں اس بار قرآن پاک بھی ایک کی بجائے تین چار پڑھ لینا۔ دو تو میں بھی ختم کرنے کی کوشش کروں گا۔ دیکھا نہیں کئی رشتہ دار داغِ مفارقت دے گئے ہیں۔۔ان سب کو بھی کچھ نہ کچھ جہانِ عدم بھیجنا ہے۔"

"بجا فرمایا آپ نے چوہدری صاب! دل سے دل کو راہ۔۔۔ میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی تھی۔ دیکھیں نا، اب ہر سال ان کے گھر افطاری بھیجنے کی بجائے ایک دو سپارے پڑھ کر سیدھا ان کی روح کو ایصالِ ثواب پہنچا دیا کریں گے، تو ان کا بھی فائدہ اور اپنا بھی۔!"

"ہاں یہ واقعی ٹھیک رہے گا۔ میں نے تو سوچ لیا ہے کہ رمضان میں کام سادا سودا رکھنا ہے۔ گھر میں کھانا پکانے، کہیں آنے جانے، ملنے ملانے کا کام تو بہت کم رہ جائے گا نا۔ تم تو سو کر بھی ظہر کے وقت اٹھوگی۔۔۔نہ کوئی گھر آئے گا نہ کہیں جائے گا۔ اور ہاں، بچوں کو کہہ دینا اپنے اپنے ہوسٹل میں ہی رہیں۔ رمضان میں گھر آنے کی کوئی ضرورت نہیں صرف عید کی چھٹیوں میں آئیں۔"

"نہ چوہدری جی! یہ تو بڑی زیادتی کی بات ہے۔ وہاں ہوسٹل میں روزے رکھنے میں اُنھیں کتنی مشکل ہوگی۔"

"لو کر لو بات۔۔۔ یہ مہینہ ہے ہی صبر کا۔۔۔! اُن کا پریکٹیکل بھی تو ہونا چاہیئے۔ میں نے کہہ دیا سو کہہ دیا۔ پہلے ہی اتنے بڑے بڑے خرچے منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی بندہ کدھر سے بچت کرے اور کدھر سے کٹوتی۔۔ایک بڑا خرچہ انھی دنوں آن

نہیں ڈاکٹر صاحب! نہ میرا پاکستان سے کوئی تعلق ہے اور نہ ہی وہاں کی سیاست سے۔۔۔لیکن آپ مجھ سے یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟

کھڑا ہوا ہے۔"

"میں کیا جی، آپ فکر کیوں کرتے ہیں۔ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ فضل کرنے والا ہے، رحمتوں، برکتوں کے مہینے میں ہم پر بھی کوئی نہ کوئی کرم ضرور کرے گا۔۔۔ کوئی راہ دکھا دے گا۔ ویسے آپ نے رمضان کے لیے کیا پلان کیا۔۔۔؟"

"میں تو اعتکاف میں بیٹھوں گا۔" چوہدری صاحب فخریہ بولے۔

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ۔۔۔ اللہ سب کو توفیق دے، آمین (کہہ کر بیگم نے دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیر لیے) لیکن سنیے جی، بچوں کے آنے اور نہ کہیں آنے جانے سے مجھے بڑی اداسی اور بوریت ہو جائے گی۔" بیوی بولی۔

"بیگم کاہے کی بوریت۔۔۔ پہلے بھی تو تم فون پہ سہیلیوں سے گھنٹوں گپیں لگاتی ہو۔۔۔ رمضان کی بدولت شائد ایسا ممکن نہ ہو۔۔۔ لیکن تم نیک کام کے لیے تو ان سے رابطہ کر سکتی ہو نا۔۔۔ تو ساتھ دو چار باتیں کر کے دل پشوری کر لیا کرنا۔ اور اِدھر اُدھر کی دو چار خبریں بھی لے لیا کرنا۔"

"یہ ٹھیک کہا آپ نے ورنہ پہاڑ سے روزے۔۔۔!"

☆☆☆☆☆

ٹرن ٹرن ٹرن۔۔۔۔

چار پانچ گھنٹی کے بعد بیگم آفاق نے فون اٹھا لیا (لوگوں کو رمضان میں بھی چین نہیں۔)

"ہلو کون۔۔۔؟"

"میں فاخرہ اور کون؟"

"اوہ اچھا فخری تو۔۔۔"

"میں نے کہا رمضان مبارک۔۔۔"

"خیر مبارک، لیکن آج تو چھٹا روزہ ہے، تمھیں آج یاد آیا مبارک دینے کا۔۔۔؟"

"اے لو، روزے کوئی گزر تھوڑی گئے ہیں، پورا مہینہ رمضان مبارک کہا جا سکتا ہے۔۔۔ یہ تو اللہ کا مہینہ ہے تمھیں اپنے دل میں وسعت ڈالنی چاہیے۔"

وہ بہت سست الوجود سا بندہ ہے، ہر اہم کام میں متعدد دقیقے فروگزاشت کرتا ہے اور بالعموم دو دقیقوں کی فروگزاشت کے درمیان نیل تا کاشغر کا فاصلہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر عزیز فیصل

"بھئی، ہمارا دل تو سارا سال وسیع رہتا ہے۔۔۔ کبھی تنگ نہیں پڑا۔ رمضان میں کوئی تنگ تھوڑی پڑے گا۔"

"اچھا یہ بات ہے ابھی دیکھ لیتے ہیں تمہارا دل۔۔۔!"

"ویسے خیریت ہے نا، کیسے فون کیا؟"

"بالکل خیریت ہے جی۔۔۔ رمضان ہے ناں تو خیال آیا کہ کہیں ہم سب حقوق اللہ میں اتنے مگن نہ ہو جائیں کہ حقوق العباد کی طرف سے مار پڑ جائے۔۔۔ سوچا عملی طور پر کوئی نیک کام کیا جائے۔ اس لیے میں اپنے طور پر ایک چھوٹی سی چیرٹی کا کام کر رہی ہوں۔ آپ بھی کیا یاد کریں گی، آپ کو بھی نیکی کمانے کا موقع دے رہی ہوں۔۔۔ ایک خاتون ہیں۔ بے چاری بہت مشکل میں ہیں۔۔۔ بچے بھی ہیں ان کے۔ اچانک تکلیف کا سامنا ہو گیا۔ اگر مل کر ان کی مدد کر دی جائے تو بڑا نیک عمل ہوگا؟"

"اوہ، ہاں تو یہ بات ہے، اچھا تو کتنی رقم دینا ہوگی؟"

"یہ تو آپ کی دریا دلی پر ہے۔ جتنا بھی دے سکیں۔ نیکی کر کے آپ نے دریا میں ہی ڈالنی ہے۔"

"اچھا میں پچاس یورو ملازمہ کے ہاتھ بھیج دوں گی۔"

"صرف پچاس یورو۔۔۔!"

"بیگم آفاق کچھ دریا دلی دکھائیں۔ چلیں سو یورو تو دیں نا۔۔!"

"اچھا تم بھی کیا یاد کرو گی۔۔۔ بھیج دوں گی ایک دو دنوں میں۔"

☆☆☆☆☆

ہلو روبینہ، میں فاخرہ۔۔۔ (ریکارڈ میسج)

"امید ہے تم ٹھیک ہو گی۔۔۔ (شاپنگ کے لیے نکلی لگتی ہو) فون کیا نہیں، نہیں کچھ خاص نہیں تھا۔۔۔ بس ایک چھوٹا سا کام تھا۔۔۔ وہ نہ ہے مصیبت کی ماری ایک دکھیاری، اُس کی مدد کرنی ہے اس لیے تمھیں فون کیا تا کہ نیکی کے کام میں تم بھی پیچھے نہ

رہو۔۔۔ایسا کرنا۔۔۔پچاس یورو اگر کر دو تو یقین کرو جھولی پھیلا پھیلا کر تمھیں دعائیں دے گی وہ مشکل کی ماری۔۔۔!''

☆☆☆☆☆

''ہلو۔۔۔جی وہ نہ میں بول رہی ہوں اپنی بیگم صاحبہ کی ملازمہ جی جی۔۔۔وہی۔''

''اچھا ذرا اپنی بیگم صاحبہ کو تو فون پہ بلا دو۔۔۔جاگ رہی ہیں یا لمبی تان کر سو رہی ہیں؟''

''بیگم امین، وہ کیا ہے نا رمضان کے بابرکت مہینے میں ایک چھوٹی سی نیکی کمانے کی کوشش کر رہی ہوں۔۔۔ایک بے چاری، مصیبت کی ماری، گھر میں بیماری، حالات کی ماری ہے کوئی لاچاری، میں اس کی مدد کرنا چاہ رہی ہوں۔ تو اچانک آپ کا خیال آیا کہ نیکی کرنے کے کاموں میں دوسروں کو بھی شامل رکھنا چاہیے تو کچھ مدد کر دیں اس کی۔۔۔کیا، صرف پچیس یورو۔۔۔بھئی یہ کیا بات ہوئی۔۔۔نام بڑے اور درشن چھوٹے، ہر کس و ناکس نے سو، پچاس سے کم بات نہیں کی۔۔۔رمضان میں نیکی کمانے کے موقعے تو قسمت والوں کو ملتے ہیں۔ ویسے آپ کی مرضی ہے لیکن پچاس سے کم تو میں ہرگز نہ لوں گی۔۔۔!''

☆☆☆☆☆

بیگم آفاق، روبینہ، بیگم امین کے بعد راحیلہ، ثریا، اور بھی دو چار کو فون کھڑکائے گئے۔۔۔رمضان کے بابرکت مہینے اور نیکی کمانے کا احساس دلایا گیا۔ تو کسی نے دل کھول کر سو، پچاس سے مدد کی اور کچھ مہربانوں نے پچیس، تیس یورو دے کر نیکی کے کام میں حصہ ڈال دیا۔۔۔اور حقوق العباد کے کھاتے میں اپنا نام لکھوا لیا۔

☆☆☆☆☆

آج چاند رات ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدری شفیق صاحب پھولوں کا ہار گلے میں پہنے اسلامک سینٹر والوں کی مسجد سے گھر پہنچے ہیں۔ پورے دس روز سے وہ اعتکاف میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد میں وہ بھی پیچھے نہیں رہے تھے۔۔۔ابتدائی بیس روزے انھوں نے بھی خوب محنت کی تھی۔ دوست احباب کو نیکی کمانے کی ترغیب دی تھی۔ مصیبت زدہ لوگوں کی مشکل کا خوب احساس دلایا تھا۔۔۔

''بھئی رمضان کا مہینہ۔۔۔نیکیاں سمیٹنے کا مہینہ، گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کا نادر موقع، غریبوں، مسکینوں، لاچاروں کی مدد کرنے کا بہترین وقت، پھر ایسا وقت کسی پر بھی آسکتا ہے۔ دل کھول کر سخاوت کریں ایک نیکی دس بن کر آپ کے کھاتے میں جائے گی۔''

چیرٹی جمع کرنے میں وہ بھی بیگم سے پیچھے نہ رہے تھے۔ دوست احباب، ملنے ملانے والے اور پڑوسیوں کی مبارکبادیوں سے فارغ ہو کر بیٹھے تو چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر بولے ''اچھا تو فاخرہ بیگم کیا بنا اس چیرٹی کے کام کا؟''

''مت پوچھیں۔'' فاخرہ بیگم بولیں ''رمضان کا مہینہ تھا اس لیے اللہ نے اس میں خوب برکت ڈالی۔۔۔مجھے لگتا تھا شائد سو، پچاس کم پڑ جائیں گے اور پلے سے ڈالنے پڑیں گے۔۔۔لیکن آپ والی رقم اور میری جمع کردہ رقم سے پچاس، ساٹھ یورو اوپر ہی ہوئے ہیں۔ ہمارا سات سو یورو کا ٹارگٹ تھا نا۔۔۔تو پورے سات سو ساٹھ یورو اکٹھے ہوئے ہیں۔''

''ارے واہ ماشاءاللہ، ماشاءاللہ۔۔۔اس کا مطلب، سب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ نیکی کے کام میں بڑی برکت رہی۔ اللہ نے سب کو توفیق دی۔ اچھا اب ایسا کرنا۔ یہ پوری رقم مجھے دے دینا۔۔۔میں عید کی چھٹیوں کے فوراً بعد پاکستان جانے کے لیے ٹرکش ائیر لائن سے تمھاری سیٹ کی بکنگ کروا دوں گا۔''

کائنات بشیر کا تعلق لاہور سے ہے لیکن گزشتہ کئی سالوں سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ مضمون نویسی اور شاعری ان کا میدان ہے۔ شگفتہ نگاری ان کی تحریر کا خاصا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں ان کی کتاب ''چاند اور صحرا'' شائع ہوئی، مزید بہت سی کتابیں اشاعت پذیر ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں باقاعدگی سے لکھ رہی ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کی مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

عتیق الرحمٰن

بیگم، بیلنا اور ہم

عشاء کی نماز سے لوٹتے ہی ہم سیدھے دسترخوان پر جا بیٹھے۔ جلد ہی گرما گرم مٹن کڑاہی بمع میٹ سامنے آگئی۔ کڑاہی مٹن کی ہو یا چکن کی دونوں میں ہی بیگم مشاق ہے اور کھانے کے دوران وہ دادطلب نگاہوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ ہم داد دیتے بھی ہیں کہ اگلی کڑاہی بھی کھانی ہوتی ہے۔ ہم نے جلدی جلدی چمچے کی مدد سے پلیٹ بھری اور لذیذ کڑاہی بمع لوازمات کھانے میں محو ہو گئے۔ بیگم نزدیک ہی کچن میں گرم گرم روٹیاں پکا کر دسترخوان پر موجود ہاٹ پاٹ میں رکھتی جاتی۔ نجانے اچانک کہاں سے یہ بدبخت شعر جو ہمارے ایک دوست، جو اب دشمن ہیں، نے مذاق میں کہا تھا، آکر دماغ میں گردش کرنے لگا اور پھر کرتا ہی چلا گیا۔

اور سالن بہت مزے کا ہے
پر نمک کی کمی ہے تھوڑی سی

دماغ سے سرکتا سرکتا یہ شعر زبان تک جا پہنچا اور غیر اختیاری طور پر زبان سے سلپ ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا بیگم، جس کے اینٹھنے تو پہلے ہی کھڑے رہتے ہیں کہ اسے شاعری سے سخت چڑ ہے۔ بیلن سمیت دسترخوان پر آدھمکی۔ آنکھیں اور بھویں چڑھاتے اور منہ چڑاتے ہوئے مکرر مکرر کی گردان الاپنے لگی۔ لاکھ ادھر اُدھر کیا کہ یہ شعر ہمارا نہیں بلکہ ہمارے دوست گوہر نے یہ شعر فرح اسد کی تحریک پر کہہ کر ہمیں پوسٹ پر منظوم کمنٹ سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کی تھی مگر بیگم کا دعویٰ تھا کہ اس طرح کے اشعار صرف ہم ہی کہہ سکتے ہیں۔ شعر کی پہچان میں ناکامی پر ہمارے دل میں خوشی کی ایک لہر تو اٹھی مگر یہ لہر اس وقت دب گئی جب بیگم نے بیلن ہوا میں لہرا کر دوبارہ کہا ''مکرر!''

بیلن خوردہ کی حالت کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں۔ جیسے ہی بیگم ہاتھ ہوا میں لہراتی، ہم سر کو دونوں ہاتھوں سے محفوظ کرنے کی مشق کرتے مگر جب ''مکرر مکرر'' کی گردان زور پکڑ گئی تو اضطراری کیفیت میں یوں محسوس ہوا جسے ہم مشاعرے میں بیٹھے ہیں۔ یکدم شعر زبان سے لپک کر بیگم کی سماعت سے جا ٹکرایا۔ لہراتا ہوا بیلن سیدھا ہم تک آیا اور بازوؤں کے حصار کو توڑتا ہوا سر کا بوسہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ سر گو آرام میں ہے لیکن کنپٹیاں اب بھی درد کر رہی ہیں اور ساتھ ہی یہ شعر بھی دماغ میں گردش کر رہا ہے۔

ہم تو سمجھے تھے بہت مخلص ہیں گوہر اور فرح
دوستوں کی سازشوں کا ہو گئے ہیں ہم شکار

ناراض ہو کے تشنہ یہ زندگی رہی ہے۔۔۔ ناراض ڈاکٹر نذیر تبسم کی اہلیہ بھی ہوا کرتی تھیں اور ناراض ہماری بیگم بھی ہوتی ہے،

فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں کھلانے پلانے کے عمل پر ناراضی اثر انداز نہیں ہوتی تھی جبکہ یہاں دانا پانی بند ہو جاتا ہے۔

پہلے پہل تو بڑی پریشانی ہوتی تھی اور غصہ بھی آتا۔ اس غصہ کا اظہار بھی خود ہی سے ہوتا کہ بندہ کسی گھر کی سب سے چھوٹی سے شادی نہ کرے کہ چھوٹے کے ناز نخرے تمام عمر ساتھ رہتے ہیں۔ بیگم کی ناراضی کا دورہ، اوہ سوری، دور تین دن تک جا پہنچتا۔ کئی کئی پہر روزے سے رہنا پڑتا اور اللہ سے قبولیت کی دعائیں بھی مانگی جاتیں۔ صبر اور برداشت کے فضائل کچھ نہ کچھ تقویت دیتے۔ روحانی ترقی کے خواب دیکھے جاتے، پھر جب آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تو خواب بھی چکنا چور ہو جاتے۔ اکثر لوگ کہتے کہ بھائی آج کل بڑے سمارٹ لگ رہے ہیں۔ یہ جملے اچھے لگتے تھے لیکن پھر جب سمجھ آنے لگی تو معلوم پڑا کہ ایک دھان پان آدمی کے لیے لفظ ''سمارٹ ہونا'' کیا معنی رکھتا ہے، یوں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔

تبدیلی کا سفر بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ تبدیلی کے نعرے لگانے شروع کیے کہ تبدیلی آ رہی ہے اور پھر یہاں تک پہنچے کہ تبدیلی آ نہیں رہی بلکہ آ گئی ہے، یوں بوقت ضرورت کچن میں سیلف سروس کی راہ کھلی کہ عافیت اِسی میں تھی۔ بیگم کالج روانہ ہوئی اور ہم نے بیگم کی سلطنت میں گھس کر پیٹ پوجا کی۔ کئی مرتبہ رنگے ہاتھوں پکڑے بھی گئے۔

ہم جیسے، رمضان ہی کے روزے رکھ لیں تو غنیمت ہے۔ ہماری مستقل مزاجی شک وشبہ سے بالاتر ہے جو وزن تیس برس پہلے تھا سو آج بھی ہے۔ ہر رمضان میں چار سے پانچ کلوکم ہو جاتا ہے اور پھر کئی مہینوں کی خوردنی کوششوں کے بعد کہیں جا کر برابر ہوتا ہے۔ کہیں فارم میں وزن کا خانہ پر کرنا پڑ جائے تو سال کا اوسط وزن لکھنا پڑتا ہے۔

بڑھتی عمر اور تجربے سے یہ کھلا کہ انسان عادات وخواہشات کا غلام ہے اور بعض اوقات عادت چھڑانے میں بندہ ٹوٹ جاتا ہے جو یقیناً خسارے کا سودا ہے، سو اب بیگم کے ساتھ کامیابی سے یہ معاہدہ طے پا گیا ہے کہ ہم بیگم کو شعر نہیں سنائیں گے اور بیگم ناراضی کی دہلیز کو مس کرتے ہی سگنل دے گی کہ ہم ناراضی مینجمنٹ کا سبق تازہ کر لیں۔ بقول بیگم، شاعر بہت حساس ہوتا ہے مگر گھر سے باہر کی دنیا کے لیے۔ اس حوالے سے ہم جو مرضی فلسفہ جھاڑ لیں، بیگم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہی پڑتا ہے اور وہ شائد ٹھیک ہی کہتی ہے۔ جہاں تک معاہدہ کا تعلق ہے، اِس کی پاسداری کرنا ہی پڑتی ہے کہ اس کی گواہان ہماری بیٹیاں مکمل غیر جانبداری کا دعوئ کرتی ہیں۔ کسی کے لیے غلطی کی کوئی گنجائش نہیں۔ غلطی پر فوراً شیراز، عثمانیہ یا چائنیز کا ٹکٹ ایشو ہو جاتا ہے۔

جیب اکثر ہماری ہی ہلکی ہوتی ہے کہ کبھی کبھی موج میں آ کر ہم بیگم کے سامنے چونچ کھول بیٹھتے ہیں اور احتیاط کے باوجود شعر زبان سے سلپ ہو جاتا ہے۔ کئی مرتبہ بیگم، جو نری استاد ہی نہیں، بڑی استاد بھی ہے، کی پاکیزہ کمائی سے ٹریٹ کا موقع قریب سے آ کر گزر گیا کہ کسی نہ بیٹی نے بیگم کو باخبر کر دیا کہ وہ ناراض ہونے والی ہے۔ مزاج آشنا تو بیٹیاں ہماری بھی ہیں مگر وہ ہماری سوالیہ نظروں کو یہ کہہ کر لاجواب کر دیتی ہیں کہ انہیں ہماری شاعری اسقدر پسند ہے کہ وہ معاہدے کی شق بھول جاتی ہیں، یوں ان کی داد ہمیں شکست کے غم سے آزاد کر دیتی ہے۔ بہرحال اب زندگی گل وگلزار ہے باغ بہار ہے کہ ہم بھی پہلے جیسے نہیں رہے:

تبدیل کر لیا ہے ہم نے عتیق خود کو
شکوے شکایتوں سے بڑھنے لگی محبت
ناراض ہو کے تشنہ یہ زندگی رہی ہے
گر مل گئی محبت یہ زندگی ہے جنت

عتیق الرحمن صاحب کا تعلق پشاور سے ہے۔ پیشہ انجینئرنگ ہے لیکن اُردو ادب کی انجینئرنگ کا فریضہ بھی خاصی مہارت سے سنبھال رکھا ہے۔ بہت اچھے شاعر ہیں، غالباً ایک مقامی اخبار میں روزانہ کی بنیاد پر ''قطعہ نگاری'' کا فریضہ بھی سرانجام دے رہے ہیں۔ مزاح سے فلرٹ کرنا جانتے ہیں۔ اِن کی بیشتر شاعری ان کی شگفتہ مزاجی کی مظہر ہے۔ یہ غالباً ان کی پہلی نثری کاوش ہے۔

کرکٹ نامعقول کھیل

راشد حمزہ

بہت زمانے پہلے جب انسان کے پاس کرنے کو اتنے زیادہ کام نہیں ہوتے تھے وہ پورا دن ویلا رہتا تھا، اس لئے شکار کھیلنے کی طرف متوجہ ہو جاتا یا اکثر عشق فرماتا تھا، عشق اور شکار دو ایسے کھیل ہیں جس کی ابتداء حضرت انسان کے ساتھ ساتھ ہوئی ہے، وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مختلف شعبوں کی پیدائش سے یہ دونوں کھیل متنوع ہو گئے ہیں، یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جب سے انسان ہیں یہ دونوں عشق اور شکار کھیلے جاتے ہیں، دونوں میں اصل اور مشترک چیز کھیل ہے، عشق بھی کھیل شکار بھی کھیل ہے، نسل بڑھانا بھی کھیل ہے دولت کمانا بھی کھیل ہے، مطلب دنیا میں بمشکل کوئی ایسی سرگرمی ہوگی جو کھیل کے زمرے میں نہ آتی ہو، ابتدائی زمانے کے انسان کے پاس دلچسپ زندگی گزارنے کو چند ہی مشاغل تھے جس میں وہ کھیل سمجھ کر کھیل لیا کرتے تھے، آہستہ آہستہ جب انسان کی مصروفیات زیادہ ہو گئیں تو اس نے ان مشاغل اور مصروفیات کے متعلق مختلف قسم رویوں کو تشکیل دینا شروع کر دیا۔

حضرت انسان نے اپنی آسانی کے لئے ان مشاغل کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر دیا، ایک حصے میں ان مشاغل کو شامل کر دیا جس سے وہ حظ اور لطف اٹھاتا ہے اور دوسرے حصے میں ان مشاغل کو ڈال دیا جو قدرے غیر دلچسپ، اکتاہٹ اور بیزاری لانے والے تھے، یعنی ایک حصہ کھیل اور دوسرا حصہ کام بن گیا، زندگی کے مشاغل کی یہ تقسیم کسی ایک انسان کا ذاتی کارنامہ نہیں تھا، یہ عالم انسان کی سوچ کی ارتقاء کے طویل سفر کا نتیجہ تھا، اور اگر ایسا کوئی انسان ہوتا بھی تو ہم اسے زندہ نہیں چھوڑتے بلکہ اگر مر چکے بھی ہوتے اور ان کی آخری آرام گاہ معلوم ہوتی تو ہم اسے زبردستی زندہ کر کے مشاغل کی اس تقسیم کو بھگتانے کا تجربہ کراتے۔

یہ تو کھیل کے بارے میں تمہید ہو گئی جو ضرورت سے زیادہ لمبی ہو گئی، کہتے ہیں بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، اب جب بات کہاں سے یہاں پہنچ گئی تو بتاتے چلیں کہ کھیلوں میں کبھی کرکٹ مجھے بے حد پسند ہوتا تھا، دلچسپ بھی لگتا تھا، عمر کے ساتھ ساتھ اس کھیل میں میری دلچسپیاں بڑھنے کی بجائے کم ہو گئیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب مجھے کرکٹ کا یہ کھیل ذرا بھی دلچسپ محسوس نہیں ہوتا، اس کھیل میں مجھے طرح طرح کی خرابیاں نظر آنے لگی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب میں اس نقطے پر آ کر رکا ہوا ہوں کہ کرکٹ مجھے کھیلوں کا انتہائی غیر معقول قسم لگتا ہے، میرا بس چلے تو اس غیر معقول کھیل پر پابندی لگا کر ساری جوان نسل کو عشق و محبت کا کھیل کھیلنے پر لگا دوں۔

کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ کرکٹ کی جائے پیدائش انگلستان ہیں، لیکن حقیقت میں اس کی جنم بھومی ہمارا برصغیر پاک و ہند ہے،

دراصل یہ کھیل ہمیں بالکل اسی طرح لگتا ہے جو کھیل ہم بچپن میں گھروں کی چھتوں پر کھیل لیا کرتے تھے، فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں اس کی سادہ قسم کھیلے جاتی مغرب پہنچ کر اس پر جدید مشینی معاشرے کا رنگ غالب آجاتا ہے، جس طرح ہم مسلمان دعوی کرتے ہیں کہ جدید سائنس کی بنیاد ہمارے اجداد نے رکھی ہے مغرب نے بعد میں اس پر اپنی عمارت کھڑا کردیا ہے اسی طرح کرکٹ کی بنیاد میں بھی منشی مریم چند کے گلی ڈنڈا موجود ہے، اس تاریخی ملاپ پر اگر کرکٹ کو ہم جدید گلی ڈنڈا یا گوروں کی گلی ڈنڈا کہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہوگا۔

خیر میں نے اس پر کیا بحث کرنی کہ کرکٹ کی جنم بھومی کہاں ہیں، مجھے تو آج صرف یہ بیان کرنا کہ اس کھیل میں کتنی خرابیاں اور غیر معقولیت پائی جاتی ہے، اب آپ اس کھیل میں یہ بڑی خرابی دیکھیں کہ کس طرح محض ایک بلے باز بیچارے کو کھیل کے میدان سے باہر کرنے کے لئے مخالف ٹیم کے گیارہ کھلاڑی درپے رہتے ہیں ان گیارہ کھلاڑیوں کا میدان میں دوعدد امپائرز بھی ساتھ دیتے ہیں، امپائرز نہایت قابل اعتراض قسم اشارے کرتے ہیں کسی موقع پر جب امپائر انگلی دکھاتا ہے تو بلے باز خفا سا ہوجاتا ہے وہ بلے کو بغل میں تھام لیتا ہے سر جھکا لیتا ہے اور شرمندہ شرمندہ کسی ایسے کمرے میں لوٹ جاتا ہے جہاں وہ نظر نہیں اتا ہے، کہتے ہیں کہ وہ انگلی دکھانے پر شرمندہ ہوجاتا ہے، اب آپ خود سوچیں کہ انگلی دکھانا کتنی قابل اعتراض حرکت اور قابل شرم بات ہوگئی، ہزاروں تماشائیوں کے سامنے بھلا کوئی ایسا بھی کرتا ہے؟

پویلین لوٹتے وقت تو سٹیڈیم میں بیٹھے تماشائی نجانے کیا الا بلا کہہ جاتے ہیں اور کوستے رہتے ہیں، مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں، امپائرز اور تماشائیوں سب کو چھوڑیے، آپکے آوٹ ہونے کا انتظار ڈریسنگ روم میں بیٹھے آپکے اپنے ساتھی بھی شدت سے کرتے ہیں، وہ بالکل ایسے ہی تیار رہتے ہیں جیسے کوئی کسی اپنے کے مرنے سے قبل اسکا میراث تقسیم کرنے کی تیاری کرتے ہیں، ہمارے ایک دوست طارق عزیز ہمیشہ پہلے نمبر بلی بازی کرتے ہیں، وہ اچھی شکل وصورت کے بھی مالک ہیں، اسے جب امپائرز انگلی دکھاتا ہے تو وہ بہت زیادہ برا مان جاتا ہے یہاں تک کہ ڈریسنگ روم میں وہ ہر اس کھلاڑی پر چڑھ دوڑتا ہے اور لعنتیں بھیجتا ہے جو ان کے بعد بلے بازی کے لئے گراونڈ میں جاتا ہے۔

چلیں انگلی دکھانے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن یہ مختلف طریقوں سے بلے باز کو آوٹ قرار دینا بھی تو زیادتی ہوتی ہے، اگر ایک بار الٹا سیدھا بلا گھمایا تو کیچ کیے جاؤ گے، وکٹ کے سامنے بال پاؤں پر لگا تو اوٹ قرار دیئے جاوگے، ارے بال پاؤں پر لگتا ہے یا کہیں اور لگ جاتا ہے لگتا تو بلے باز کو ہی ہے اس صورت میں تو بیٹسمین کو نہیں باؤلر آوٹ ہوجانا چاہئے، اتنی سخت گیند سے بلا کوئی کسی مارتا ہے، یہ بھی تو خاصا غلط اور ناانصافی لگتی ہے کہ ڈگ میں بیٹھے تو بلے باز گھنٹوں انتظار فرماتے ہیں پھر بھی اسکی ضمانت کوئی نہیں دے سکتا کہ باری آئیگی بھی، میرے خیال میں کرکٹ سرتاسر بیہودہ اور غیر معقول کھیل ہے، جو کہ سارا کھیل بلے باز کو پویلین کا راستہ دکھانے کیلئے کھیلا جاتا ہے، اب اگر کرکٹ میں چند تبدیلیاں نہیں ہوتیں تو یہ مجھے بے تحاشا ناپسند رہے گی، پہلی تبدیلی یہ ہونی چاہئے کہ اوٹ کو صرف بلز اڑانے تک متعلقہ کیا جائے، کیچ ہونے کی صورت میں بلے باز کو انعامی رقم ملنی چاہئے، گیند پر بلے باز کے پاؤں پر مارنے والے گیند باز کو اوٹ ہوجانے کا قانون ہونا چاہئے، صرف دو بلے بازوں کو میدان میں نہیں ہونا چاہئے ہر ایک کو برابر کا موقع ملنا چاہئے اس لئے سب کو میدان میں ہونا چاہئے اور مخالف ٹیم کے ہر کھلاڑی کو بیک وقت گیند بازی کرنی چاہئے۔ میرے اس فارمولے سے کرکٹ ایک دلچسپ اور معقول کھیل بن سکتا ہے۔

راشد حمزہ کا تعلق قدرتی جنگلات اور شفاف پانیوں کے چشموں، ندیوں اور خوبصورت وادیوں کی سرزمین سوات سے ہے تاہم سکونت لاہور میں اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ان کے مضامین میں چلبلاہٹ اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

ہائی برڈ

ہائی برڈ چوزے کھا کھا کر ایک تو ہمارے یہ چوزے ۔۔۔اوہ۔۔۔ہمارے نوجوان بھی ہائی برڈ ہو گئے ہیں۔ حیا نام کو نہیں اور بدتمیزی اس قدر کہ کسی حد کی محتاج نہیں اور تو اور ہلکی سی بیماری کا حملہ بھی ہو تو ہفتوں صاحب فراش۔ پچھلے وقتوں کی کیا بات ہے، اُس زمانے کے طلباء اس قدر تمیزدار اور باحیا ہوا کرتے تھے کہ جب استاد کو دور سے آتا ہوا دیکھتے تو فرطِ حیا سے سلام بھی خاصا جھکتے ہوئے کرتے مگر توبہ توبہ، آج کا طالب علم تو اتنا بے حیا ہو گیا کہ ہیڈفون کانوں میں ٹھونسے، لہکتے، مٹکتے، گاتے اساتذہ کے سامنے سے یوں گزر جاتا ہے جیسے اپنے کسی بے تکلف یار بیلی کے قریب سے گزر رہا ہو۔ اوپر سے بالوں اور داڑھی کا فرنچ کٹ سٹائل۔۔۔دل کرتا ہے کہ کان سے پکڑ کر اُن کے اپنے ذاتی والد صاحب کے حضور پیش کر دوں مگر کیا کیا جائے، چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ، وہ تو آپ ہائی برڈ کی تیسری فارم ہو کر رہ گئے ہیں۔ شکوے، گلے پر کچھ کر بھی دیا تو محض بتیسی نکال دی اور اپنے برخوردار کو ہلکی سی گھرکی دی اور بس۔۔۔سیکھنا سکھانا کاہے کا۔

استاد غریب بھی کیا کرے، وہ خود ہائی برڈ شلجم کھا کھا کر خاصا بے ہمت ہو گیا ہے۔ گھر کے ماحول پر بھی اس کے گھمبیر اثرات مرتب ہو چکے ہیں۔ ماں کے ساتھ بیٹیوں کی بدتمیزی اور بیٹوں کی ہٹ دھرمی آئے روز کا معمول ہے۔

ایک تو اس ہائی برڈ ڈنگ پٹنگ نے بھی ہمارا ناطقہ بند کیا ہوا ہے۔ عین رش میں ایسا یوٹرن لیتا ہے کہ ہم اپنی گاڑی کو بچاتے بچاتے بھی اکثر ٹکرا جاتے ہیں جبکہ اس لوہاری کل پرزے کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی اور ہماری نازک اندام جاپانی گڑیا میں ڈنٹ لگ جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک برآمد شدہ کینڈی کا ریپر دیکھا جس پر جلی حروف میں ''حلال'' لکھا ہوا تھا مگر نیچے اجزائے ترکیبی میں بیس فی صد ''سوّر'' کی چربی کا حصہ بھی ڈالا گیا تھا، یعنی انگریز بہانے

> ڈکیتی کرتے وقت وہ صاحبِ خانہ کو اظہارِ رائے کی مکمل آزادی دیتا ہے اور یہ پوچھنا اپنا پیشہ وارانہ فرض سمجھتا ہے کہ رواں ڈاکہ زنی کی انجام دہی کے دوران اُسے (یعنی صاحبِ خانہ کو) کوئی اضافی زحمت تو نہیں اٹھانا پڑی۔ **ڈاکٹر عزیز فیصل**

بہانے سے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر ہم میں بے غیرتی کے مزید جراثیم سمونے پر تلا ہوا ہے۔ خیر سے غیرتِ ایمانی کا جنازہ تو ویسے بھی نکل چکا ہے جو ناموسِ رسالت پر حملے کرنے والے دھڑلے سے سینا تان کر مغلظات بکتے نظر آتے ہیں اور ہماری ایمانی حمیت اتنی مائل بہ بے حسی ہے کہ ہاتھ سے تو کجا، زبان سے نحیف ونزار سی لعنت ملامت تو ایک طرف رہی، دل میں عداوت تک رکھنے کے روادار نہیں۔

میں نے اب تک بالائی حصے میں جو کچھ طنز کے تیر چلائے ہیں، اُسے عین تجربے سے ثابت بھی کر سکتا ہوں کہ ہر نومولود کو جو ٹیکے لگوائے جاتے ہیں اس میں بھی اغلباً کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور کی جاتی ہے کیونکہ عالمی بساط کے ہنود و یہود شاطروں سے کچھ بھی بعید نہیں۔

اگرچہ کہا تو یہ جارہا ہوتا ہے کہ یہ ٹیکے موروثی و متعدی بیماریوں سے بچاؤ کے لیے ہیں اور بلاشبہ ایسا کچھ ہے بھی، جبھی تو ان بیماریوں کا تدارک ہوگیا ہے لیکن کسی مہم کو کامیاب بنانے کے لیے بیچ کا مرکب کم ازکم دس فی صد تو ضرور رکھا جاتا ہے۔

ہمارے سیاستدانوں کو لے لیجیے۔ ہر جلسے میں اپنے اپنے انداز اور تربیت کے مطابق بڑھکیں مار کر ووٹ اینٹھ لیتے ہیں لیکن جب کسی سرکاری عمارت کی تعمیر کا ٹھیکہ مل جائے یا اس کی ذمہ داری محکمے کی طرف سے عائد ہو جائے تو اینٹ ہمیشہ تین نمبری لگا دیتے ہیں۔ اس کا ثبوت ہمارے سکول کی نئی نویلی عمارت ہے جو چھ ماہ بھی اپنے پاؤں پہ کھڑی نہ رہ سکی اور بنیاد میں پانی سرایت کر جانے سے سرک گئی۔ شکایت کی گئی تو ٹھیکیدار تو پیسے کھرے کر چکا تھا اور عمارت پاس ہو چکی تھی لیکن اوورسیئر صاحب نے جلدی جلدی جیب خرچ سے بھرتی کا کام نمٹا لیا مبادا چوری پکڑی نہ جا سکے۔ ایسی بے حسی اور بے ایمانی تو "ہائی برڈ" اجناس ہی جسم کی اجزائے ترکیبی میں مستقل شامل کرسکتی ہیں۔ اب کوئی مانے نہ مانے لیکن اس ضمن میں حقیقت سے آنکھیں چرانے میں بھی اسی ہائی برڈ کا ہاتھ لگتا ہے۔

جب کبھی اپنی طالب علمی کے دور کا موازنہ آج کے طالب علموں کے دور سے کرتا ہوں تو خود کو خاصے اونچے درجے پر پاتا ہوں، اگرچہ اس کا سہرا میری اپنی ذات سے زیادہ میرے اساتذہ اور والدین کے سر ہے۔ خدا کی پناہ ایک تو آج کل "مار نہیں پیار" کے نعرے نے طلباء کو شترِ بے مہار بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرا بدنسل خوراکوں نے اپنا کام دکھا دیا ہے۔ لاکھ نصیحتوں کی پٹاری کھول کر گھول دیں لیکن کتے کی دم ہے کہ سیدھی ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بعد میں نکالو تو ٹیڑھ جاتا نہیں۔ اب تو کئی ثبوت بھی دستیاب ہیں کہ بعض پرائیویٹ اداروں میں اسلام مخالف نصاب تک بزورِ شمشیر پڑھایا جارہا ہے اور ہم بے غیرت بن کر تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کرپا رہے ہیں ہیں، یعنی بے غیرت سؤر کے اثرات ہر خاص و عام میں ظاہر ہونے لگے ہیں چاہے مصلحِ دین ہو مبلغ ہو یا عام مسلمان۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ ترقی کے نام پر اخلاقی تنزلی اور انحطاطِ انسانیت بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔ دوسروں کا منہ لال دیکھ کر اپنے پنہ پر طمانچے مارنا چہ معنی دارد؟ سوچیے اور اگر نہیں سوچتے تو میری بلا سے، ٹھس بنے رہیے، بعدازاں اپنے خرچے پر پچھتا بھی لیجیے گا۔ میرا پیشہ تو معلمی ہے سو اپنے پیشے کے اخلاقی فرائض سے سبکدوش ہونا اپنا فرضِ اولین سمجھتا ہوں، یعنی عادت سے مجبور ہوں، اسے کسی سنکی کی بک بک سمجھ رہے ہیں تو آپ کی مرضی۔

گوہر رحمٰن گہر مردانوی کا تعلق ضلع مردان کی تحصیل تخت بھائی (لوند خوڑ) سے ہے۔ سرکاری ملازم ہیں۔ شاعری اور مضمون نگاری ان کا میدان ہے۔ مضامین میں لطافت اور طنز کا چھڑکاؤ ففٹی ففٹی ہوتا ہے۔ "ارمغانِ ابتسام" کے مستقل کرم فرما ہیں۔

ڈاکٹر عزیز فیصل

اور ہم چُپ ہی رہے

ہماری دادی جان بتارہی تھیں کہ جب ہم پیدا ہوئے تو فلسفیوں کی طرح سیریس تھے اور باتونی عورتوں کی طرح چپ چاپ تھے۔ سب رشتہ دار حیران ہی نہیں پریشان بھی تھے کہ یہ بچہ روتا کیوں نہیں۔ اب ہم کیا بتائیں کہ ہمیں رلانے کے لئے کون کونسے نسخے آزمائے گئے۔ ہماری ایک سوتیلی خالہ نے تو، بقول شخصے، ہمیں ایک زناٹے دار تھپڑ بھی رسید کیا جبکہ دیگر رشتے داروں نے بھی اسی شدت کے دیگر ہم پلہ ٹوٹکے آزمائے لیکن ہم پھر بھی چیخے نہ چلائے۔ سب کے سب جنگی حربے کم سنی ہی میں جوانوں کی طرح سہے اور چپ ہی رہے۔ اسی نہ رونے کی وجہ سے ہم پیدا ہوتے ہی مشہور ہوگئے۔ ہم نے کچھ بھی نہ کیا لیکن پھر بھی ہمارے نام کے ڈنکے بجنے لگے۔ ہماری لمبی چپ نے ہمیں لمحوں میں مقبول ہی نہیں، قابل رحم بھی بنا ڈالا۔ عزیز، رشتے دار، بہی خواہ سب کے سب نومولود کا نام پوچھنا بھول گئے اور ہمارے گھر آ کر یہی پوچھتے رہے، ''سناو جی بچہ رویا یا نہیں؟'' ہماری دادی جان رو رو کر سب سے کہتی رہیں، بس جی دعا کرو، دعا کرو۔ جس نے بھی یہ ماجرا سنا تو پیدائش کی مبارکباد دینے کی آڑ میں ہماری چپ پر تعزیت کرنے آ دھمکا۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ موبائیل فون کا زمانہ نہیں تھا ورنہ ہمارے مرحوم و مغفور والدین تو فون کالوں اور ایس ایم ایس کا جواب دیتے دیتے نڈھال ہو جاتے۔ اسی تعزیتی ماحول میں گھنٹوں بیت گئے اور ہم چپ کے چپ ہی رہے۔ ہماری چپ توڑنے کو کئی ہتھوڑا گروہ حرکت میں آ گئے۔ ہم مصیبت زدہ تھے ہی نہیں لیکن پھر بھی امدادی کاروائیوں کے مستحق ٹھہرے۔ کسی نے ہمیں کڑوی چیزیں کھلانے پلانے کو کہا تو کسی اور نے گلا ٹٹول کر ہماری ننھی سانسوں سے چھیڑ خوانی کی۔ کسی نے ہماری بند آنکھوں کو سکس بائی سکس کھول کر دیکھا تو کسی نے ہمارے پیٹ کا آنت بھر دباتے ہوئے طبی معائنہ کیا۔ ہماری سخت گیر دادی جان ہماری صحت یابی کی امید پر یہ ساری بدسلوکیاں خندہ پیشانی سے سہتی رہیں۔ یہ سفاک نسخے اور جان لیوا ٹونے دھرے کے دھرے

ہی رہے کیونکہ ہم تو پھر بھی چپ ہی رہے۔

ہمیں ہنسانے کی بجائے رلانے پر مائل یا قائل کرنے کو متعدد گھریلو ٹاسک کمیٹیاں بن گئیں۔ ہر کمیٹی کا سرغنہ رُلانے کی مختلف ترکیبوں پر کمیٹی اراکین سے آزمودہ نسخے طلب کرنے لگا۔ مرد وخواتین، بڑے بوڑھے، جوان اور بچے سر جوڑے اس مسئلہ کے حل پر غور کرنے لگے۔ پہلی اولاد نرینہ ہونا بھی کتنا مہنگا پڑ سکتا ہے اور محبت کا افراط "چوم چوم کر مارنے" کا پیش خیمہ بھی بن سکتا ہے لیکن اس کا ادراک ہمارے اس معصوم ذہن کو کیا ہوتا جسے مختلف نسخوں سے فرصت ہی نہیں مل رہی تھی۔ یہ علاج معالجہ اس لئے بھی بھیانک تھا کہ ہمیں بیک وقت متضاد حالتوں سے گزارا گیا۔ کسی نے برف سے ہماری آنکھوں کو ٹکورا تو کسی نے گرم ریت کو کپڑے میں رکھ کر ہمارے سر میں سرگرمی لانے کی کوشش کی۔ کسی نے ہمارے ننھے رخساروں کو دائیں بائیں سات اعشاریہ پانچ کی شدت کے جھٹکے دیئے تو کسی نے ہمیں کچھ دیر الٹا لٹکا کر اس کے اثرات کا مشاہدہ کیا۔ کسی نے ہماری آنکھوں کو گلیسرین سنگھائی تو کسی نے ہماری پلکوں کے پاس پیاز کاٹنے کا مظاہرہ کیا۔ کسی نے ہمیں دکھیارا سا گانا سنا ڈالا تو کسی نے ہمارے کانوں میں لطیفہ سنانے سے بھی دریغ نہیں کیا۔ کسی نے ہمارے کان مروڑے تو کسی نے ہمارے رخساروں پر بوسے دیئے۔ کسی شریر نے ہماری گدگدی کی تو کسی اور نے ہمیں "ہاؤ" کہہ کر ڈرانے کی کوشش کی لیکن ان سب کا نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات کیونکہ ہم سے ہو سکی نہ کوئی بات اور یہ سب تیر اندھیرے ہی میں چلتے رہے اور تباہ کن علاج معالجوں کے باوجود ہم چپ ہی رہے۔

ایک حکیم کو بھی ریسکیو کے طور پر بلایا گیا۔ ہماری "شامتِ معصومیت" کہ اس نے ہمیں گونگے بہرے بچوں کی قوت گویائی بحال کرنے والے قطرے پلا دیئے۔ ہم پر کوئی اثر نہ پڑا، چپ کے چپ ہی رہے۔ حکیم جی کو غصہ آ گیا۔ دادی جان ہم پر ہوتا غصہ برداشت نہ کر سکیں اور حکیم جی کو ڈانٹیں پلا کر وہاں سے چلتا کیا، اور اس بات کا عملی ثبوت دیا کہ دادیاں واقعی پوتوں سے دلی محبت کرتی ہیں۔

ایک ہومیو پیتھک ڈاکٹر کو بھی زحمت دی گئی۔ موصوف نے ننھی منی گولیوں والی کئی پٹاریاں کھولیں، سر کو کھجایا اور ہماری سنجیدہ شخصیت کا سرسری مشاہدہ کیا اور یہ کہتے ہوئے تیزی سے باہر چلا گیا کہ یہ بچہ نا قابل علاج ہے۔ ہماری دادی نے تو دھاڑیں مار مار کر آسمان سر پہ اٹھا لیا، بھلا ہو دادے جان کی بروقت ڈانٹ کا کہ جس نے دادی جان کو فوری طور پر چپ کرا دیا۔ ہم یہ سب تماشا دیکھتے رہ گئے لیکن لب ذرا سے بھی نہ ہلے اور ہم بدستور چپ ہی رہے۔

ہماری چپ نے جادو ٹونے پر یقین رکھنے والے رشتہ داروں کو بھی زبان دے دی۔ انھوں نے اس خاموشی کو جادو قرار دے دیا اور اسے کسی جن کی کارستانی کہنے لگے۔ دادا جان اور دادی جان بھی اس بہکاوے میں آگئے اور فوری طور پر ایک عامل کو بلانے کا حکم دے ڈالا۔ اب خاندان میں کس کی مجال کہ ان بزرگوں سے اختلاف کر سکے۔ ہمارے ابو امی اور دیگر پڑھے لکھے افراد خانہ بھی بادل ناخواستہ عامل بلانے پر آمادہ ہو گئے۔ عامل ایک چھ فٹا ادھیڑ عمر کا میلا کچیلا شخص تھا۔ اس نے سب خاندان کی موجودگی میں عجیب وغریب قسم کا منتر پڑھا اور اپنے نسوار زدہ منہ سے ایک تیز رفتار پھونک ہمارے معصوم منہ پر ماری تو نسوار کی بھینی بھینی خوشبو نے ہماری چیخیں نکال دیں اور اور ہم ڈر کے مارے ہڑ بڑا کر جاگ گئے۔ خواب بھی کیا کیا مناظر دکھا دیتے ہیں۔

> ڈاکٹر عزیز فیصل صاحب کا تعلق معلمی کے پیشہ سے ہے اور ایک خاصے تگڑے منصب پر فائز ہیں۔ تعلیم کے مضمون میں "پی ایچ ڈی" کر رکھی ہے۔ طنز ومزاح کے دلدادہ ہیں اور نعت وحمد کے بعد صرف اور صرف طنز ومزاح پر مبنی شاعری سے شغل فرماتے ہیں اور ہر خاص وعام سے سوشل میڈیا پر ہر روز ڈھیروں داد پاتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کی ایک کتاب "ہاسا خاسا" شائع ہو چکی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ مزاحیہ مضمون نگاری میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کے دیرینہ کرمفرما ہیں۔

نگران سیٹ اپ

مری بیگم بڑے ہی طیش میں ہے
بنی ہے گھر میں وہ طوفان بیگم
مذاقاً میں نے کل پوچھا تھا اُس سے
میں رکھ سکتا ہوں اک نگران بیگم؟

ڈاکٹر سید اقبال سعدیؔ

BILL یا BULL

بجلی نصف ہی دن آتی ہے
بل پر کُل کا کُل آتا ہے
نرخ بڑھے بجلی کے جب سے
Bill نہیں آتا Bulk آتا ہے

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

نذرِ ڈینگی

ڈیگیں ساری نذرِ ڈینگی ہوگئیں
کیا بتائیں اُن کے کیا تیور رہے
وصل کی شب واقعی ایسا ہوا
دولہا بھائی مارتے مچھر رہے

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

دُعا

اک ایم۔اے پاس، فارغ نوجواں، کل
دعا کرتا تھا یہ افطاری کھا کر
جنہیں تو نے دیئے ہیں تیس روزے
الٰہی اُن کو روزی بھی عطا کر

ڈاکٹر مظہرؔ عباس رضوی

قومی پالیسی

ہے وطن میرا اگرچہ جمہوری
بات اس میں نہیں ہے کچھ ایسی
اک طرح کی ہے اس کی پالیسی
یا تو آمر کی یا پھر امریکی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

جھرجھری

ہے نیت پر مدار سب کا سب
یوں وہ نیت کو بھانپ جاتی ہے
شیخ کی کثرتِ عبادت سے
حور جنت میں کانپ جاتی ہے

آشم پیرزادہ

فری فنڈ

مرے زخموں پہ مرہم لگ رہا ہے
رفو پھر سے گریباں ہو رہا ہے
مرے سب داغِ دل روشن ہیں آشم
فری فنڈ میں چراغاں ہو رہا ہے

آشم پیرزادہ

توبہ توبہ

تیری دیکھ کر شیخ مکاریوں کو
ہوئی ہے خجل لومڑی توبہ توبہ
کھلائی ہے افیونِ مذہب سبھی کو
یہ حرکت تری مولوی توبہ توبہ

آشم پیرزادہ

ایک مغرور سے

اتنا مت مغرور ہو، تو خود یہ دیکھ
شام اتنا صبح کو سمجھا گئی
بچ سکا ہے موت کے پنجوں سے کون
کیسے کیسے مرغ بلی کھا گئی

آشم پیرزادہ

جوئے وفا

نہیں ہے یہ جہاں رہنے کے قابل
تماشا ہے عجب یہ آب و گِل کا
کہیں جوئے وفا ملتی نہیں اب
کنستر میں لئے پھرتا ہوں دل کا

آشم پیرزادہ

حالِ چمن

آفت عجیب آئی ہے ہر سو جنابِ من
دیکھو جسے بھی اپنا وہ دابے ہوئے ہے دل
گلشن میں کچھ عجیب سی وحشت ہے ان دنوں
بلبل غنودگی میں ہے اور پھول مضمحل!

آثم پیرزادہ

دعوتِ مبارزت

غازی ہو تو اس ملک سے ہر ظلم مٹا دو
جو راہ میں آجاتے ہیں روڑے وہ ہٹا دو
جس ملک میں لڑکوں کو میسر نہ ہو دلہن
اُس ملک کو بہتر ہے پٹاخوں سے اُڑا دو

آثم پیرزادہ

عقل

عقل ہو گر تو یہ سمجھ نکتہ
آج پھر رکھ نظر نہ توکل پر
عقل تحفۂ ربِ اکبر ہے
عقل ملتی نہیں ہے گوگل پر

آثم پیرزادہ

بخیل

جس کا خالی ہو دل محبت سے
واقعی وہ بخیل ہوتا ہے
دل ہوا ہے ٹرمپ کی مانند
ہر جگہ یہ ذلیل ہوتا ہے

آثم پیرزادہ

قندیل بلوچ کا قتل

فیصلہ قاضی کرے گا قتل کا قندیل کے
"قاف" کا چکر ہے ظاہر "قاف" کی تکرار سے
مفتی قندیل ہیں روپوش کوہِ قاف میں
سر پہ ہے ٹوپی سلیمانی، وہ غائب ہو گئے

تنویر پھولؔ

اک ذرا احتیاط

پھولؔ نے تم سے پوچھا ہے یہ، سوچو یارو! کچھ فرماؤ
عید میں لازم کیا ہیں سویاں؟ اس کی سند تم ہم کو بتاؤ
روزہ رکھنا فرض ہے لیکن یارو! پکوڑا فرض نہیں ہے
پیٹ پکڑ کر دھم دھم ناچو، کس نے کہا تھا، مرچیں کھاؤ!

تنویر پھولؔ

سام سیاست

افطار پارٹی نہ یہاں دی ٹرمپ نے
کاٹو تم اُس کی ناک ، پکوڑا لگا دو واں
ری پبلکن تو ہاتھی ہے، اس کی ہے لمبی سونڈ
ڈیمو کریٹ خر ہے، وہ جھاڑے دولتیاں

تنویر پھولؔ

کارِ رذیل

مودی سے دوستی ہے کہ موذی سے دوستی؟
کیسا شریف جس کا یہ کارِ رذیل ہے!
"سمجھوتہ" میں جو مارے گئے، اُن پہ ہے خموش!
حُبِّ وطن کو چھوڑ کے یہ کیسی ڈیل ہے

تنویر پھولؔ

لوڈشیڈنگ

کام کرتی ہے تُو بجلی کی طرح ، بجلی ہے تُو
سر پہ تیرے میں ہوں رکھتی برق رفتاری کا تاج
مالکن نے یہ کہا تو جھٹ سے بولی خادمہ
لوڈشیڈنگ آج ہوگی ، روک دوں گی کام کاج

تنویر پھولؔ

کرسی کی چاہت

"تھوتھو" تو ہوئی ہم پہ مُودی کی محبت میں
کیا فرق پڑا لیکن اعلانِ شرافت میں!
جھنڈا تو شرافت کا ہم ہاتھ میں پکڑے ہیں
جو کچھ بھی کیا ہم نے بس کرسی کی چاہت میں

تنویر پھولؔ

شرکا تناسب

"سمجھوتہ" کے شہیدوں کو یکسر بھلا دیا!
مُودی کی چاہ بھر گئی قلبِ کثیف میں
کرسی کی بھوک حُبِّ وطن کو مٹا گئی
سو میں پچاسی 'شر' کا تناسب شریف میں

تنویر پھولؔ

غداری

مینڈکوں نے سر پہ ڈالا ممبئی کا واقعہ
حُبِّ مُودی کے نشے میں دیکھو کیا ٹرا گئے!
پھولؔ ! ناموسِ وطن کو کر دیا ہے تار تار
میر جعفر، میر صادق اِس وطن میں آگئے

تنویر پھولؔ

مودی کی چاہ

آتی نہیں ہے شرم وطن سے اُنہیں ذرا
جتنی تھی شرم، چھپ گئی وہ شرم گاہ میں!
غدار بن کے آہ! وہ پستی میں گر گئے
مُودی کی چاہ لے گئی ذلت کے چاہ میں

تنویر پھول

لٹیرے لیڈر

اے لیڈر! جھوٹے وعدوں سے تو قوم کو کیوں بہلاتا ہے
اب جب بھی بجلی جاتی ہے، ترا وعدہ یاد آجاتا ہے
کیوں مُلکی خزانہ لُوٹتا ہے؟، کب تک کھائے گا تو اُس کو
دنیا میں کب تک جینا ہے، وہ جاتا ہے جو آتا ہے

تنویر پھول

مفت کے مفتی

سب کے ذہنوں پر ہیں چھائے جُبّہ والے مُفتیان
لوگ خود کرتے ہیں پیدا مسئلوں پر مسئلے
ہم سے کروالو حلالہ، خواب میں بھی دی طلاق!
مُفت میں جو مشورے دیتے ہیں، وہ مُفتی ہوئے

تنویر پھول

پہاڑ کے نیچے

پریشاں ہیں سیاستداں ہمارے
مقابل آگیا ہے سخت اِن سے
اڑنگی پر اڑنگی دے رہا ہے
کبڈی کھیلتا ہے وقت اِن سے

نوید ظفر کیانی

مقرر

خوش قسمتی سے دورِ الیکشن پھر آ گیا
اِک مہرباں نے مجھے بُک کر لیا شتاب
پہلے بسوں میں بیچتا پھرتا تھا گولیاں
اب انتخابی جلسوں سے کرتا ہوں میں خطاب

نوید ظفر کیانی

عذر

میں نے جب اُس سے کہا کہ آپ پر مرتا ہوں میں
دل لگی کرنے لگی ظالم مرے مقسوم سے
ہنس کے بولی میری الفت تو ہے زندوں کے لئے
دل لگا سکتی ہوں کیسے میں کسی مرحوم سے؟

نوید ظفر کیانی

آثار کہہ رہے ہیں

کہاں جائیں گے ہم غریب عید کو
یہ مہنگائی کیا چاند چڑھائے گی
مجھے تو یقیں ہو چلا ہے ظفؔر
قیامت کسی عید کو آئے گی

نوید ظفؔر کیانی

عیدی

آپ کے بچوں کی یہ فوجِ ظفر موجِ ظفؔر
آپ کی یاری کے ناطے مرا مقدور بھی ہے
عید کا دن ہے، اسی طور کما لیں عیدی
"رسمِ دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے"

نوید ظفؔر کیانی

نئی دعا

کروں گا خلعتِ مردانگی کیا
بس اتنا کر مری قسمت جگا دے
دعا حسبِ زمانہ ہے خدایا!!
سیاستدان کی بیٹی بنا دے

نوید ظفؔر کیانی

نیک مشورہ

انا پرستوں کے در پر حقیر کیا ہونا
اِس اعتبار سے اُس کا اسیر کیا ہونا
وہ نہ ملے تو کسی دوسری کو فون کرو
وفا کی بند گلی کے فقیر کیا ہونا

نوید ظفؔر کیانی

عالمِ نامرادی

دل کراچی سے بڑا بیزار ہے
پھر بھی ہے مجبور، ہل سکتا نہیں
کیا کرے کہ ڈوب مرنے کے لئے
چلو بھر پانی بھی مل سکتا نہیں

نوید ظفؔر کیانی

عجلت پسندی

ہو گیا ہے آج کا انسان کیا عجلت پسند
ہر روایت انگلیاں دانتوں میں دابے رہ گئی
فرقتوں میں ہائے ہائے کی فراغت ہے کسے
داستانِ عشق تو اب ہائے ہائے رہ گئی

نوید ظفؔر کیانی

مزاحیہ شعری اصناف

محمد عارف

یہ مضمون ''مزاحیہ غزل کے خدوخال'' مطبوعہ نیشنل بک فاؤنڈیشن سے لیا گیا ہے۔

مزاحیہ شاعری نے اپنی ابتدا سے اب تک بہ تدریج ترقی کر کے ایک ایسا مقام حاصل کر لیا ہے، جس کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں۔ شاعری میں طنز و مزاح کو مزاح گو شعرا کے ساتھ ساتھ سنجیدہ شعرا نے بھی موضوعِ سخن بنایا، اسی باعث بہ لحاظِ ہیئت جو اصنافِ سخن سنجیدہ شاعری میں مروّج رہیں ان میں سے اکثر مزاحیہ شاعری میں بھی رواج پا گئیں۔ اردو شعری اصناف کی تین اقسام ہیں:

۱۔ بہ لحاظ ہیئت
۲۔ بہ لحاظ موضوع
۳۔ بہ لحاظ ہیئت و موضوع

ہیئت سے مراد اندازِ بیاں کی وہ فنی اور تکنیکی خصوصیات ہیں جو کسی شعری تخلیق کی شناخت بن جائیں، جیسے قطعہ، رباعی، غزل وغیرہ۔ ایسی اصناف جو اپنے موضوع کی انفرادیت کے باعث پہچانی جاتی ہوں موضوعی اصناف کہلاتی ہیں جیسے حمد، نعت، سلام۔ مزاحیہ شاعری میں موضوعی اصناف نہیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مزاحیہ شاعری خود اردو شاعری کی ایک صنف ہے۔

دلاور فگار کے مطابق:

''طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو سنجیدہ شاعری سے الگ ایک فن یا صنفِ سخن غلط سمجھا جاتا ہے۔ دراصل طنز و مزاح نگاری صرف ایک رنگِ سخن ہے۔۔۔'' [۱]

ڈاکٹر اشفاق احمد ورک لکھتے ہیں:

''طنز و مزاح کوئی باقاعدہ صنفِ ادب نہیں بل کہ ایک رجحان اور رویے کا نام ہے۔'' [۲]

تیسری صنف ہیئتی و موضوعاتی ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری کی صرف ایک قسم ''ریختی'' ہیئتی و موضوعاتی ہے، جو متروک ہو چکی ہے۔

بہ لحاظ ہیئت مزاحیہ شعری اصناف

اکثر مزاح گو شعرا نے مزاحیہ شاعری میں قطعہ، نظم اور غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی دیگر اصناف کی طرف بھی توجہ دی، یہی وجہ ہے کہ اردو مزاحیہ شاعری میں مختلف اصناف کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ بہ لحاظ ہیئت سنجیدہ شاعری کی زیادہ تر اصناف مزاحیہ شاعری میں بھی ملتی ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل تو اِکا دُکا شاعر ہی اس میدان میں آئے، جب کہ قیامِ پاکستان کے بعد بہت سے شعرا کلی طور پر اس جانب راغب ہوئے تو مزاحیہ

شاعری کو عروج اور پذیرائی ملی اور اس کی الگ سے شناخت ممکن ہوئی۔ ازاں بعد ریڈیو، ٹی۔ وی اور مختلف تنظیموں کے قومی اور بین الاقوامی سطح کے مشاعرے بھی مزاحیہ شاعری کے فروغ میں مددگار ثابت ہوئے۔ بقول ڈاکٹر انعام الحق جاوید:

''موجودہ دور یعنی ۱۹۸۰ء کے بعد کا دور مزاحیہ شاعری کے لیے بالخصوص بہت سازگار ثابت ہوا۔ اس دوران نہ صرف ملکی سطح پر مزاحیہ مشاعروں کا باقاعدہ آغاز ہوا، بل کہ ریڈیو اور ٹی وی سے کل پاکستان مزاحیہ مشاعروں کے علاوہ دبئی میں ڈاکٹر اظہر زیدی نے عالمی مزاحیہ مشاعروں کی داغ بیل ڈالی۔ جس کے باعث نہ صرف چھپے ہوئے مزاح گو شعرا دریافت ہوئے بل کہ نئے لکھنے والوں کو بھی تحریک ہوئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج غزل، نظم، ہائیکو، نثری نظم حتیٰ کہ ہر ہیئت میں طنزیہ و مزاحیہ کام سامنے آ رہا ہے۔'' [۳]

اردو کا طنزیہ و مزاحیہ شعری سرمایہ غزل، قطعہ، رباعی، نظم پابند، نظم آزاد، نظمِ معریٰ، مربع، مخمس، مسدس، ترکیب بند، ترجیع بند، مثلث، ہائیکو، پیروڈی، لرک، منظوم ڈراما / ڈرامائی نظمیں، ریختی وغیرہ کی اصناف میں موجود ہے۔ یہ اصناف اندازِ بیاں کی فنی تکنیکی و ہیئتی خصوصیات کی بدولت دیگر اصناف سے الگ اور ممتاز ہیں۔

(۱) غزل

غزل کے لغوی معنی ہیں ''عورتوں سے باتیں کرنا۔'' شعری اصطلاح میں غزل سے مراد کسی بھی بحر میں ایسے اشعار کا مجموعہ ہے جس میں ہر شعر ایک مکمل بات یا خیال کی ترجمانی کرتا ہو۔ غزل کے ذریعے انسانی احساسات اور جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ غزل میں کوئی عنوان نہیں ہوتا، اس کا پہلا شعر مطلع اور آخری شعر مقطع کہلاتا ہے۔ اس میں تشبیہ، استعارہ، مبالغہ، صنعتِ تضاد اور دیگر صفات و صنائع استعمال کیے جاتے ہیں۔

مزاحیہ شاعری کی جدید روش کا آغاز ''اودھ پنچ'' سے ہوا۔ ''اودھ پنچ'' سے اب تک مزاح نگاروں نے تقریباً تمام اصناف میں مزاحیہ شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں تاہم شروع سے لے کر موجودہ دور تک مزاح گو شعرا کی اکثریت قطعہ، نظم اور غزل کی صورت میں اظہارِ خیال کرتی رہی ہے۔ مزاحیہ غزل ایک مشکل صنفِ سخن ہے، اس کے باوجود مزاح گو شعرا کے ہاں اس کے ایسے نمونے ملتے ہیں جو سنجیدہ غزل کے قریب قریب دکھائی دیتے ہیں۔ مزاحیہ غزل کی مشکل پسندی کے بارے میں انور مسعود لکھتے ہیں کہ:

''میرے خیال میں مزاح میں سب سے مشکل چیز غزل گوئی ہے۔ اس لیے کہ غزل کا ہر شعر باہمہ ہونے کے باوصف اپنی یکتائی کا طالب بھی ہوتا ہے۔'' [۴]

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

''غزل اور بالخصوص مزاحیہ غزل بڑی ریاضت مانگتی ہے، اس لیے کہ ہر شعر یہاں نئے مضمون کے علاوہ شگفتگی کا نیا پیرایہ بھی مانگتا ہے۔ پھر تغزل کی اپنی کچھ نزاکتیں ہیں۔ غزل میں شعر بہ شعر سفر جب تک ہرن کی خوب صورت چوکڑیوں کی طرح نہ ہو، لطف پیدا نہیں ہوتا۔'' [۵]

ان کی اپنی مزاحیہ غزلیات تغزل کے اس معیار پر پوری اترتی ہیں، جیسے:

میرے پانی میں ملا اور ذرا سا پانی
میری عادت ہے کہ پیتا ہوں میں پتلا پانی

اللہ اللہ صفائی سے وہ رغبت اس کی
اُس نے حقے کا کئی سال نہ بدلا پانی

مجھ کو شوگر بھی ہے اور پاسِ شریعت بھی ہے
میری قسمت میں نہ میٹھا ہے نہ کڑوا پانی

چائے ہی چائے بدن میں ہے لہو کے بدلے
دوڑتا اب ہے رگوں میں یہی پتلا پانی

میں نے اک فلسفی اس فکر میں ڈوبا دیکھا

ہوتا کس طرح کا ہوتا جو نہ گیلا پانی
کس قرینے سے گلی آپ نے کی ہے تعمیر
گھس گیا سارے مکانوں میں گلی کا پانی
اتنی اچھی بھی نہیں اتنی سماجی تنقید
بند ہو جائے نہ انور ترا حقہ پانی

انور مسعود

(۲) قطعہ

دو یا دو سے زائد ایسے مسلسل اشعار جن میں ایک ہی خیال یا مسلسل خیال ہو قطعہ کہلاتے ہیں۔قطعہ میں پہلے شعر کا مطلع ہونا ضروری نہیں تاہم پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں قافیہ کا آجانا عیب بھی نہیں،ماسوائے رباعی کی بحر کے قطعہ کسی بھی بحر میں ہوسکتا ہے۔قطعہ میں مضمون یا موضوع کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔

مزاحیہ شاعری میں قطعہ نگاری اکثر مزاح گو شعرا کے ہاں ملتی ہے۔بل کہ چار مصرعوں کا قطعہ تو آج کی مزاحیہ شاعری کا ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے ہر اچھا مزاح گو شاعر مسلح ہوتا ہے۔بقول انور مسعود:

> ''قطعہ۔۔۔ایک سانس کی صنفِ سخن ہے۔اس کا تقاضا ہے کہ سانس نہ اکھڑے۔اس لیے یہ تنگنی کوشش بڑی ریاضت مانگتی ہے۔''[۶]

مزاحیہ شاعری میں زیادہ تر قطعات اکبر الہ آبادی کے ہاں ملتے ہیں کہ

> ''اکبر الہ آبادی نے خصوصاً اس طرف توجہ کی، ان کی ظریفانہ شاعری کا زیادہ حصہ قطعات ہی کی صورت میں ہے۔''[۷]

آج مزاح گو شاعر کے ہاں جو قطعات ملتے ہیں جن میں سے بیش تر چار مصرعوں پر مشتمل ہیں۔دو قطعات ملاحظہ ہوں:

حلقے کا نقاد

ہر ورق فلسفے کا کھولے گا
نثر پرکھے گا شعر تولے گا
آ گیا ہے جو آج حلقے میں
کچھ نہ کچھ تو ضرور بولے گا

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

ڈی۔این۔اے

کہہ گیا ہم سے اک مزے کی بات
ماہرِ علمِ ''سائیکالوجی''
باپ پر ہو جو شکل تو مولود
صاحبو! یہ تو ہے ''بیالوجی''
اور اگر نقش مختلف سا ہو
اس کو کہتے ہیں ''سوشیالوجی''

سرفراز شاہد

(۳) رباعی

چار مصرعوں اور مخصوص اوزان کی ایسی شعری صنف جس میں پہلا،دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوں (تیسرے مصرع میں قافیہ کا آجانا بھی کوئی عیب نہیں ہے) رُباعی کہلاتی ہے۔رباعی کو ترانہ یا دوبیتی بھی کہتے ہیں۔قطعہ کی طرح رباعی میں بھی مضمون یا موضوع کی کوئی قید نہیں ہے تاہم رباعی صرف ایک ہی وزن پر کہی جاتی ہے جب کہ اس ایک وزن میں اس کے ۲۴ زحاف ہیں۔رباعی انتہائی مشکل صنفِ شعر ہے اور اس کی مشکل پسندی کا باعث اس کے زحاف ہیں۔بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی:

> ''رباعی اپنی نوعیت وخصوصیات کی بنا پر ایک مشکل صنفِ سخن ہے۔''[۸]

رباعی کا وزن ''لَا حَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ'' سے ماخوذ ہے۔اس وزن کے ۲۴ زحاف ہیں اور ایک رباعی اپنے ۲۴ زحاف میں سے کسی بھی وزن پر ہوسکتی ہے۔اکثر رباعی کے چاروں مصرعے مختلف زحاف پر بھی ہوتے ہیں۔کوئی شعر یا مصرع تو کجا رباعی کی لطافت ونزاکت کسی ایک غیر فصیح،بے محل اور غیر مانوس لفظ کی بھی متحمل نہیں ہوسکتی۔

رباعی کی مشکل پسندی کے باعث سنجیدہ شاعری میں بھی

اساتذہ اور چند شعرا کے ہاں ہی اس کا استعمال ملتا ہے۔ مزاح گو شعرا کے کلام میں رباعیات خال خال ملتی ہیں۔ باقاعدہ طور پر طنزیہ و مزاحیہ رباعیات اکبرالہٰ آبادی، جوش ملیح آبادی اور رئیس امروہی کے کلام میں دستیاب ہیں۔ دو مثالیں دیکھئے:

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پیچ
اور شیخ کے گھر میں بیچ گانے کی ہے پیچ
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجیے
گو اس میں بھی صبح نہانے کی ہے پیچ

اکبرالہٰ آبادی

زاہد نے نمازوں میں چھپائی دل کی
حوروں سے توجہ نہ ہٹائی دل کی
سجدوں پہ جو کم بخت نے ڈالا پردہ
ماتھے پہ ابھر آئی سیاہی دل کی

جوش ملیح آبادی

(۴) نظم پابند

کسی بھی موضوع پر ایک بحر میں کہی جانے والی نظم، پابند نظم کہلاتی ہے۔ اس قسم کی نظم میں غزل کی طرح ایک ہی قافیہ ردیف پوری نظم میں بھی ہو سکتا ہے اور ہر شعر میں الگ قافیہ ردیف بھی۔ مثنوی، قصیدہ اور قطعات پابند نظم کی مثالیں ہیں۔ ظریفانہ شاعری میں قطعہ اور غزل کے ساتھ ساتھ اکثر شعرا کے ہاں پابند نظمیں ملتی ہیں۔ ایک پابند نظم دیکھئے:

رشوت

اک ایسی آمدن بھی ہے جسے بالائی کہتے ہیں
جو اس کو ہضم کر لے اس کو حاتم طائی کہتے ہیں
جسے بالائی سے چڑ ہو اسے سودائی کہتے ہیں
اُگل دے جو اسے کھا کر اسے ہرجائی کہتے ہیں
ریاکاری کو سب اہلِ شکم دانائی کہتے ہیں
اگر کھاتے ہیں پربت بھی تو اس کو رائی کہتے ہیں
کسی پٹھو کی جب جبراً ریٹائرمنٹ ہوتی ہے
تو بالائی کی حاجت ''ہنڈرڈ پرسنٹ'' ہوتی ہے
مقدمہ اس پہ چل جائے تو پھر ارجنٹ ہوتی ہے
سزا ہو جائے تو یہ آکسیجن ٹینٹ ہوتی ہے
سزائے با مشقت کو ستم آرائی کہتے ہیں
گدھے کو باپ کہتے ہیں شتر کو بھائی کہتے ہیں

پروفیسر محمد طہٰ خان

(۵) آزاد نظم

ایسی بے قافیہ، بے ردیف نظم جس کی بنیاد تو ایک ہی بحر پر ہو، لیکن اس کے مصرعوں کی طوالت شاعر کی صوابدید پر ہو آزاد نظم کہلاتی ہے۔ مزاحیہ شاعری میں اس صنفِ سخن کے نمونے کم ملتے ہیں۔ اس نظم میں آہنگ اور صوتی تاثر کا خیال رکھتے ہوئے اگر کہیں کہیں قافیہ و ردیف بھی لائے جائیں تو اس کی تاثیر بڑھ جاتی ہے۔ ایک آزاد نظم ملاحظہ کیجیے:

ایک نظم

چٹیں لکھتے تھے جب اخبار میں ہم
تو مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
سنا ہے کیا کہا انگور نے آلو بخارا سے
''بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا''
یہ بھینسیں، آہ یہ بھینسیں
ہوا میں تیرتے ہیں قہقہے جن کی جگالی کے
مرے کمرے کی تنہائی میں اکثر آنکلتی ہیں
لیے شبنم کی چادر اور کفن نرگس کے باوا کا
کہا سوسن نے مچھر سے
کہ میری روح کا نغمہ میرے صندوق میں ہوگا
میں بھول آیا ہوں گھا چابیوں کا آج دفتر میں
جو امرت سر سے اپنے مجھ کو حصہ آپ دے دیتے
کسی کا کیا بگڑ جاتا مرا لاہور ہو جاتا

چراغ حسن حسرت

ایک سمت سے ایک گروپ کے قائد نے نعرہ لگایا "ہاتھ کو۔۔۔" تو اسی وقت دوسری طرف سے ایک ٹکڑی کے لیڈر نے صدا لگائی "توڑ دو، توڑ دو" تب پہلے والے نعرے کا اُس گروپ نے جواب دیا "ووٹ دو، ووٹ دو" مشرق سے صدا بلند ہوئی "نفرت کی دیوار کو۔۔۔" ٹھیک اُسی وقت مغربی کنارے سے آواز آئی "مضبوط کرو، مضبوط کرو" مشرق کی صدا کا جواب دینے والوں نے اپنے ساتھی کے نعرے کو یوں مکمل کیا "گرادو، گرادو"۔ مضبوط کرو، مضبوط کرو، کے جواب میں مشرقی ٹولے نے پکارا "ٹوٹتے رشتوں کو"۔ کسی نے اپنے دوست سے سرگوشی میں کہا "کیا میاں ہمارے نعروں میں بھی اتحاد عنقا ہے"۔ جیسے ہی اعلان کیا گیا کہ چیف منسٹر صاحب پرانے شہر کے پرانے شہریوں کو سپاس نامہ پیش کرنے والے ہیں تو پھر ایک بار نعروں سے فضا گونج اُٹھی۔ چیف منسٹر صاحب نے ڈائس پر آتے ہی خطاب شروع کر دیا۔ ان کا چہرہ پسینہ سے بھیگ چکا تھا۔ وہ بے چین اور گھبرائے گھبرائے سے لگتے تھے۔ انھوں نے کہنا شروع کیا "کھواتین و حجرات! میں یہ جان کر بہت کھوش ہوں کہ آپ نے مجھے عجت بکشی۔ آپ سب بھی مجھے یہاں، آپ کے شہر میں دیکھ کر بہت کھوش لگ رہے ہیں۔ آپ بھی کوش ہم بھی کھوش اور کھدا بھی کھوش۔ اسی موکھے (موقعہ) پر مجھے ایک بال صاحب کا شعر یاد آتا ہے۔

کھودی کو کر بلند اتنا کہ کھدا
بندے سے کھود پوچھے بتا تیری رجا کیا ہے

سپاس نامہ از وحید اشرف

(۶) نظمِ معریٰ

اس نظم میں وزن اور بحر تو ہوتی ہے لیکن قافیہ و ردیف کا اہتمام نہیں ہوتا۔ اس نظم کے تمام مصرعے بہ اعتبار وزن یکساں ہوتے ہیں۔ اسے غیر مقفیٰ نظم بھی کہتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔ سیّد ضمیر جعفری کی ایک معریٰ نظم دیکھیے:

شُتر مرغ

روس ہو یا امریکا ہو
ان سے ہر اک سائنس لے
ورنہ تیری مانگ غلط
ان مرغوں کی بانگ درست
ان مرغوں کی ٹانگ غلط

سیّد ضمیر جعفری

(۷) مربع

مربع ایک ایسی نظم ہوتی ہے جس کا ہر بند چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے، کبھی چاروں مصرعے آپس میں ہم قافیہ و ہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں اور کبھی صرف دوسرا اور چوتھا۔ مزاح گو شعرا نے اس ہیئت سے استفادہ کرتے ہوئے اس میں عمدہ نمونے پیش کیے ہیں۔ جیسے یہ نظم:

یار کے خراٹے

عجب صورت سے ٹوٹے ہیں شبِ ہجراں کے سناٹے
محبت جاگتی ہے اور صنم بھرتا ہے خراٹے
جوانی کی سلگتی رات کوئی کس طرح کاٹے
کہاں تک آدمی سوئی ہوئی قسمت کا منہ چاٹے

کبھی نتھنوں میں چڑیا چہچہاتی اور پھڑکتی ہے
کبھی بادل گرجتا ہے کبھی بجلی کڑکتی ہے
ابھی سیٹی بجی تھی لیجیے گاڑی کھڑکتی ہے
ذرا چھیڑو تو پھر یہ آگ تیزی سے بھڑکتی ہے

قیامت ہیں بھری برسات کی بھیگی ہوئی راتیں
یہاں پر حسن کا عالم، کہیں سر ہے کہیں لاتیں
بچارا ناک ہی کرتا ہے ہم سے پیار کی باتیں
برستی ہوں کسی پتھر زمیں پر جیسے برساتیں

نفس کے تار پر جاری ہے ان کا نغمۂ ہستی
جگائیں تو زبردستی، ذرا چھو لیں تو خرمستی
مسلسل دیکھ کر جذبات کی مایوس کن پستی
اُجڑ جاتی ہے ارمانوں کی جیتی جاگتی بستی

کبھی میں اس پہ ہنس جاؤں کبھی میں اس پہ رو جاؤں
ہے خدشہ صبح ہونے تک کہیں پاگل نہ ہو جاؤں
عجب کیا ہے کہ اس طوفان کی تندی میں کھو جاؤں

محبت ہی محبت میں ابد کی نیند سو جاؤں

نذیر احمد شیخ

(۸) مخمس

اس نظم کا ہر بند پانچ مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کی دو قسمیں ہیں۔پہلی صورت میں پہلے بند کے پانچوں مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف یا صرف ہم قافیہ ہوتے ہیں، جب کہ باقی ماندہ بندوں میں سے ہر بند کے پہلے چار مصرعے آپس میں اور پانچواں مصرع قافیہ وردیف میں پہلے بند کا تابع ہوتا ہے۔نظیر اکبر آبادی کی مخمس ''آدمی نامہ'' کے چند بند دیکھئے:

آدمی نامہ

دنیا میں بادشا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار ، بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں
بنتے ہیں آدمی ہی ، امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی ، قرآن اور نماز یاں
اور آدمی ہی اُن کی چراتے ہیں جوتیاں
جو اُن کو تاڑتا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

یاں آدمی نقیب ہو ، بولے ہے بار بار
اور آدمی ہی پیادے ہیں ، اور آدمی سوار
حقہ ، صراحی ، جوتیاں ، دوڑیں بغل میں مار
کاندھے پہ رکھ کے پالکی ، ہیں آدمی کہار
اور اس پہ جو چڑھا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مرنے میں آدمی ہی ، کفن کرتے ہیں تیار
نہلا دھلا اٹھاتے ہیں ، کاندھے پہ کر سوار
کلمہ بھی پڑھتے جاتے ہیں،روتے ہیں زار زار
سب آدمی ہی کرتے ہیں ، مردے کا کاروبار
اور وہ جو مر گیا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

اشراف اور کمینے سے ، لے شاہ تا وزیر
ہیں آدمی ہی صاحب عزت بھی اور حقیر
یاں آدمی مرید ہیں اور آدمی ہی پیر
اچھا بھی آدمی ہی کہاتا ہے اے نظیر
اور سب میں جو برا ہے ، سو ہے وہ بھی آدمی

نظیر اکبر آبادی

دوسری صورت میں ہر بند کے پہلے تین مصرعوں کے ردیف و قوافی آپس میں جب کہ باقی دو مصرعوں کے قافیہ وردیف یا صرف قافیہ ایک جیسے اور پہلے بند کے تابع ہوتے ہیں۔مثال دیکھئے:

زمیندار بس

ٹھسا ٹھس مسافر بھرے جا رہے ہیں
ہوا کیا جو گھٹ کر مرے جا رہے ہیں
تجوری میں پیسے کھرے جا رہے ہیں
یہ سروس زراہِ ہوس چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے

ہے وقت کی کوئی توہین کب تک
مسافر رہیں گے گھڑی بین کب تک
یہ بولا چلے گی یہ بے دین کب تک
وہ بولا کہ اگلے برس چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے

جھکولوں سے جب کارواں جھولتا ہے
مسافر مسافر کا منہ چومتا ہے
پھنسا پیر سوتا ہے سر گھومتا ہے
دبی نبض ساکت ہے نس چل رہی ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے

جہاں قید ہے اک زنانی سواری
وہاں ایک حضرت پہ ہے وجد طاری
ذرا ٹانگ دیکھو کدھر ہے پیاری
کہ جوتے سے جوتی کی مس چل رہی ہے

زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے
بیاباں میں انجن ہوا فیل آخر
مشقت کی خاطر کھلی جیل آخر
دھکم پیل ثابت ہوئی کھیل آخر
نہ ٹھُس چل رہی ہے نہ ٹھُس چل رہی
ہے
زمیندار بستی کی بس چل رہی ہے
نذیر احمد شیخ

(۹) مسدس

چھ مصرعوں کے بند پر مشتمل ایسی نظم جس کے پہلے چار مصرعے ہم قافیہ وہم ردیف یا صرف مقفیٰ اور باقی دو جداگانہ قافیہ وردیف کے حامل ہوتے ہیں۔ سنجیدہ شعرا کی طرح مزاح گو شعرا میں بھی مسدس کی صنفِ سخن بہت مرغوب ہے۔ انیس ودبیر نے اس صنف کو مرثیہ میں جب کہ جدید نظم نگاروں نے نظم کے لیے استعمال کیا۔ مزاحیہ شاعری میں نظیر اکبرآبادی سے لے کر انور مسعود تک مسدس کی ہیئت میں اچھی نظمیں ملتی ہیں۔ مسدس کی ہیئت میں نظم ملاحظہ کیجیے:

بجلی بند ہے

میں کراچی سے چلا تھا جب، تو بجلی بند تھی
کھل گئی سکھر میں زلفِ شب، تو بجلی بند تھی
آ گیا پنڈی بہ فضلِ رب تو بجلی بند تھی
جب پشاور آ گئے ہیں سب تو بجلی بند تھی
چوں کہ میری شاعری سے تیرگی ہوتی ہے دور
میں جہاں جاتا ہوں بجلی بند ہوتی ہے ضرور

ہے ایڈیٹر کا نیا آزار بجلی بند ہے
نیوز ریڈر ہو گیا بے کار بجلی بند ہے
ٹھپ ہے اخباروں کا کاروبار بجلی بند ہے
کون لکھے سرخیِ اخبار بجلی بند ہے
کیا لکھے کاتب غزل جب پورا مطلع صاف ہے
ہیڈ لائن کیا لگائے، مین لائن آف ہے

شعر اندھیرے میں کسی مضمون سے ٹکرا گیا
آپریٹر اپنے ٹیلی فون سے ٹکرا گیا
ایک احمق ایک افلاطون سے ٹکرا گیا
ایک جنٹل مین اک خاتون سے ٹکرا گیا
گھپ اندھیرے میں دلِ ناداں بہت مبہوت ہے
تو اگر آیا تو چیخوں گا کہ پکڑو بھوت ہے

چادرِ ظلمت میں پوری زندگی روپوش ہے
ہوش میں بیمارِ غم ہے ڈاکٹر بے ہوش ہے
وہ اندھیرا ہے کہ کچھوا رہبرِ خرگوش ہے
چپ لگی ہے ٹی۔ وی کو اور ریڈیو خاموش ہے
وادیٔ صحرا تو کیا میدان میں بجلی نہیں
حد یہ ہے اس نازنیں کے کان میں بجلی نہیں
دلاور فگار

(۱۰) ترکیب بند

ترکیب بند ایک سے زائد بندوں پر مشتمل نظم ہوتی ہے۔ یہ نظم کی کوئی الگ قسم نہیں ہے۔ بعض ترکیب بند نظموں کے بند پانچ یا چھ سے زائد مصرعوں پر مشتمل مثنوی یا غزل کی ہیئت میں ہوتے ہیں لیکن دونوں صورتوں میں ہر بند کے آخری دو مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوں گے۔ بند میں اشعار کی تعداد کے حوالے سے اس کی دو قسمیں ہیں، ایک جس نظم کے ہر بند میں اشعار کی تعداد ایک سی ہوتی ہے اور دوسری جس کے ہر بند میں اشعار کی تعداد کم وبیش ہوتی ہے۔ پانچ مصرعوں کے بند پر مشتمل نظم مخمس ترکیب بند جب کہ چھ مصرعوں والی مسدس ترکیب بند نظم کہلاتی ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری میں اس کی مثال تقریباً ہر مزاح گو شاعر کے ہاں مل جاتی ہے۔

(۱۱) ترجیع بند

ترجیع بند میں ایک ہی شعر یا مصرع کو ہر بند کے آخر میں دہرایا جاتا ہے۔ اسے ٹیپ کا شعر یا مصرع کہتے ہیں۔ مزاحیہ نظم نگاری

میں بہت اچھی ترجیع بند نظمیں ملتی ہیں، جیسے سیّد ضمیر جعفری کی ''مسز ولیم''، سرفراز شاہد کی ''جہاں سلطانہ پڑھتی تھی''، ڈاکٹر انعام الحق کی ''ہما خانم'' وغیرہ۔ ترجیع بند کی مثال دیکھئے:

ہما خانم

ہما خانم کھلے دل کی کھری انسان ہے یارو
بہت پتلی سہی لیکن بہت گنجان ہے یارو
دلوں کی سلطنت کی آخری سلطان ہے یارو
کہ پورا مرد بلکہ مرد کیا مردان ہے یارو
ہما خانم کھلے دل کی کھری انسان ہے یارو

محلے بھر کے لڑکے اس کو خالہ جان کہتے ہیں
مگر ہیں چٹ سرے جتنے وہ خالی جان کہتے ہیں
اٹک سے پار والے صرف یو قربان کہتے ہیں
ہما خانم نہیں کہتے ہیں خانم خان کہتے ہیں
کہ میڈم خود بھی پوری گل محمد خان ہے یارو
ہما خانم کھلے دل کی کھری انسان ہے یارو

پٹھانوں کے لیے مرغوب ہے نسوار کی صورت
ہے پنجابی کو وارث شاہ کے شہکار کی صورت
اگر سندھی یا بلوچی ملیں سردار کی صورت
تو اطلاقی ہے یہ کافر ادا کفار کی صورت
پراک اردو ''سپیکنگ'' کے لیے یہ پان ہے یارو
ہما خانم کھلے دل کی کھری انسان ہے یارو

ابھی امسال اک بابے نے اس کو حج کرایا ہے
اور اس کے بعد لندن اور پیرس بھی گھمایا ہے
یہ بابا جس کے سر پر ایک اسمگلر کا سایہ ہے
حقیقت میں کسی فلمی اداکارہ کا تایا ہے
جو ہیروئن کے کاروبار میں غلطان ہے یارو
ہما خانم کھلے دل کی کھری انسان ہے یارو

ڈاکٹر انعام الحق جاوید

(۱۲) مثلث

مثلث ایسی نظم ہے جس کا ہر بند تین مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلے بند کے تین مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف یا صرف مقفیٰ، جب کہ آئندہ بندوں میں پہلے دو مصرعے آپس میں مقفیٰ اور مردف اور تیسرا مصرع قافیہ و ردیف میں پہلے بند کی پیروی کرتا ہے۔ نظم کی یہ قسم مزاحیہ شاعری میں کم یاب ہے، مثال ملاحظہ کیجیے:

اب تو یاری کا ہی پردہ رہ گیا ہے انحصار
جس کو تو حاسد ہے اس کا، جو ہو حاسد تیرا یار
واسطے اللہ کے ہو دوستی، وہ اب کہاں

جنگ جب تک تھی بتوں سے نام تھا اللہ کا
اب تو ہر اک ہے مجاور اک الگ درگاہ کا
واسطے اللہ کے ہو دوستی، وہ اب کہاں

ہاں تجارت اور پالیٹکس میں دیکھیں جو سود
چند روزہ متفق ہوں ورنہ اے شیخ و ہنود
واسطے اللہ کے ہو دوستی، وہ اب کہاں

اکبرالہٰ آبادی

اکبر کی یہ نظم ہے تو مثلث کی ہیئت میں لیکن مثلث کی مکمل تعریف پر پورا نہیں اترتی کہ اس کے مصرعوں کی ترتیب ''ااا، ب ب ا، ج ج ا'' تو ہے لیکن تیسرا مصرع اسی طرح دہرایا جا رہا ہے جب کہ مثلث کی تعریف کی رو سے یہ مصرع تبدیل اور اس کا قافیہ پہلے بند کے تابع ہونا چاہیے۔

(۱۳) ہائیکو

تین مصرعوں پر مشتمل اس جاپانی صنفِ سخن کے نمونے سنجیدہ اور مزاحیہ شاعری دونوں میں ملتے ہیں۔ سنجیدہ اور مزاح گو شاعر نسیم سحر نے مزاح میں اس صنفِ سخن کو ''ہنسائیکو'' کا نام دیا ہے۔ اس کا معروف وزن ''فعلن فعلن فع رفعلن فعلن فعلن فع رفعلن فعلن فع'' ہے۔ بقول ڈاکٹر محمد امین ''اردو میں اس کے دو اوزان مروج ہیں۔

فاعلاتن مفاعلن فعلن (تین بار)
فعلن فعلن فع رفعلن فعلن فعلن فع رفعلن فعلن فع'' [۹]

ہائیکو کی ایک مثال دیکھیے:

کیسے ہوں گی چار
آنکھیں اس کی آنکھوں سے
بھینگا اپنا یار

نسیم سحر

(۱۴) پیروڈی

طنز و مزاح میں ''پیروڈی'' بطور مزاح کے حربہ کے بھی مستعمل ہے اور بہ حیثیتِ صنف بھی۔ اردو میں اس کے لیے تحریف نگاری کی ترکیب استعمال کی جاتی ہے جو کہ اس کے مفہوم کو پوری طرح ادا نہیں کرتی۔ ''ڈکشنری آف ورلڈ لٹریچر'' کے مطابق الفاظ کی تبدیلی اور کمی بیشی، کسی فن پارے کے انداز و اسلوب کی نقل یا موضوع اور ہیئت کی نقل سے پیروڈی کی جا سکتی ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اس صنف میں جدت تو ہوتی ہے لیکن اوریجنل خیال یا اسلوب نہیں ہوتا۔ اردو ادب کے آغاز سے ہی اس کے نقوش ملتے ہیں اور طنز و مزاح کے شعری و نثری سرمائے میں اس کی عمدہ مثالیں دستیاب ہیں، تاہم پیروڈی جہاں مزاح نگاری کے بنیادی حربوں میں سے ہے وہیں اس کے بہت زیادہ استعمال سے ظریفانہ شاعری متاثر بھی ہوئی ہے۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

> ''ضرورت سے زیادہ پیروڈی اپنانے سے بھی مزاحیہ شاعری کی وسعت و رفعت میں رخنہ پڑا۔۔۔۔ موضوع کی تلاش کے سلسلے میں یہی صورت آسان نظر آتی ہے کہ کسی بڑے شاعر کی کسی نظم یا غزل کو سامنے رکھ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ مقصد کچھ ہو یا نہ ہو، ہنسی تو بہ ہر حال آئے گی۔'' [۱۰]

اردو کی مزاحیہ شاعری میں غزلیات، نظموں اور فرد اشعار کی کامیاب پیروڈی کی مثالیں بھی کافی تعداد میں دستیاب ہیں۔ مزاحیہ شاعری کے آغاز میں تربھون ناتھ ہجر، سرشار، اکبر اور ازاں بعد پروفیسر عاشق محمد، سیّد محمد جعفری، مجید لاہوری، راجہ مہدی علی خان، خضر تمیمی، فرقت کاکوروی، نذیر احمد شیخ، مسٹر دہلوی، حاجی لق لق، دلاور فگار، سیّد ضمیر جعفری، انور مسعود، پروفیسر ظ خان، سرفراز شاہد، ڈاکٹر انعام الحق جاوید اور ضیاء الحق قاسمی قابلِ ذکر ہیں۔ فیض احمد فیض کی نظم ''تنہائی'' کی تحریف بہ عنوان ''لگائی'' ملاحظہ ہو:

لگائی

فون پھر آیا دلِ زار! نہیں فون نہیں
سائیکل ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرد چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامنِ افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے کو ہی واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

کنہیا لال کپور

(۱۵) لمرک

لمرک پانچ مصرعوں پر مشتمل ایسی خاص نظم ہے جس کے تیسرے اور چوتھے مصرعے باقی تین مصرعوں سے چھوٹے اور آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں، جب کہ باقی تین مصرعے آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ یہ انگریزی صنفِ سخن مکمل پلاٹ رکھتی اور ہمیشہ ظریفانہ یا مزاحیہ ہوتی ہے۔ نذیر احمد شیخ نے اردو مزاحیہ شاعری میں اس کو متعارف کرایا اور لمرک سازی کا قاعدہ بھی بیان کیا۔ نذیر احمد شیخ کے کلام سے لمرک کی مثالیں دیکھیے:

لمرک

یارو اپنے پلے باندھو یہ تمثیل
فعلن فعلن فعلن فعلن بالتفصیل
چھوٹی کر دو اب گردان
یعنی کاٹو اس کے کان

لمبی "تنک" سے کرلو لرک کی تکمیل

فیملی پلاننگ

فرصت میں جنجوعن سے جنجوعہ
پوچھا کرتے بچوں کا مجموعہ
اک دن سن کر آٹھ
حضرت سمجھے ساٹھ
اس دن سے منکوحہ ہے ممنوعہ

(۱۶) منظوم ڈراما/ڈرامائی نظمیں

منظوم ڈراما ایسی صنفِ سخن ہے، جس میں مکالمات کو بذریعہ "اشعار" سامعین کے سامنے سٹیج پر پیش کیا جاتا ہے۔ اس لیے ایک ڈراما نگار قارئین کے بجائے سامعین سے مخاطب ہوتا ہے۔ اردو مزاحیہ شاعری میں منظوم مزاحیہ ڈرامے کی باقاعدہ روایت تو کوئی نہیں لیکن اس کے باوجود بعض شعرا کی مکالماتی نظمیں جنھیں ڈرامائی نظمیں بھی کہا جاسکتا ہے اس صنف کے قریب کی مثالیں ہیں۔ جیسے زاہد فخری کی درج ذیل نظم میں کرداروں سمیت منظوم مزاحیہ ڈرامے کے تقریباً تمام عناصر موجود ہیں:

محبت کر کے بھی دیکھا

شوہر

تجھے کشمیر سمجھا تھا مگر تھرپارکر نکلا
نہ اماں تیری افسر ہیں، نہ ابا ڈاکٹر نکلا
ترے اس حسن کے پیچھے بیوٹی پارلر نکلا
میں نیلے لینز میں ڈوبا تو جا کر کاشغر نکلا
نہ جھمکے تیرے اصلی ہیں نہ اصلی تیرا کوکا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

بیگم

امارت کا ہر اک دعویٰ ترا بیکار ہی نکلا
وزیروں میں کوئی انکل نہ کوئی یار ہی نکلا
نہ انکم ٹیکس میں کوئی بھی رشتہ دار ہی نکلا
نہ کوئی جاب ہے تیری نہ کاروبار ہی نکلا
پلازہ جس کو کہتے تھے وہ اک چھوٹا سا کھوکھا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

شوہر

تری رنگین دنیا بھی فقط اک پوسٹر نکلا
جسے اوون میں سمجھا تھا وہ خالی ٹوسٹر نکلا
منسٹر ریلوے ماموں سٹیشن ماسٹر نکلا
ترے میکے سے جو آیا مرا گھر لوٹ کر نکلا
تری اک آپا خیرن ہے ترا اک ویر شوکا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

بیگم

تری لمبی اُڑانیں ہیں یہ سارا جھوٹ ہی نکلا
شکاگو میں دُکانیں ہیں یہ سارا جھوٹ ہی نکلا
بڑی لندن میں شانیں ہیں یہ سارا جھوٹ ہی نکلا
تری سونے کی کانیں ہیں یہ سارا جھوٹ ہی نکلا
مرے پر کاٹنے والے تو بندہ ہے کہ ٹوکا ہے
محبت کر کے بھی دیکھا محبت میں بھی دھوکا ہے

شوہر

چلو یہ بھول کر باتیں، منائیں عید کی خوشیاں
دلوں سے غم نکالیں اور بسائیں عید کی خوشیاں

بیگم

ہم اپنی مسکراہٹ سے بڑھائیں عید کی خوشیاں
پکاتی ہوں کلیجی میں اُڑائیں عید کی خوشیاں
چلو میں مان لیتی ہوں کہ نقلی میرا کوکا ہے

شوہر

نہیں جاناں یہ اصلی ہے مری نظروں کا دھوکا ہے

زاہد فخری

(۱۷) ریختی

ریختی مردوں کے ذریعہ عورتوں کی مخصوص زبان، محاورے اور روز مرہ میں عورتوں کے باہمی معاملات اور جنسی جذبات کے

اظہار پر مبنی شاعری ہے۔ یہ غزل کی ہیئت میں انیسویں صدی میں لکھنؤ کے مخصوص ثقافتی ماحول کی پیداوار تھی۔ ریختی اردو ظریفانہ شاعری کی واحد ہیئتی و موضوعاتی اور مزاح کی پست قسم ہے۔ میراں ہاشمی بیجا پوری، سعادت یار رنگین، انشاء، جان صاحب، نازنین، عنقا بیگم، عصمت، قیس وغیرہ اس طرزِ سخن کے اہم نمائندے ہیں۔ ریختی کے چند نمونے دیکھئے:

مجھے پکڑے ہیں نی چھوڑ دا دیکھو ہانک ماروں گی

خدا کی سوں میں کہتی ہوں بڑی بو کو پکاروں گی

سیّد میراں ہاشمی

ٹھیک ہیں مونڈھے تو اس کرتی کے لیکن اتنا

تنگ ہوتا ہے گلے میں سے گریبان دوا

قیس

تھام تھام اپنے کو رکھتی ہوں بہت سا لیکن

کیا کہوں تھم نہیں سکتا مرا اندر والا

انشاء

کروں میں کہاں تک مدارات روز

تمھیں چاہیے ہے وہی بات روز

رنگین

مر جائے یا جیے کوئی جُوتی سے آپ کی

ہے رات دن فقط تمھیں اس کام سے غرض

جان صاحب

دن چڑھے پر بھی دبو چے ہی پڑا رہتا ہے

رات بھر ہے وہی بات اور وہی چُوما چاٹی

نازنین

کہاں تھی رات کو چندو نہ اس گھر میں نہ اُس گھر میں

ترا عاشق تجھے دونوں جگہ جا کر پکار آیا

بیگم

اردو مزاحیہ شاعری کی منسوخ و مروج یہ تقریباً سترہ ہیئتیں ہیں جب کہ آج کی زیادہ تر مزاحیہ شاعری نظم کی مخصوص ہیئتوں (مربع، مخمس، مسدس، آزاد اور پابند) کے ساتھ غزل اور قطعہ کی ہیئت میں ملتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ دلاور فگار، چراغِ خنداں، کراچی، المسلم پبلشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۹

۲۔ اشفاق احمد ورک، ڈاکٹر، اردو نثر میں طنز و مزاح، لاہور، بیت الحکمت، ۲۰۰۳ء، ص ۴۲

۳۔ انعام الحق جاوید، ڈاکٹر، گلہائے تبسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص ۲۶

۴۔ انور مسعود، شاخِ تبسم، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص ۱۸۷

۵۔ ایضاً، ص ۲۲۶، ۲۲۷

۶۔ انور مسعود، قطعہ کلامی، اسلام آباد، دوست پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص ۹

۷۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو شاعری کا فنی ارتقاء، لاہور، الوقار پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۳۱۲

۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصنافِ ادب، لاہور، سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء، ص ۸۲

۹۔ محمد امین، ڈاکٹر، آسان عروض، لاہور، بکن بکس، اشاعتِ دوم ۲۰۱۲ء، ص ۵۲

۱۰۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے، لاہور، فیروز سنز لمیٹڈ، ۱۹۸۸ء، ص ۱۴

محمد عارف کا تعلق واہ کینٹ سے ہے۔ موصوف درس و تدریس سے وابستہ ہیں۔ اُردو ادب میں ایم فل کر رکھا ہے، جس میں پیش کردہ مقالہ ''مزاحیہ غزل کے خدوخال'' کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ موصوف ایک بہت عمدہ مزاحیہ شاعر ہیں اور تقریباً الیکٹرنک میڈیا کے ہر مزاحیہ مشاعرے میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں چلبلاہٹ اور شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے دیرینہ اور مستقل مزاجی سے لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ذہنی و نفسیاتی امراض

اگرچہ ذہنی، نفسیاتی، اور دماغی بیماریوں کو ایک ہی تصور کیا جاتا ہے کہ تمام بیماریوں کی جنم بھومی حضرت دماغ ہی ہیں مگر سائنسدانوں نے ان بیماریوں کی تدوین و ترتیب میں بہت سے عوامل کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ان کی درجہ بندی کی ہے۔ اسی لئے ان بیماریوں کے معالجین میں بھی فرق ہے۔ اکثر لوگ اس بات سے بے خبر ہیں کہ نیورولوجسٹ، سایکالوجسٹ، سایکاٹرسٹ، نیوروسرجن اور نیوروفزیشن، اگرچہ دماغ سے متعلق امراض ہی دیکھتے ہیں مگر ان کی بیماریاں اور بیمار علیحدہ ہوتے ہیں۔ ان باتوں کا سادہ لوح مریض کو پتہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہمارے ملک میں جس قسم کا مریض بھی جس طرح کے معالج کے ہتھے چڑھ جائے وہ اسے نہیں چھوڑتا اور اس پر اپنا علاج آزمانا شروع کردیتا ہے۔ میری پریکٹس میں ایک عورت مجھے فیس دے کر صرف یہ پوچھنے آئی تھی کہ وہ دماغ سے متعلق کس ڈاکٹر سے رجوع کرے۔ اس کا مسئلہ نیوروفزیشین کا تھا جب کہ مختلف اقسام کے نیوروسرجن اور سایکاٹرسٹ اسے ایک سال سے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض اپنی بیماری کو ذہنی بیماری نہیں سمجھتا اور بار بار ڈاکٹر کے سمجھانے کے باوجود ماہر نفسیات کو نہیں دکھاتا کیونکہ ہمارے یہاں لوگ نفسیاتی بیماریوں کو پاگل پن تصور کرتے ہیں:

جستجو ہم کو شفاء کی کیا بتائیں کب سے ہے
ایک مدت سے علاج اپنا ہے یاں جاری میاں
کچھ نہیں آتا سمجھ تو آپ کہتے ہیں یہی
کیجئے مت وہم، ہے یہ ذہنی بیماری میاں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ماہرِ نفسیات

نفسیات کا ایک پروفیسر مختلف مواقع پر انسانی رویوں کی وضاحت کر رہا تھا۔ لیکچر دیتے ہوئے اس نے کہا کہ "وہ آدمی جو غلطی پر ہو اور ہار مان لے عقل مند ہوتا ہے، اور وہ آدمی جو درست موقف رکھنے کے باوجود ہار مان لے۔۔۔"

شاگرد بات کاٹ کر کھٹ سے بولا "جناب ایسے شخص کو خاوند کہا جاتا ہے۔"

ماہرِ نفسیات یا سائیکالوجسٹ باقاعدہ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا یعنی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس ڈگری اس کے پاس نہیں ہوتی (اگرچہ شعبۂ نفسیات کی بنیاد ایک ایم بی بی ایس ڈاکٹر فرائیڈ جنہیں بابائے نفسیات کہا جاتا ہے نے ہی رکھی) سائیکالوجسٹ مریضوں کی ذہنی الجھنوں اور پریشانیوں کو دور کرنے کے لئے ڈاکٹروں کے بالعموم اور سائیکاٹرسٹوں کے بالخصوص مشورے پر مریضوں کا دواؤں کے بجائے مختلف تھیراپیز کے ذریعے علاج کرتا ہے

باتوں سے دور کرتے ہیں سارے تفکرات
نسخوں میں لکھتے ہی وہ نہیں کوئی ادویات
کر دیتے ہیں علاج جو باتوں ہی باتوں میں
دے ایسے نفسیات کے ماہر کو کون مات

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نفسیاتی مریض

یوں تو نفسیاتی مریضوں کے وارڈ اور نفسیاتی امراض کے ہسپتالوں میں نفسیاتی مریضوں کی بھرمار نظر آتی ہی ہے لیکن اگر ہم اپنے تباہ حال معاشرے کا بغور مشاہدہ کریں تو یہ تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ کیا عوام اور کیا لیڈر سب کا ایک ہی سا حال نظر آتا ہے:

یہ جو لیڈر یہاں ہمارے ہیں
سب چھچھورے ہیں، سب ادھارے ہیں
ویسے اِک دوجے کو پکارے ہیں
نفسیاتی مریض سارے ہیں

روبینہ شاہین بیناؔ

حافظہ

ڈاکٹر نے ایک روز اپنے مریض سے پوچھا کہ "جو میں آپ کو یاداشت بہتر کرنے کی دوائیاں دے رہا ہوں ان کا آپ کو کتنا فائدہ ہوا؟"

مریض کہنے لگا "جی ہاں اب مجھے یہ یاد رہنے لگا ہے کہ میں کچھ نہ کچھ بھول رہا ہوں۔"

مشہور ہے کہ کہیں دو ڈاکٹر آپس میں محو گفتگو تھے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا "جن مریضوں کا قوت حافظہ کمزور ہو آپ اس کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔"

دوسرے ڈاکٹر نے بلا تامل جواب دیا ''میں ان سے اپنا بل پہلے وصول کرلیتا ہوں۔''

شعور، لاشعور اور تحت الشعور کا شور نفسیات کے ایوانوں میں بہت سنائی دیتا ہے جبکہ مزاحیہ شاعر بے شعور انسانوں کو شعور کی منزلوں کی طرف دھکیلتا رہتا ہے۔ذہن کی بھول بھلیاں ،یاداشت کی راہداریاں،حافظے کے سمندر کی گہرائیاں انسانی نفسیات میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہیں ۔سنجیدہ شاعری میں یاد ماضی کے ضمن میں ہزاروں اشعار لکھے جاسکتے ہیں۔مرزا غالب نے ایک ہی شعر میں یہ صورتحال بیان فرمادی ہے ؎

یادِ ماضی عذاب ہے یارب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

مرزا اسد اللہ غالب

اور اسی بات کو مزاحیہ شاعر جب محسوس کرتا ہے تو یوں دل مسوس کر رہ جاتا ہے ؎

اسے بھلا کے مرے سر میں درد رہنے لگا
وہ پھانس بن کے مرے لاشعور میں اٹکا

اطہر شاہ خان جیدی

ایسا تھا مرا حافظہ نسیان سے پہلے
کرتا میں پہن لیتا تھا بنیان سے پہلے

ڈاکٹر نعیم مشتاق

بعض ایسے بھی مہرباں ہیں جنہیں
یاد سے بھول جانا ہوتا ہے

نوید ظفر کیانی

وہمی مریض

وہم اک ایسی بیماری ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں ۔ obsessive compulsive disorder یعنی OCD بھی ایک وہمی بیماری ہے جس میں مریض کو بار بار یہ محسوس ہوتا ہے کہ شائد وہ صاف ستھرے نہیں ۔ایسے مریض اپنے ہاتھ بار بار دھوتے ہیں۔

چیزیں بار بار پاک کرتے ہیں،اور متواتر ایسی حرکات کرتے چلے جاتے ہیں۔ ادریس قریشی کو یہ نظم لکھتے ہوئے اس بات کی خبر تو نہیں تھی کہ اس بیماری کا نام کیا ہے مگر ایک ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ وہ یہ عادت بہت سے لوگوں میں دیکھ چکے تھے اور انہیں دور حاضر کے ایک ممتاز مزاح گو شاعر بھی اس بیماری کا شکار نظر آئے۔

صفائی پسند بیگم

مری بیگم نہایت صاف ستھری ہے
وہ خود تو صاف رہتی ہے
مجھے بھی صاف رکھتی ہے
وہ دن میں پانچ سو پچپن دفعہ تو ہاتھ دھوتی ہے
وہ جب ہاتھوں کو دھوتی ہے
اگر ہو اس کے بس میں تو وہ پانی کو بھی دھو ڈالے
وہ جس نالی میں پانی جائے اس نالی کو دھوتی ہے
مگر اس سے دوبارہ اس کے گندے ہاتھ ہوتے ہیں
دوبارہ ہاتھ دھوتی ہے
وہ پھر ہاتھوں سے پہلے صابن اور ٹونٹی کو دھوتی ہے
اگر میں تنگ آ کر اس سے کچھ کہہ دوں تو مت پوچھو
وہ دھو کر ہاتھ میرے پیچھے پڑ جاتی ہے
اور پھر مجھ کو دھوتی ہے

ادریس قریشی

اپنی اس احتیاط کے ہاتھوں
روز جیتا ہے روز مرتا ہے
پہلے جگ اور گلاس دھوتا تھا
اب وہ پانی بھی دھو کے پیتا ہے

محمد عارف

ADHD کی بیماری

ذہنی بیماریوں میں ایک قسم کی بیماری کو ADHD کہا جاتا ہے۔اس کا شکار عام طور پر بچے ہی ہوتے ہیں مگر بڑی عمر کے مریضوں میں بھی یہ مرض دیکھا جا سکتا ہے۔اس کی کئی اقسام ہیں مگر سب میں کچھ خصوصیات مشترک پائی جاتی ہیں جن میں بے توجہی، حد سے زیادہ چلبلا پن اور ٹک کر نہ بیٹھنا،اور نتیجہ کے

بارے میں بغیر سوچے کوئی سا بھی کام سرانجام دینا،شامل ہیں۔ ان بچوں کو کبھی کبھی صرف شرارتی کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے جب کہ یہ اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں جس کا شافی علاج موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک عورت کسی ماہر نفسیات کے پاس اپنے دس سالہ بچے کو دکھانے گئی ۔ ماہر نفسیات نے پوچھا کہ آپ کا یہ بچہ کہیں اپنے گردو پیش اور ماحول میں خود کو غیر محفوظ تو نہیں سمجھتا۔ خاتون بولی" پتہ نہیں،! مگر ایک بات میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کی موجودگی میں آس پاس اور محلے کے لوگ خود کو بہت غیر محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔زیر نظر نظم میں ڈاکٹر مظہر عباس نے مرض کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس بیماری کا نقشہ کھینچا ہے:

یہ کوئی بچہ ہے یا۔۔۔

برق سی بھر دی خدا نے گویا جان و تن میں ہے
بے سکوں سے اس کو چڑ ہر لحظہ یہ ایکشن میں ہے
یوں رواں ہے جیسے طوفانی گھٹا ساون میں ہے
ماہر کرتب ہے ایسا طاق اپنے فن میں ہے
پاؤں برتن میں ہیں الجھے، ہاتھ بھی سالن میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

گویا سرکس سے ہو آیا، ایسے ہیں بچے کے ڈھنگ
گھر کے سارے بوڑھے بچے عورتیں ہیں اس سے تنگ
حشر کی ہیں ساعتیں ، گھر بن گیا میدانِ جنگ
کرسیاں اُلٹی پڑی ہیں ، سجدہ کرتے ہیں پلنگ
ایسی پھرتی کب بھلا دیکھی کسی ناگن میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

روح رہتی ہے بدن میں اس کے ہر دم بے قرار
صبر سے ہے بیٹھنا مشکل ، کھڑا ہو بار بار
اپنی باری کا نہیں کرتا ہے ہرگز انتظار
بات پوری سُن نہیں سکتا کبھی یہ ہونہار
پوچھنے سے پہلے ہی کہہ دیتا ہے جو کچھ من میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

پاؤں میں چکر ہے اس کے اس قدر ہیں تیزیاں
ہیں ہلاکت خیز اس کی چار سو چنگیزیاں
مانگے شیطاں بھی اماں وہ ہیں شرارت خیزیاں
باتیں سچی ہیں نہیں ہیں یہ سخن آمیزیاں
قلب کے اس کو سکوں تو "تک دھنا دھن دھن" میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

کب یہ دیتا ہے توجہ سنتا ہے کب پوری بات
ایک ہلچل سی مچی ہے مضطرب ہے اس کی ذات
تیز اتنا ہے کہ دے رفتار میں راکٹ کو مات
زندگی کی اس کا "موٹو" گھونسا مکا اور لات

راز جس کا آشکارا ہاتھ کی سوجن میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے
مرتکز رہتی نہیں اس کی توجہ ایک پل
یہ چلاتا ہے سخن کے کھیت میں باتوں کا حل
ہے زباں قینچی ، ذہن راکٹ ، مشینی ہر عمل
بات اس کی ہوتی ہے اکثر ہی بے موقع محل
جسم ہے گر شہر میں تو ذہن اس کا بن میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے
زندگی طوفان ہے ہر سمت ہے اک "کھڑ بڑی"
چین کی لگتا ہے مشکل سے ہی اب آئے گھڑی
زیر لب کرتے ہیں اکثر لوگ یہ ہی "بڑبڑی"
کچھ تو ہے ماحول میں اور کچھ ہے اندر "گڑبڑی"
چاک کیسا زندگی یہ تیرے پیراہن میں ہے
یہ کوئی بچہ ہے یا پسٹن کسی انجن میں ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آٹزم

آٹزم ایک ایسی دماغی بیماری ہے جس میں بچے اپنے احساسات و جذبات دوسروں تک نہیں پہنچا سکتے اور نہ ہی انہیں دوسروں کے احساسات سے دلچسپی ہوتی ہے۔ یہ اک طرح کا communication disorder ہے جس میں بہت سے بچے ساری زندگی بول بھی نہیں سکتے۔ یہ نظمیں اگرچہ مزاح کے زمرے میں نہیں آتیں مگر نفسیاتی بیماریاں ان کے ذکر کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہیں۔ آٹزم پر نظم ملاحظہ فرمایئے۔

بے زبان محبت (ماں کا دکھ)

تمہیں مجھ سے محبت ہے مجھے معلوم ہے لیکن
محبت لفظ کے ملبوں میں تم دے نہیں سکتے
پتہ تو ہے مجھے لیکن، میں پھر بھی منتظر ہوں
گوش بر آواز ہوں کب سے
صدا وہ ماماما کی، فضاؤں میں کہیں گُم ہے
نہ ہو آواز تو کیا تال سُر ہے، کیا ترنم ہے
مگر میں منتظر ہوں تم صدا کو روپ کب دو گے
ٹھٹھرتی زندگی کی دوپہر کو دھوپ کب دو گے
رہوں گی منتظر میں کب دریچے لب کے کھولو گے
سمے وہ آئے گا کس دن کہ جب تم مجھ سے بولو گے
بِتا دوں گی تگ و دو میں یہ ساری زندگی اپنی
کبھی تو تھرتھرائے گی یہ لو شمع محبت کی

ڈاکٹر مظہر عباس

بچے کا عزم (باپ سے مکالمہ)

تھام کے میرا ہاتھ چلو
بابا میرے ساتھ چلو
انجانے سے رستے پر، دل ہو جاتا ہے مضطر
لمس تمہارا پاتا ہوں، خوف کو دور بھگاتا ہوں
دن ہو یا ہو رات چلو
بابا میرے ساتھ چلو
کیسے میں نے جینا ہے، تم سے ہی سب سیکھنا ہے
گو میں ہوں کچھ آہستہ، ساتھ تمہارے دوڑنا ہے
مانو میری بات چلو
بابا میرے ساتھ چلو
لفظ نہیں گو پاس مرے، زندہ ہیں احساس مرے
جیسی سب کی دنیا ہے، میری بھی اک دنیا ہے
مست اگر میں رہتا ہوں، دنیا کو کیا کہتا ہوں

پھول کھلیں گے ہستی ہیں، میرے من کی بستی میں
آئی ہے برسات چلو
بابا میرے ساتھ چلو
پڑھ نہیں سکتا ہوں گرچہ، چہروں کی سب تحریریں
سوچ سمجھ تو سکتا ہوں، گو نہ کروں میں تقریریں
کبھی تو بالآخر ہوں گے، روشن امکانات چلو
بابا میرے ساتھ چلو
رستہ گرچہ مشکل ہے، دل چلنے پر مائل ہے
ہمت مت ہارو بابا، زیست کا یہ ہی حاصل ہے
لے کر یہ سوغات چلو
بابا میرے ساتھ چلو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ڈیڑھ سو شعروں کی غزلیں تو بہت سی لکھ دیں
ہم کو ابلاغ کا رستہ نہیں ملتا پھر بھی

نوید ظفر کیانی

فوبیا

کسی قسم کے حادثاتی موقع پر تھوڑی بہت بے چینی تو ایک عام مشاہدہ ہے۔ مگر بعض اوقات یہ جب حد سے بڑھ جائے تو مرض بن جاتی ہے۔ یہ مرض مختلف طریقوں سے مریض میں نظر آتا ہے۔ کسی کو اونچائی سے خوف آتا ہے تو کوئی بند جگہوں سے بہت زیادہ خوف محسوس کرنے لگتا ہے۔ شادی شدہ شخص بیچارہ بیوی اور ساس کے خوف میں ایسا جتلا ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات ساری زندگی اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔

کوئی علاج تو اس کا بھی ہوا ے چارہ گرو
بہت ہے پھیل چکا ساس فوبیا اب تک

پاگل پن

نفسیاتی بیماریوں کی انتہا پاگل پن ہے۔ مگر یہاں تو ذرا سی بھی طبیعت کے خلاف بات کو پاگل پن سمجھ لیا جاتا ہے۔ پاگل پن یا psyhcosis ایک قابل علاج بیماری ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ
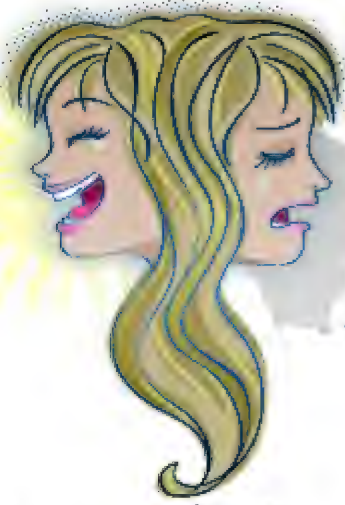
پاگل خانوں میں بند پاگلوں سے کہیں زیادہ تعداد آپ کو اس معاشرے میں چلتے پھرتے اُن لوگوں کی نظر آئے گی جو بظاہر آپ کو ہوش مند نظر آئیں گے مگر ان کی حرکتیں پاگلوں سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ تبھی تو وقتِ مرگ ایک وکیل صاحب نے اپنے دوست کو وصیت لکھوائی کہ میرے بعد میری تمام جائیداد پاگلوں میں تقسیم کر دینا۔

دوست حیرت سے بولا "صرف پاگلوں میں کیوں؟"
وکیل صاحب نحیف آواز میں بولے "اس لئے کہ یہ ساری دولت مجھے پاگلوں ہی سے تو ملی ہے!"

جو یہاں بے ہوش ہے کہتے ہیں اس کو ہوش مند
ہم اسے پاگل سمجھتے ہیں جسے کچھ ہوش ہے

وکیل اظہر فاروقی

پاگل نہیں (نظم)

کیوں لٹائیں دل، جگر، پاگل نہیں
آپ کے عاشق ہیں پر پاگل نہیں
لڑ رہے ہیں جو اسمبلی میں حضور
ہیں ذرا بس کم نظر، پاگل نہیں
یہ فقط اک شوہرِ لاچار ہیں
ان سے تُو ہرگز نہ ڈر، پاگل نہیں

قرض دیتے ہیں کہ لیں گے دس گنا
یہ ہمارے بینکر پاگل نہیں
کیوں پڑھادیں سارا کچھ اسکول میں
آج کل کے ماسٹر پاگل نہیں
شارٹ کٹ ہے کون سا امریکہ تک
جانتے ہیں راہبر ، پاگل نہیں
عشق نے جن کا کیا خانہ خراب
شہر کے ہیں معتبر ، پاگل نہیں
بس کھڑی ہو اور چلتے جائیں جو
کیا کہیں اُن کو اگر پاگل نہیں
"خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو"
کہہ گئے غالب مگر پاگل نہیں
سائیکیٹرسٹوں سے گھبراتے ہو کیوں
پاگلوں کے ڈاکٹر پاگل نہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نفسیات کے ماہر کی بیوی نے ایک روز اپنے شوہر سے پوچھا "میں نے سنا ہے کہ چاندنی راتوں میں پاگل پن بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔اس میں کتنی صداقت ہے؟"

ماہر نفسیات سر کھجاتے ہوئے بولا "میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔تمھیں تو یاد ہی ہوگا کہ وہ ایک حسین چاندنی رات ہی تھی جب میں نے تمھیں شادی کی پیشکش کی تھی۔"

اسی طرح ایک اور ماہر نفسیات اپنے مریض سے پوچھنے لگا "اگر میں تمہارے دونوں کان کاٹ دوں تو کیا ہوگا۔"

مریض بولا "مجھے ہر چیز دھندلی نظر آئے گی۔"

"کیا مطلب؟" ماہر نفسیات حیرانی سے بولا "میں کچھ سمجھ نہیں سکا؟"

"بات دراصل یہ ہے!" مریض سکون سے بولا "کہ کیونکہ کان کٹنے کے بعد میری عینک گر جائے گی لہٰذا میں صحیح طرح نہ دیکھ پاؤں گا اور اس طرح مجھے دھندلا نظر آئے گا۔کیا سمجھے ڈاکٹر صاحب۔"

مشہور مزاحیہ شاعر اطہر شاہ خان جیدی بھی اپنی پاگل غزل میں ایک صاحب کے اسی طرح کے خیالات پر روشنی ڈالتے نظر آتے ہیں:

پاگل غزل

کھڑے کھڑے مسکرا رہا ہوں تو میری مرضی
لطیفہ خود کو سنا رہا ہوں تو میری مرضی
میں جلد بازی میں کوٹ الٹا پہن کے نکلا
اب آ رہا ہوں کہ جا رہا ہوں تو میری مرضی
جو تم ہو مہمان تو کیوں نہ آئے مٹھائی لے کر
بٹھا کے تم کو اٹھا رہا ہوں تو میری مرضی
یہ کیوں ہے سایہ تمہاری دیوار کا مرے گھر
میں جھاڑو دے کر ہٹا رہا ہوں تو میری مرضی
رقیب کی قبر میں پٹاخے بھی رکھ دیے ہیں
جو قبل دوزخ ڈرا رہا ہوں تو میری مرضی
جو رات کے دو بجے ہیں تم کو شکایتیں کیوں
کہ میری چھت ہے، میں گا رہا ہوں تو میری مرضی
میں نادہندہ ہوں بنک تک جانتے ہیں جیدی
تمہارا قرضہ بھی کھا رہا ہوں تو میری مرضی

اطہر شاہ خان جیدی

نشہ بازی

نشے نے کردیا ہے اسے کم بہت ہی کم
"ورنہ سفر حیات کا بے حد طویل تھا"

ممتاز راشد

نشہ بازی ایک ایسی لعنت ہے جو جیتے جی انسان کو موت کی دہلیز تک لے آتی ہے۔جب انسان دنیا کی تلخ حقیقتوں سے راہ فرار اختیار کرنا چاہتا ہے تو اکثر قوت ارادی کی کمزوری کے سبب وہ نشہ بازی کا شکار ہوجاتا ہے۔پہلے پہل نشہ کے لئے افیم ہی بآسانی دستیاب تھی سو اس کا استعمال بہت زیادہ تھا،اردو ادب میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کی کتاب فسانۂ آزاد کا مزاحیہ کردار خوجی اکثر ہی

افیم کے نشے میں دھت رہتا تھا۔

سنا ہے کہ ایک افیمی گھومتے گھومتے کسی باغ میں پانی کے تالاب کے کنارے پہنچ گیا اور پانی میں ایک چمکتی چیز دیکھ کر پوچھنے لگا ''بھئی یہ کیا ہے؟''

قریب کھڑے شخص بولا ''حضرت یہ چاند ہے''

افیمی حیرت سے چلا کر کہنے لگا ''کمال ہے میں یہاں چاند پر کیسے پہنچ گیا ہوں۔''

چار افیمی نشے میں دھت تھے اتنے میں ایک افیمی نے ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے عورت نے پوچھا ''کون ہے؟''

افیمی بولا ''ذرا باہر آ کر اپنے شوہر کو پہچان کرلے جائیں تاکہ باقی لوگ بھی اپنے گھر جاسکیں۔''

شراب

اردو میں شاعری اور شراب کا تصور ایک دوسرے کے بغیر ادھورا نظر آتا ہے۔ بعض شعرا عاداتاً شراب نوشی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بعض اراداتاً اس شغل کو اختیار کرتے ہیں کہ شائد شراب نوشی سے ان کی شاعری سنور جائے یہ الگ بات ہے کہ اس سے شاعری تو کیا سنورنی عاقبت بگڑ جاتی ہے۔ پھر بھیڑ چال کا شکار ایسے شاعر بھی ہیں جنہوں نے زندگی بھر شراب کا ایک قطرہ بھی نہیں چکھا ہوتا مگر ان کے اشعار سے شراب کے بھبکے اٹھ رہے ہوتے ہیں۔ ریاض خیر آبادی کا شمار ایسے ہی شعراء میں ہوتا ہے۔

مزاحیہ شاعر بیچارہ جب خرچے کا متحمل نہیں ہوسکتا تو مجبوراً دیسی شراب ہی سے غمِ دنیا دور کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔

اس کی نظروں میں مزہ کچی کا آتا ہے مجھے
رفتہ رفتہ ہوگیا ہوں میں بھی ٹھرا آشنا

مرزا عاصی اختر

پی کے نزلے کی دوائی (دُختِ رز) اُلٹے ہوئے
بڑھ گئی تھی اک ذرا مقدار آدھی رات کو

نوید ظفر کیانی

ہیروئین

ہیروئین فلم یا ڈرامے کی ہو کہ نشے میں استعمال ہونے والی دونوں ہی عام آدمی کے لئے نایاب ہوتی ہیں۔ اور دونوں ہی باعث مشکلات:

ہیروئین کے جو زخم خوردہ ہیں
ہم انہیں دیکھ کر فسردہ ہیں
نشہ بازوں کی زندگی کیا ہے
زندہ ہوتے ہوئے بھی مردہ ہیں

سرفراز شاہد

ہیروئن بیچنے والے سے کہا لیلیٰ نے
یہ جو پوڈر ہے سنگھا دو مرے پروانے کو
یونہی مرجائے کسی روز نشے کے ہاتھوں
کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو

سرفراز شاہد

ایک فٹ پاتھی نے یہ کہہ کے پھنسایا مجھ کو
مری معجون فلک سیر بھی کھا کر دیکھیں
کرچکے آئی ڈراپوں سے نظر اپنی خراب
سرمہء چودہ طبق میرا لگا کر دیکھیں

امیر الاسلام ہاشمی

تمباکو

انگریز ہندوستان آیا تو یہاں کے باشندوں کو چائے اور تمباکو کے

استعمال میں مبتلا کر گیا ۔

جو نہ لاتا کر کولمبس یہ نشے کا ایک پودا
تو نہ کوئی بیڑی پیتا نہ کہیں سگار ہوتا

مرزا عاصی اختر

سگرٹ، حقہ، اور نسوار کا اصل جزو تمباکو ہی ہے۔ جس کے بارے میں ڈاکٹر مظہر نے نذیر احمد شیخ کی زمین میں یوں طبی شجر کاری کی ہے۔

کرکٹ کا دیتے ہیں جھانسا
کھیل ہی کھیل میں سب کو پھانسا
ٹی۔وی دیکھنے والا کھانسا
آخر بولا تھو تمباکو

''اشتہار'' انوکھے لائے
ہر سگرٹ دل کو گرمائے
تمباکو کی بو پھیلائے
پھیلے کو بہ کو تمباکو

سانس گلے کی ہر بیماری
کرلیتی ہے اس سے یاری
تو بھی کر لے اب تیاری
جب ہے قبلہ رو تمباکو

خون کو روکے شریانوں میں
ہے مقبول یہ دیوانوں میں
ڈال کے جب کھاؤ پانوں میں
پچکاری ہر سو تمباکو

کینسر کا ساماں ہے تجھ سے
معدہ بھی سوزاں ہے اس سے
بیماری ارزاں ہت تجھ سے
مہلک تو ہی تو تمباکو

جاں کے ہر منظر میں مہلک
شوگر ،بلڈ پریشر میں مہلک
تمباکو ہر گھر میں مہلک
دیکھ کے مظہر چھو تمباکو

سگرٹ نوشی

تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ سگرٹ نوشی جسم کی بہت سی خطرناک بیماریوں کا باعث ہوتی ہے۔ مگر سرمایہ داری کے اس دور میں یہ حقیقت جانتے ہوئے بھی اس کی اشتہار بازی پر زر کثیر خرچ کردیا جاتا ہے ،البتہ اس سے بری الذمہ ہونے کا حل ،سگرٹ کے پیکٹ پر انتباہ کی عبارت لکھ کر ڈھونڈ لیا گیا ہے ۔

''ثابت ہوا ہے سگرٹ و بیڑی پہ خونِ خلق''
سرطان میں پھنسے ہوئے بیمار دیکھ کر

مرزا عاصی اختر

اس میں بھی ایک لطف ہے اس میں بھی اک نشہ
ٹی وی پہ قول و فعل کے کچھ شاہکار دیکھ
سگرٹ نہ پی وزارتِ صحت اگر کہے
سگرٹ کے اشتہار مگر بار بار دیکھ

خالد عرفان

سگرٹ کے اشتہار بھی ہوتے ہیں پرکشش
اور اس کے ساتھ ساتھ ملیں گفٹ بے پناہ
معصوم لوگ دونوں طرف سے ہوں جب گھرے
پھر کیا کرے وزارت صحت کا انتباہ

ڈاکٹر بدر منیر

سگرٹ نوشی چھوڑ دے پیارے یہ کوئی بھی بات نہیں
اس سے کینسر ہوجاتا ہے، یہ بتلاتا ٹی وی ہے

سگرٹ کو تو چھوڑ بھی دوں گا اس میں مشکل کیسی ہے
نوشی کو میں چھوڑوں کیسے وہ تو میری بیوی ہے

افضل پارس

ایک کے بعد ہے پھر اور جلایا جاتا
سگرٹوں اور سگاروں کو سزا ملتی ہے

عرفان قادر

جان لیں پی رہے ہیں جو سگرٹ
آگ ہو تو دھواں بھی ہوتا ہے
صرف پیسہ ہی تو نہیں جلتا
جسم و جاں کا زیاں بھی ہوتا ہے

مخدوم علی ممتاز

حقہ

دیہی علاقوں میں عرصہ دراز سے عوام میں حقہ نوشی کا شغل جاری ہے اگر چہ اس کا شمار نشہ بازی میں تو نہیں ہوتا تھا مگر عصر حاضر میں اس کی ایک مضر قسم بشکل ''شیشہ'' صحت کے لئے تباہ کن ثابت ہو رہی ہے۔ حقہ نوشی جس طرح ہمارے دیہی ثقافت میں رچ بس گئی ہے اس کی آفاقیت کے لئے محمد عارف کا بہت خوبصورت قطعہ ملاحظہ فرمائیں

چار عناصر ہیں یک جا
مٹی پانی آگ ہوا
پوچھو تو یہ چیز ہے کیا
ہنس کر بولا ح حقہ

محمد عارف

زباں زباں پہ ہے اعلانِ ترکِ تمباکو
بطورِ عام یہ پیغام ہر طرف کردیں
ہمیں یہ فکر ہے لاحق کہ ایسے عالم میں
نوابزادہ نہ حقے کو برطرف کردیں

انور شعور

نسوار

نہ مزہ ملتا ہے اتنا پیار میں
نہ مزہ ہوتا ہے یہ سرکار میں
نہ ہے اتنا لطف استغفار میں
لطف آتا ہے تو بس نسوار میں

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

دورۂ مرگی میں جب چل ہوئی ہے بے اثر
دوستوں نے دی مجھے نسوار، بارہ بج گئے

سید فہیم الدین

خان صاحب دردِ دل کہنے کہاں جائیں ظفر
یاد آ جائے اگر نسوار آدھی رات کو

نوید ظفر کیانی

زندگانی ہے عبث اس کے بغیر
جب نہ ہو نسوار تو ہم کیا کریں

عرفان قادر

چرس

چرس کے سوٹے لگاتے ہوئے بیٹھے ہیں ''جہاز''
روڈ کے ایک کنارے پہ مگر شام کے بعد

عرفان قادر

مری سن کر کہا موالی نے
عاصی کچھ تو مزے لئے ہوتے

چرس کو تو نہ پھر برا کہتا
کاش دو چار کش لئے ہوتے

مرزا عاصی اختر

خودکشی

نفسیاتی بیماریاں اکثر موت کے نکتۂ انتہا پر منتج ہوتی ہیں۔نفسیاتی مریضوں کے علاوہ بہت حساس انسان بھی کبھی کبھی اس راہ پر چلتے نظر آتے ہیں۔اس سلسلے میں بہت سے شاعروں اورادیبوں کے نام لئے جاسکتے ہیں مثلاً ثروت حسین ، سبط علی صبا، عزیز قیس وغیرہ ۔

موت کے دریدے میں اک کشش تو ہے ثروت
لوگ کچھ بھی کہتے ہوں خودکشی کے بارے میں

ثروت حسین

اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کوموت میں تبدیل کرنا آسان کام نہیں۔خودکشی اگرچہ فعلِ حرام ہے،مگر بعض اوقات کمزور اعصاب افراد زندگی سے اس قدر عاجز آجاتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ وہ کیا کریں ۔

جینا محال ہونے پہ بھی ہے خودکشی حرام
کس طرح درد زیست کا درماں کرے کوئی

مسٹر دہلوی

دنیا ہو دیں ہو جرم ہے دونوں میں خودکشی
مسدود غم زدوں پہ ہے راہ فرار تک

مسٹر دہلوی

مگر شاعر ہر بات کا کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ ہی لیتے ہیں ۔

کہا یہ خودکشی سے پہلے اس نے
''نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا''

عاصی اختر

مزاحیہ شعرا زندگی کے رنج وغم اور آلام و مصائب سے گھبراتے نہیں۔وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس بے خوفی سے نظمیں اور غزلیں کہتے ہیں کہ موت خود راہ فرار اختیار کرلیتی ہے۔مزاحیہ شعرا اس مرحلے پر نت نئے انداز سے سامانِ خندگی فراہم کرتے ہیں کہ اچھا خاصا منہ بسورتا زندگی سے نالاں شخص بھی مسکرادیتا ہے۔

موت آساں ہے مگر ہے قبر کا ملنا محال
سوچ کر یہ خودکشی سے مجھ کو باز آنا پڑا

اسد جعفری

خودکشی ضروری ہے زندگی بھی پیاری ہے
زندہ رہنا ہے تو کر خودکشی میں چالاکی

ممتاز راشد

چٹ پٹی خودکشی

حالات نے آلام کو یوں مجھ پہ ہے لادا
آرام سے کرڈالا ہے مرنے کا ارادہ
ہیں خودکشی کرنے کے طریقے تو بہت سے
پر مجھ کو ہے مطلوب طریقہ کوئی سادہ
پنکھے سے لٹکنا تو مناسب نہیں لگتا
گاڑی تلے آنے میں ہے تکلیف زیادہ
دریا میں جو کودا تو کہیں سانس نہ رک جائے
چھت سے جو گرا خدشہ ہے بن جائے برادہ
مرجانے کے پرلطف طریقے کوئی سوچے
برگر میں ملا لوں کوئی زہریلا سا مادہ
چائے میں کوئی زہر ہی میں گھول کے پی لوں
سنکھیے کو نہ پہنادوں سموسے کا لبادہ
گندم میں رکھی گولی میں لسی سے نگل لوں
پانی سے تو ہوجائے کہ منہ کڑوا مبادا
آخر میں یہی سوچ کے باز آنا پڑا ہے
اس موت کا برزخ میں سدا ہوگا اعادہ

ادریس قریشی

خودکشی

فائدہ زندگی کا کوئی نہیں
کیا گزاروں گا زندگی تم بن
خودکشی پر ہے دل مرا مائل
خوف آتا ہے موت سے لیکن

زہر لے کر میں آگیا ہوں دیکھ
اے اجل اب تو میری سانسیں گن
میں یہ پی جاؤں گا سبھی یکدم
موت بن جائے گی مری محسن

پھڑ پھڑائے گا میرا تن جس دم
نبض ہوجائے گی مری ساکن
کڑوا ہوجائے گا دہن میرا
زہر سے موت کچھ نہیں فائین

سوچتا ہوں کوئی طریقہ اور
ڈھونڈ اے دل ذرا نئی راہیں
کیوں نہ پھندے سے میں لٹک
جاؤں
موت آجائے کھول کر بانہیں

لیکن اس بات کا مجھے ڈر ہے
ٹوٹے رسی تو میں گروں دھائیں
میری گردن بھی لمبی ہوجائے
دیکھ کر جس کو سب بھریں آہیں

دلِ پُر درد ڈھونڈ اب پستول
ہے علاجِ غمِ جہاں گولی
کنپٹی کے قریب رکھ کے اسے
کیوں نہ کھیلوں میں خون کی ہولی

ڈر نہ جاؤں مگر کہیں خوں سے
ہے طبیعت مری بہت بھولی
پھیل جائے نہ خون چاروں طرف
ہو نہ جائے خراب یہ کھولی

ہاں گیا موسمِ بہار گیا
اب تو دل کی زمین ہے بنجر
آرہا ہے خیال اب یہ مجھے
کیوں نہ میں اپنے مارلوں خنجر

میں نے لیکن سنا ہے لوگوں سے
اس میں ہوتا ہے جان کو "ڈینجر"
موت کی ریل بھاگ جاتی ہے
بلبلاتی ہے روح "پیسنجر"

جس کو مظہر بہت سمجھتے تھے
موت بھی اسقدر نہیں آساں
خودکشی کیجیے موخر اب
ڈھونڈیے زندگی کا کچھ ساماں

ہے علاجِ غمِ حیات یہی
پیجیے ساغرِ غمِ دوراں
وقت مرہم ہے زخمِ دُنیا کا
بیت جائیں گی غم کی یہ گھڑیاں
غم چھپاتا ہے پردۂ نسیاں
اس میں شامل ہے حکمتِ یزداں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

نیند

کچھ نہیں ہے شب اندھیری موت ہے
وہ تری ہے یا کہ میری موت ہے
موت جو ہے وہ ہے "پرمیننٹ" نیند
نیند جو ہے "ٹمپریری" موت ہے

احمد علوی میرٹھی

مال و دولت بھی مصیبت بن گئے اس دور میں
نیند انہیں آتی نہیں ہے آٹھ گھنٹے سولیا
پرس میں ان کے رقم ہے جیب خالی ہے مری
ان کو مالیخولیا ہے مجھ کو خالی خولیا

ہر فن لکھنوی

لوگ خواب آور دوائیں کھا کے سوتے ہیں مگر
نیند خود آ کر گلے اپنے لگاتی ہے مجھے
بس ذرا اپنی کتابیں کھولنے کی دیر ہے
نیند کی دیوی محبت سے سلاتی ہے مجھے

ڈاکٹر سعید اقبال سعدی

دماغی بیماریاں

حرام مغز

اب تک یہی سنا تھا طبیبان دہر سے
ہوتا ہے سب کی ریڑھ میں پیارے حرام مغز
پیدا نفس نفس سے ہے فکر حرام خور
سر میں بھرا ہوا ہے تمہارے حرام مغز

طہٰ خان

مرگی

چارہ گر نے غش میں جب عاشق کو دیکھا تو کہا
اس کو مرگی ہے فقط جوتا سنگھا سکتا ہوں میں

ظریف جبلپوری

مریض عشق و مرگی جو ہو جوتا ہے علاج اس کا
تم ان دونوں کی یہ دیسی دوائی دیکھتے جاؤ

کشن لال خنداں

انگڑائیوں کا تیری سماں یاد آ گیا
مرگی نے جب دبایا کسی کو کبھی کبھی

سگار لکھنوی

مرگی (نظم)

آفتِ جسم ، زہرِ جاں مرگی
ایک پُرہول داستاں مرگی
زندگی موت سے ہے جنگ بدست
مرگ سے کم بھلا کہاں مرگی
رنگ اک یہ بھی ہے جہالت کا
خوب سنگھوائے جوتیاں مرگی
ڈانس کرتے ہیں جسم کے اعضاء
ہوتی ہے جب کبھی عیاں مرگی
آستانوں سے ہسپتالوں تک
لے گئی ہے کشاں کشاں مرگی
بھر گئی جیب خوب عامل کی
یوں ہوئی اُس پہ مہرباں مرگی
جان نکلی مگر نہ نکلا جن
کر گئی جان کا زیاں مرگی
پیر صاحب کی پھونک سے مظہر
مانگتی اب تو ہے اماں مرگی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فالج

دماغی بیماریوں میں فالج کی بیماری بہت عام ہے۔ یہ بڑوں اور بچوں میں یکساں دیکھی جاتی ہے۔ بچوں کے فالج کو cerebral palsy کا نام دیا گیا ہے۔ ایسے بچوں کو اسپیشل یا خصوصی بچے کہا جاتا ہے۔ یہ بچے زندگی بھر ہماری خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔

خصوصی بچے کا خصوصی پیغام (ماخوذ)

شکل و صورت مختلف ہے میری گو
ہیں مرے جذبات تُم جیسے سُو
مُسکراتا ہوں تمہاری ہی طرح
کھاتا پیتا ہوں تمہاری ہی طرح
آسماں ویسا ہے، ویسی ہے زمیں
میرا رونا مختلف تم سے نہیں
جب خوشی ملتی ہے ہوجاتا ہوں شاد
دل مرا بڑھتا ہے جب ملتی ہے داد
امتحاں لینا تھا تیرا بے خبر
مجھ کو خالق نے زمیں پہ بھیج کر
آیا ہوں الفت سکھانے کے لئے
میں نہیں عبرت زمانے کے لئے
دل میں روشن ہوں محبت کے دیئے
مجھ کو بھیجا ہے خدا نے اس لئے
وہ خدا ہے جس کی رحمت بے کراں
اس زمیں سے لے کے تا با آسماں
جیسے تارے ہیں زمیں پر بے شمار
یا سمندر جیسے کوئی بے کنار
اپنے پیمانوں سے تو مجھ کو نہ ناپ
ہے چنیدہ خانداں، یہ ماں، یہ باپ
تیری الفت مجھ کو کرسکتی ہے ٹھیک
دے نہ مجھ کو کوئی ہمدردی کی بھیک
کررہا ہوں میں ابھی تو عین غین
مجھ کو سکھلادیں گے سب کچھ والدین
ذہن میرا سست ہے، گفتار سست
ابتدا میں ہوگی یہ رفتار سست
تم نے جو سیکھا ہے وہ سیکھوں گا میں
میں چلوں گا، ایک دن بولوں گا میں
میرے پیمانے مرے اپنے ہیں سُن
مجھ میں آئیں گے نظر سب تجھ کو گُن
مجھ کو نعمت زندگی کی جس نے دی
ظلمتوں میں دے گا وہ ہی روشنی

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اسلام جس نے ہمیشہ دوسروں کا خیال رکھنے کی تاکید کی ہے آج اس کے ماننے والے کسی سے رخصت ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ اپنا خیال رکھئے گا۔ ذہنی طور پر پسماندہ شخص بھی یہ جانتا ہے کہ اسے اپنا خیال رکھنا چاہئے مگر یہاں تو یہ حال ہے کہ عام لوگ تو کیا کبھی معالجین بھی ذہنی امراض کے شکار لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور صرف مالی منفعت کے لئے اس کے گھر والوں کو خوامخواہ کے مہنگے علاج معالجے میں پھنسادیتے ہیں۔

بے حالیٔ معذوراں

ٹماٹر بیچ کر وہ منہ ہمارا لال کرتے ہیں
یہاں سب لوگ سارے کام حسبِ حال کرتے ہیں
مریضوں کی بحالی پر وہ تعینات ہیں مظہر
لہٰذا وہ انہیں باقاعدہ بے حال کرتے ہیں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

ذیل میں درج قطعات ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو سادہ لوح مریضوں کو علاج کے نام پر دھوکا دیتے ہیں، بدقسمتی سے ہمارے نیم خواندہ معاشرے میں دولت کے پجاریوں نے طبی شعبے کو بھی اپنی ہوس کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

قولِ عامل

مرے قبضے میں ہیں جنات، ہر مشکل کا حل میں ہوں
پلٹ سکتا ہوں تیری زندگی میں چاہوں جس دم بھی
کہا عامل نے، "ہیں اقبال بھی اس بات کے قائل
"عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

روحانی کلینک

ہے قسمت میں ہمارے نارسائی کیا کریں مظہر
رگڑتے ہیں اگرچہ ہم بہت اپنی جبینوں کو
یہ روحانی کلینک ہے کہ رومانی کلینک ہے
ہمارے پیر جی دیکھیں یہاں بس نازنینوں کو

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

پھونکوں سے علاج

تعویذ ٹونے ٹوٹکے آتے نہیں سمجھ
ہم سے تو یہ علاج کرایا نہ جائے گا
ہے حرکتوں پہ پیر تری خندہ زن اجل
"پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا"

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

معذور افراد کے علاج سے متعلق کچھ اور بھی افراد ہوتے ہیں جو ایم۔بی۔بی۔ایس ڈاکٹر تو نہیں ہوتے مگر ان کے بغیر معذور افراد کا علاج ناممکن ہوتا ہے۔ان شعبہ جات کی نشاندہی کی غرض سے کچھ قطعات ملاحظہ فرمائیں:

اسپیچ تھیراپسٹ

چلائے بچہ جو ہم سے زباں تو ہم ڈانٹیں
کہ اچھا لگتا نہیں اس کا گڑبڑی کرنا
زباں چلانے کی دیتے ہیں تربیت وہ ادھر
اور اس کو کہتے ہیں اسپیچ تھیریپی کرنا

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

فزیوتھراپی

اس سرزنش کا ان پہ اثر ہوگا کچھ نہیں
اسپیچ تھیراپی سے نہ یوں کام لیجے
لاتوں کے بھوت مانتے باتوں سے کچھ نہیں
اب فزیوتھیراپی سے ہی پیغام دیجے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

متفرق دماغی بیماریاں

لقوہ

بات ہم نے کی تھی سب سیدھے سبھاؤ
جانے کیسے منہ یہ ٹیڑھا ہوگیا ہے
ہم تو بولے تھے فقط انگلش ہی لیکن
ڈاکٹر کہتے ہیں لقوہ ہوگیا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

تشنج

گوشت ہے گھر میں نہ سبزی ہے نہ کوئی دال ہے
اس گرانی نے تو ہم کو کردیا پامال ہے
دورے ہرگز یہ تشنج کے نہیں ہیں ڈاکٹر
جب سے یہ بازار سے لوٹے ہیں بس یہ حال ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دردِ شقیقہ

رُخ زرد ہے، اُلٹی ہے، پھٹا جاتا ہے سر بھی
سر درد بہت دیکھے نہ دیکھا یہ طریقہ
معشوق کے سب ظلم بھلا دیتا ہے یکسر
جب ہوتا ہے مظہرؔ کبھی یہ دردِ شقیقہ

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دردِ عرق اُلنساء (وجہ تسمیہ)

کرکے معائنہ وہ بڑے انہماک سے
کہنے لگے کہ درد یہ عرق اُلنساء کا ہے
ہم نے کہا کہ مرد ہیں بالکل اصیل ہم
تشخیص میں نہاں کوئی نکتہ خطا کا ہے
فرمایا جس کے "نیوروفزیشن" نے ہم سے یہ
بھائی مرض کے نام میں گھپلا بلا کا ہے
اس کا "شیاٹکا" ہے لقب میڈیکل میں پر
کہتے ہیں پیر جی کہ مرض یہ "ہوا" کا ہے
پوچھے اگر حکیم سے کوئی مرض کا نام
فرمائیں گے وہ درد یہ عرق اُلنساء کا ہے
نسبت ہوئی ہے اس کو جو عورت کے نام سے
شائد یہ قصہ شدت جور و جفا کا ہے
جیسا کہ درد ہوتا ہے بیوی کی مار سے
ویسا ہی درد اصل میں عرق اُلنساء کا ہے

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

دماغی خلا

غصہ اتارتے ہیں چڑھاتے ہیں ناک بھوں
ہم بے زبان آپ سے کیسے لڑا کریں
ہو آسماں کے پار تو جائیں خلا نورد
کانوں کے درمیان خلا ہو تو کیا کریں

طٰہٰ خان

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی اسلام آباد سے تعلق رکھتے ہیں۔طبی حوالے سے مزاحیہ شاعری انہیں کی اختراع ہے۔ان کے طنز و مزاح پر مبنی نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔طنز و مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ نہایت شستہ و شگفتہ شاعری کے مرتکب بھی ہوتے چلے آ رہے ہیں۔"ارمغانِ ابتسام" کے اوّلین کرمفرماؤں میں شامل ہیں۔

سلیم اختر

اصیل ککڑ

میرے ذاتی معاشقوں کے اعداد و شمار ملکی اثاثوں کی طرح خطرناک حد تک کم ہونے کے باوجود بھی آپ مجھ پہ شرافت کا الزام نہیں لگا سکتے۔ اس کے باوجود بھی میں جس محلے کا کونسلر ہوں وہاں میری شہرت ''کڑیوں جیسے منڈے'' والی ہے۔ امریکہ کی طرح اکثر گھروں کو خالہ کا گھر سمجھ کر گھس جانا روزمرہ کے معمولات میں تھا۔ میں کبھی کسی خاتون کو آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا کیونکہ میرا سارا سیاسی مستقبل میری نام نہاد شرافت سے وابستہ تھا مگر برا ہو لنگوٹئے عاطف کا، جیسے ہی وہ اٹلی سے لیرے کما کر لایا، اسے اپنی ہزار سالہ پرانی محبوبہ رشیدہ یاد آ گئی جو اس زمانے میں روٹھی تھی جب محبت ٹرنک کال، ایس ڈی اور نان ایس ڈی ہوتی تھی۔

رشیدہ میرے ہی محلے کے شفیع کی بیٹی تھی، اور اس نان کسٹم بیٹی کو شفیع ہر ایکسائز والے سے بچاتا پھرتا تھا، مگر شفیع کی بیوی اس ہائی برید ہنڈا'' کو پورے شہر میں دوڑائے پھرتی تھی۔

عاطف اور صابر اس وقت میرے سامنے بیٹھے تھے۔ صابر عاطف کا سفارشی تھا اور میں اس قسم کے کسی معاملے سے مکمل انکاری۔۔۔ مجھے کسی بھی معاشقاتی ڈپلومیسی کا حصہ نہیں بننا تھا۔

''تم کوئی دوسرا ناٹک ڈھونڈ لو۔''

صابر میرے پاؤں پہ گر گیا۔ ان دونوں کی گفتگو کا لب لباب یہ تھا چونکہ میرا شفیع کے ہاں بلا روک ٹوک آنا جانا ہے لہٰذا بات کرنے اور رشیدہ کو واپس ورغلانے میں مجھ سے بڑا احمق پورے علاقے میں نہیں ہے۔

دو گھنٹے کی اس گندہ تھڑا کانفرنس میں دوستی جیت گئی، اور محلاتی غیرت ہار گئی۔

میرے ایک عزیز اپنی اہلیہ کے ساتھ روز صبح جاگنگ کے لیے جاتے ہیں۔موصوف آہستہ آہستہ بھاگتے ہیں اور اہلیہ پیچھے چہل قدمی کرتی ہیں۔موصوف اپنے دوستوں کو بتاتے پھرتے ہیں کہ میری بیوی تو میرے پیچھے پیچھے پھرتی ہے اور بیگم کے خاندان میں یہ بات مشہور ہے کہ اس نے اپنے خاوند کو آگے لگایا ہوا ہے۔

ارسلان بلوچ

اگلے دن ہی رشیدہ سے بات ہوئی۔وہ تو جیسے ''این آر او'' کو تیار بیٹھی تھی۔

رات گیارہ بجے لائٹ جانے کا وقت طے ہوا اور ہم تینوں وقت مقررہ موبائل فون آف کیے رشیدہ کی معیت میں دبے پاؤں اس کے صحن کی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پہ بنیا کلوتے کمرے میں جا پہنچے۔سیاسی پس منظر کی وجہ سے چیئر مین سینٹ کا عہدہ مجھے دیکر اکلوتی چارپائی پہ اندھیرے میں بٹھا کر کارروائی کا سرگوشیوں میں آغاز ہوا۔ ہمارا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ایک گھنٹے کی اس چغلیوں جیسی میٹنگ کا کچھ رزلٹ نہ نکلا تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔

رشیدہ نے صابر اور عاطف کو کہا کہ وہ جائیں اور مجھے کہا کہ آپ رکو، مجھے آپ سے کچھ اور بھی بات کرنی ہے۔

وہ دونوں دبے پاؤں سیڑھیاں اتر گئے کہ شفیع اور حمیدہ نیچے کمرے میں سو رہے تھے۔اُن کو نکال کر رشیدہ کنڈی لگا آئی اور کمرے میں آتے ہی چارپائی پہ مجھ سے جڑ کر بیٹھ گئی۔اُس کے سیڑھیاں چڑھنے اترنے کی وجہ سے اس کی سانسوں کا اتار چڑھاؤ مجھے اپنے بازو پہ محسوس ہو رہا تھا۔میرا گلا سوکھ رہا تھا۔

''جانتے ہیں، مجھے آپ سے کیا کہنا ہے؟'' اندھیرے میں اس کی گرم سانس اپنی گردن پہ محسوس ہی کی تھی کہ دھڑام سے چارپائی ٹوٹ گئی۔

اس اندھے کنویں میں ہم اکٹھے گرے۔اس کا دل میرے سینے پہ دھڑک رہا تھا اور میرا کچھ سامان گلے میں۔نیچے سے حمیدہ کی چکوال روٹ کے کنڈیکٹر جیسی آواز آئی ''نی رشیدہ، اوپر کیا کر رہی ہو؟''

میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا، رشیدہ پہلے سیڑھی کی طرف بڑھی پھر ''امی آئی'' کہہ کر کمرے کے اکلوتے باتھ روم میں جا گھسی۔ میں کمرے کے بیچوں بیچ حمیدہ کے قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔میں بھاگ کر دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔

حمیدہ کمرے میں آ گئی، زور سے بولی ''کہاں ہو؟''

''باتھ روم میں۔۔۔'' رشیدہ اندر سے چلائی۔

میں دیوار سے مزید چپک گیا، حمیدہ نے دیوار کے سہارے کمرے کا کر لگایا، اور مجھے چھو لیا۔

''کون ہو؟'' اُس نے سرگوشی کی۔

''میں بوٹا کونسلر!'' مجھے اپنی ہی آواز اجنبی لگی۔

''وے بوٹیا، غرق جانیاں، تجھے دن میں موت پڑتی تھی جو رات میں چور بنا کھڑا ہے؟''

''رشیدہ نے بلایا تھا'' میں نے جواب دیا۔

''وہ کمینی تو ہے ہی جھلی، پر تو تو سیانا ہے۔''

اس کے بعد حمیدہ نے میری کتے خوانی جاری رکھتے ہوئے، رشیدہ کی باتھ روم سے برآمدگی ڈالی۔

''شفیع جاگ گیا ہے، اب جب میں کہوں تو جانا۔''

حمیدہ مجھے تنبیہ کر کے مال مسروقہ سمیت سیڑھیاں اتر گئی۔

ڈھائی گھنٹے بعد جب میں اپنی ساری سیاسی، سماجی اور اخلاقی قدریں گنوا کر شفیع کے گھر سے نکالا گیا تو وہ دونوں نکڑ کی دکان کے تھڑے پہ بیٹھے جو سوچ رہے تھے اُن کی جگہ آپ بھی ہوتے تو وہی سوچتے۔

سلیم اختر صاحب کاموکی میں پیدا ہوئے۔پشتینی تعلق امرتسر سے ہے۔بزرگ پاکستان بننے پر وہیں سے ہجرت کر کے پاکستان آباد ہوئے تھے۔سائن بورڈ کے کام سے روزی روٹی کا سلسلہ چلاتے ہیں۔عمر پچاس کے پیٹے میں ہے۔لکھنے کا شوق عمر کے خاصے ابتدائی دور سے ہوا اور ابھی تک اُسی جوش و خروش سے جاری ہے۔طنز و مزاح لکھتے ہیں اور اس طرزِ بیان میں خاصی پختگی رکھتے ہیں۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے یہ ان کی پہلی تحریر ہے۔

م۔ص۔ایمن

مسلی گالی

ماجد بھائی کسی کام سے جا رہے تھے انہیں ان کے کچھ دوست کھڑے دکھائی دیئے تو ان کے ساتھ کھڑے ہوگئے اور دیر تک باتیں کرتے رہے، ان کے ساتھ اس وقت محلے کے دیگر افراد بھی تھے، سیاست ان کا پسندیدہ موضوع تھا، اس موضوع پر وہ جب بات کرتے تو بس وہی بول رہے ہوتے دوسرے کسی کی جرأت نہ تھی کہ ان سے اختلاف کر سکے یا انہیں ٹوک ہی سکے، بس سر ہلاتے اور ان کی ہاں ہاں ملاتے رہتے۔ اس وقت بھی سیاسی گفتگو جاری تھی کہ اچانک ماجد بھائی نے سر پکڑا۔ آنکھیں بند کیں اور خاموش ہوگئے۔ سننے والے ان کی اس حرکت کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے پوچھا ''کیوں بھائی ماجد کیا ہوا؟''

لیکن ماجد بھائی ذرا سا مسکرائے اور اپنی بات ادھوری چھوڑ کر چلے گئے۔

اُن کے گئے تین چار منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ ماجد بھائی کے ابا آگئے، پوچھا ''یہاں ماجد تو نہیں آیا؟''

تقریباً سب نے ہی کہا ''ہاں ہاں آیا تھا ابھی ابھی اس طرف گیا ہے!''

''ابھی ابھی گیا ہے؟'' ان کے لہجے میں حیرت سے زیادہ بے یقینی تھی۔

''جی ہاں! یہاں کافی دیر سے کھڑا باتیں کرتا رہا ہے ابھی ابھی اس طرف گیا ہے۔'' ایک نے کہا اور دوسروں نے سر ہلا کر اس کی تائید کی۔

''بڑا بے شرم آدمی ہے!'' ماجد کے ابا بولے ''میں کھانا کھا رہا تھا۔ روٹی کم تھی اس کی ماں نے کہا کہ اور روٹی بنا دیتی ہوں لیکن میں نے کہا تو دیر کردے گی، ماجد ہوٹل سے لے آئے گا۔ میں سالن سامنے رکھے روٹی کا انتظار کرتا رہا اور وہ یہاں گپیں لگاتا رہا۔''

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا ہے کہ ماجد بھائی کی ماں اسے کسی کام سے بھیجتی تو وہ دوستوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگ جاتا اور ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی آتی اور سخت سست کہہ کر اسے ہنکا کر لے جاتی۔

ایک بار تو ایسا ہوا کہ گھر میں مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کے لیے کھانا بن رہا ہے۔ ماجد بھائی سے امی نے کہا ''جا بیٹا! جلدی سے دہی لے آ۔''

ماجد بھائی جانے لگے تو ساتھ ہی مہمانوں میں سے ان کا یک ہم عمر لڑکا بھی ان کے ساتھ ہولیا۔ راستے میں مداری تماشہ دکھا رہا

تھا۔ یہ تماشہ ان کے علاقے میں اکثر دکھایا جاتا تھا۔ ماجد بھائی کے لیے تو یہ نیا نہیں تھا لیکن دلچسپ ضرور تھا جبکہ مہمان لڑکے کے لیے نیا تھا۔ وہ یہ تماشہ دیکھنے کھڑا ہو گیا اور ساتھ ہی ماجد بھائی بھی۔

گھر میں کھانا بن بھی گیا لیکن ماجد اور ان کا مہمان لڑکا دونوں لوٹ کر نہیں آئے جب وہ آئے تو اس دوران ان کا مزید انتظار کیے بغیر کھانا کھا بھی لیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ دونوں مداری کا تماشہ دیکھنے لگ گئے تھے اور۔۔۔۔دہی پھر بھی نہ آیا۔

ایسے کئی واقعات پیش آ چکے تھے۔ گھر والوں کی مجبوری تھی کہ بوڑھا باپ کیوں جائے؟ ماں کیوں جائے دکانوں پر؟ گھریلو ضروریات کی اشیا تو گھر کے لڑکے بالے ہی لاتے ہیں۔

عرصہ گزرا۔ حالات بدلے، زمانہ بدلا، ماجد بھائی کی یہ عادت ختم ہونے کی بجائے پختہ ہوتی چلی گئی۔ اب وہ خود تین بچوں کے باپ تھے۔ ان کا بڑا بیٹا بارھویں جماعت میں تھا اس کے امتحان ہو رہے تھے وہ اس کی تیاری کر رہا تھا اور سب سے چھوٹی بیٹی تین سال کی تھی۔

رات کا وقت تھا۔ ان کی بیگم نے کہا "چینی اور چائے کی پتی ختم ہے جا کر اسی وقت لے آئیں صبح دکانیں دیر سے کھلتی ہیں۔"

پہلے تو وہ ٹالتے رہے لیکن بیگم کے بار بار کہنے پر انہیں جانا ہی پڑا۔ انہیں جاتے دیکھ کر ان کی تین سالہ بیٹی بھی ان کے ساتھ تیار ہو گئی۔ انہوں نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ نہ مانی اور ان کے ساتھ جانے پر اصرار کرتی رہی۔ اس کے سامنے کھلونے رکھے گئے لیکن وہ پھر بھی نہ مانی اور ابا سے چمٹ سی گئی۔ بالآخر ماجد بھائی کی امی نے کہا کہ اتنی ضد کر رہی ہے تو اسے ساتھ ہی لے

آنکھیں علامتی حیثیت بھی رکھتی ہیں اور بہت سے انسانی رویوں کی عکاسی صرف آنکھیں ہی کر سکتی ہیں جو بات زبان پر نہیں آ سکتی وہ آنکھیں بیان کر دیتی ہیں اور بعض اوقات جو کچھ آنکھیں دیکھ پاتی ہیں انہیں زبان پر نہیں لایا جا سکتا کھلی آنکھوں سے دیکھنا اور آنکھیں کھلی رکھنا خاصا مشکل اور کٹھن مرحلہ ہوتا ہے کچھ لوگ جانتے بوجھتے آنکھیں بند رکھتے ہیں تو کچھ لوگ بند آنکھوں سے خواب دیکھتے ہیں اور کچھ تو بند آنکھوں سے چلنے کے بھی عادی ہوتے ہیں زندگی کی حقیقتوں کو کھلی آنکھوں سے دیکھنا مشکل سہی مگر ضروری بھی تو ہے اس لیے مشکل پسند لوگ آنکھوں کو کھلا ہی رکھتے ہیں یہ اور بات ہے کہ ایسے لوگوں کی آنکھیں بند ہونے کا انتظار اور دعا بہت سے لوگ کرتے رہتے ہیں۔

کہتے ہیں کسی کے دل میں گھر کرنا بہت مشکل بات ہے لیکن اس مرحلے کو آسان بنانے میں بھی آنکھیں ہی کام کرتی ہیں کسی کے دل کا مکین بننے کے لئے یار لوگ آنکھوں کی کھڑکی استعمال کرتے ہیں تو کچھ منچلے ان پلکوں کی چھاؤں میں سونا پسند کرتے ہیں اور کچھ لوگ فراق یار میں شب بیداریاں کرتے ہیں تو کچھ تصور جاناں میں اختر شماریاں کرتے نظر آتے ہیں شاعروں کے نزدیک آنکھوں کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے کہ بہت سے شاعروں کے دیوان کا عنوان ہی آنکھیں ہیں کچھ اسے آنسوؤں کی جھیل قرار دیتے ہیں تو کچھ اسے سمندر سمجھتے ہوئے اس میں ڈوب جانا چاہتے ہیں۔

کسی کی آنکھوں میں جگہ بنانے اور کسی آنکھوں کا تارا بننے کے لئے بھی یار لوگ خوب جتن کرتے ہیں۔ اس عمل میں کوئی کسی کی آنکھوں کو بھلا لگتا ہے تو کوئی کسی آنکھوں میں کھٹکتا ہے ایسے میں کبھی اپنی آنکھوں کے شہتیر چھپائے جاتے ہیں اور کہیں دوسروں کی آنکھ کے تنکے نکالے جاتے ہیں۔

پچھلے دِنوں ہندوستان کے ایک اخبار نے لکھا ہے کہ مجلسِ احرار بالکل ''بے کار'' جماعت بن کر رہ گئی ہے لیکن اس اخبار کو غالباً یہ معلوم نہیں کہ مجلسِ احرار کے صدر شیخ حسام الدین کا تعلق موٹر یونین سے ہے۔ ان کے پاس کار پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے اور اب تو شیخ صاحب نے بس سروس بھی جاری کر رکھی ہے اور ان کے پاس کئی ''بسیں'' ہیں۔ اس لئے مجلسِ احرار نہ ''بے بس'' رہی نہ ''بے کار''، یعنی اللہ نے کاریں بھی دے رکھی ہیں اور بسیں بھی۔ حرف وحکایت از چراغ حسن حسرت

جائیں۔

''میں اسے اٹھاؤں گا یا سامان اٹھاؤں گا'' وہ بولے۔

''لے جاؤ! اس کا جی بھی چاہتا ہے تمہارے ساتھ جانے کو۔ سارا دن تو تم گھر پر ہوتے نہیں ہو۔ وہ بھی سارا دن گھر میں پڑی رہتی ہے۔''

ماں کے کہنے پر ماجد بھائی نوشین کو ساتھ لے جانے پر راضی ہو گئے۔ ماں نے کہا ''میرے لیے ڈبل روٹی بھی لیتے آنا۔ صبح کون لا کر دے گا؟ تم کام پر چلے جاؤ گے۔ عابد کالج چلا جائے گا۔''

''ابو نیلی روشنائی بھی ساتھ لیتے آیئے گا ختم ہو گئی ہے۔'' عابد نے بلند آواز سے کہا۔

''اور بھی کسی کو کچھ یاد آ جائے تو ابھی بتا دو میں بار بار نہیں جاؤں گا۔'' ماجد کے لہجے میں طنز کی کاٹ صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔ انہوں نے نوشین کو اٹھالیا اور نوشین نے اپنی کھلونا کار کو بھی اٹھا رکھا تھا۔

گھنٹہ بھر بعد باپ بیٹی واپس آئے تو جو سامان منگوایا گیا تھا وہ تو آ گیا لیکن نوشین نے گھر پہنچتے ہی رونا شروع کر دیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کی کھلونا کار واپس نہیں آئی تھی اور وہ اس کے لیئے رو رہی تھی۔ مختلف دکانوں سے سامان لیتے ہوئے جانے اپنی گاڑی نوشین نے کہاں چھوڑ دی تھی، اب گھر پہنچ کر اسے یاد آ رہا ہے۔ اسے بہلانے کی بہت کوشش کی گئی۔ اس سے سب نے ہی وعدے کیئے کہ ''تمہیں نئی دلا دیں گے۔ چھوڑ دو اسے۔۔۔ بھول جاؤ۔۔۔ سو جاؤ۔ وہ پرانی ہو گئی تھی۔'' وغیرہ وغیرہ لیکن نوشین کی ایک ہی ضد تھی کہ ''میلی گالی۔۔۔ میلی گالی!'' (میری گاڑی! میری گاڑی)۔

مجال ہے کہ ماجد پر کوئی اثر ہوتا ہو۔۔۔ وہ لباس تبدیل کر کے سونے کے لیئے لیٹ گئے۔ اِدھر نوشین تھی کہ کسی طرح چپ ہی نہیں کر رہی تھی۔ ماجد کو غصہ آنے لگا۔ انہوں نے نوشین کو ڈانٹ دیا۔ ان کی آواز اس قدر گرجدار تھی کہ نوشین سہم سی گئی۔ عابد کو بولنا تو نہیں چاہیئے تھا لیکن اسے نوشین پر ترس آ گیا، وہ بھی بول ہی پڑا ''ابو وہ تو چھوٹی ہے نا سمجھ ہے لیکن آپ اس کی ضد سے ضد کا مقابلہ کر رہے ہیں، مجھے بتائیں آپ کن کن دکانوں پر گئے تھے؟ میں جا کر لے آتا ہوں۔'' وہ کتابیں چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

ماجد کی بیگم بولیں ''میں خود جاتی ہوں، بتائیں آپ کن کن دکانوں سے سامان لے کر آئے ہیں؟ مجھے دیں گاڑی کی چابی۔۔۔ آپ آرام کر لیں۔'' پھر ماجد سے بولی ''بیٹے! تم بیٹھو۔۔۔ اپنی تیاری کرو۔''

اچانک ماجد اچھل کر بستر سے کھڑے ہو گئے اور بولے ''بیگم مجھے جانا ہی پڑے گا۔۔۔ گاڑی تو میں بیکری کے سامنے ہی چھوڑ آیا ہوں۔ اِس کی کار بھی گاڑی میں ہی ہے۔''

گھر والے سب سمجھ گئے کہ جاتے ہوئے تو یہ اپنی گاڑی پر گئے تھے اور واپسی میں پیدل ہی آ گئے ہیں۔

م۔ص۔ ایمن کا تعلق کراچی سے ہے۔ موصوف بہت اچھے افسانہ نگار اور بچوں کے ادیب ہیں اور بہت سے رسائل میں اِن کی کہانیاں تواتر سے شائع ہو رہی ہیں۔ ''بزمِ احبابِ ظرافت'' کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، جو کراچی میں خاصی فعال ہے اور کئی کامیاب محفلیں برپا کر چکی ہے۔ بہت اچھا مزاح تخلیق کرتے ہیں۔ اندازِ بیان میں شستگی اور شائستگی ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے مستقل لکھنے والوں میں شامل ہیں۔

اقبال حسن آزاد

روح کو بلاوا

دونوں میاں بیوی ہمہ وقت آمادۂ جنگ رہا کرتے تھے۔ وہ جو کہتے ہیں نا کہ شادی کے بعد پہلے سال شوہر بولتا ہے اور بیوی سنتی ہے، شوہر بولتا ہے اور بیوی سنتی ہے، شوہر بولتا ہے اور بیوی سنتی ہے۔ شادی کے دوسرے سال بیوی بولتی ہے اور شوہر سنتا ہے، بیوی بولتی ہے اور شوہر سنتا ہے، بیوی بولتی ہے اور شوہر سنتا ہے اور اس کے بعد پھر دونوں بولتے ہیں اور محلے والے سنتے ہیں۔ یہ لطیفہ ان دونوں پر صادق آتا تھا۔ لوگ مزا لیتے اور ہوا دیتے۔

شادی کے فوراً بعد جانو بی بی نے عقیل میاں کو یہ سمجھانا شروع کیا کہ گھر، گھر والی کا ہوتا ہے۔ اور گھر بیوی ہی چلا سکتی ہے، شوہر نہیں لہٰذا انہیں چاہیے کہ وہ اپنی ساری تنخواہ ان کے ہاتھ پر لا کر رکھ دیں۔ عقیل میاں کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ ابھی شب وصال کے مزے لوٹ رہے تھے اس لیے ان کی عقل کام نہیں کر رہی تھی۔ چنانچہ مہینہ پورا ہوتے ہی جب انہیں تنخواہ ملی تو انہوں نے پوری کی پوری جانو بی بی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

چند ماہ تک تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک چلا پھر محترمہ نے ان پیسوں میں سے کچھ پیسے الگ کرنے شروع کر دیئے۔ دھیرے دھیرے وہ اپنے اصلی رنگ میں آنے لگیں۔ پہلے تو انہوں نے اخبار بند کروا دیئے اور عقیل میاں کے احتجاج پر انہیں سمجھایا کہ اخبار میں پیسے برباد کرنے سے بہتر ہے کہ وہ لائبریری میں جا کر

اخبار کا مطالعہ کر لیا کریں۔ عقیل میاں کو غصہ تو بہت آیا لیکن برداشت کر گئے۔ اس کے بعد ان کے سگریٹ کا نمبر آیا۔ جانو بی بی نے انہیں سمجھایا کہ سگریٹ نوشی بری شے ہے اس سے کینسر ہوتا ہے۔ آپ میرے سرتاج ہیں۔ میں اپنے سر کے تاج کو کینسر میں مبتلا ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ عقیل میاں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے اور ادھار لے کر چوری چھپے سگریٹ نوشی جاری رکھی۔

اُدھر بیگم نے پوشیدہ طور پر بینک میں اپنا ایک اکاؤنٹ کھلوا لیا اور اس میں مالِ غنیمت کو جمع کرنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ جانو بی بی لالچ کے پھندے میں پھنسنے لگیں اور انہوں نے زیادہ سے زیادہ پیسے جمع کرنے کے لیے کھانا روکھا پھیکا کر دیا۔ ہفتوں گوشت کی شکل دکھائی نہ دیتی۔ اور پھر حالت بہ ایں جا رسید کہ مہینے کے پندرہ ہیں دن ہی بیگم نے اعلان کر دیا کہ سارے پیسے ختم ہو گئے ہیں، اور پیسے چاہئیں۔ اب عقیل میاں چکرائے اور ان کی عقل متحرک ہوئی۔ انہوں نے خفیہ طور پر تحقیق کی تو بیگم کے بینک اکاؤنٹ کا راز ان پر کھلا۔ وہ مہینہ تو کسی طرح قرض لے کر گزارا لیکن اگلے مہینے سے انہوں نے بیگم کے ہاتھ میں پیسے دینے بند کر دیئے اور کہا کہ تمہیں جس سامان کی ضرورت ہو مجھے لکھ کر دے دیا کرو میں لادوں گا۔ بس وہیں سے دونوں میں جنگ کا آغاز ہوا۔ اب اکثر ایسا ہوتا کہ گھر میں کھانا نہیں بنتا۔ جس روز ایسا ہوتا، وہ محلے کے ہوٹل میں جا کر کھانا کھاتے۔ انہیں دیکھ کر ہوٹل مالک کا جوان بیٹا مسکراتا اور کہتا "کیوں چچا! آج پھر چچی سے جھگڑا ہوا کیا؟"

وہ کچھ جواب نہ دیتے اور خاموشی کے ساتھ کھانا زہر مار کرتے رہتے۔

عقیل میاں نے جب سے پیسے اپنے ہاتھ میں رکھنے شروع کیے تب سے بچت بھی ہونے لگی۔ ان کے دوست رحمت میاں ایک دوسرے بینک میں کیشیئر تھے۔ انہوں نے اس بینک میں اپنا ایک نیا اکاؤنٹ کھلوایا اور اس میں بچی ہوئی رقم جمع کرنے لگے۔ جب وہ رقم کچھ بڑھی تو اسے فکسڈ ڈیپوزٹ میں ڈال دیا۔ انہوں نے اپنے بینک کا پاس بک، چیک بک اور فکسڈ ڈیپوزٹ کے کاغذات رحمت میاں کے پاس ہی رکھ چھوڑے اور جانو بی بی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دی لیکن وہ بھی ایک ہی کائیاں تھیں۔ انہیں کسی طور عقیل میاں کی یہ چالاکی معلوم ہو گئی اور وہ ایک روز بینک پہنچ گئیں۔ انہوں نے بینک منیجر سے کہا کہ میں فلاں کی بیوی ہوں اور مجھے ان کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات درکار ہیں۔ منیجر نے کہا کہ میڈم! ہم اپنے گاہکوں کے بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات کسی کو نہیں بتاتے خواہ وہ ان کے سگے سمبندھی ہی کیوں نہ ہوں۔ جانو بی بی اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئیں لیکن اس کے بعد ان کے حملوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ عقیل میاں اب زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہا کرتے۔

اس طرح کئی سال گذر گئے۔ انہیں کوئی اولاد بھی نہ ہوئی جو اُن کے درمیان پُل کا کام کرتی۔ دونوں اپنی اپنی دنیا میں مگن تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ عقیل میاں کی جمع پونجی بھی بڑھتی گئی۔ لیکن بڑھتی عمر کے ساتھ وہ کئی امراض کا شکار بھی ہوتے گئے۔ بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا۔ ذیابیطس نے انہیں آ دبوچا اور دل نے زور زور سے دھڑک کر وارننگ دینا شروع کر دیا۔ لیکن وہ اپنی صحت کی جانب سے لا پروائی برتتے گئے۔ دونوں کی زندگی یوں ہی لشتم پشتم گزر رہی تھی کہ ایک دن میاں عقیل سوئے تو سوئے ہی رہ گئے۔

دستورِ زمانہ کے مطابق جانو بی بی نے چند روز تو سوگ منایا پھر زندگی معمول پر آ گئی۔ عقیل مرحوم کے دفتر کی جانب سے ان کے بقایاجات ضروری کارروائی کے بعد جانو بی بی کو ادا کر دیئے گئے۔ جب جانو بی بی کے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو گئی تب انہیں بیوگی کے فوائد کا اندازہ ہوا۔ اب انہیں عقیل میاں کے خفیہ اکاؤنٹ کی فکر ہوئی۔ رحمت میاں کے جی میں آیا کہ وہ ساری چیزیں عقیل میاں کے بیوہ کے حوالے کر دیں لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ اس عورت کو کچھ دن اور پریشان ہونے دیں۔ جب کچھ اور وقت گذرا تو عقیل مرحوم کی پس انداز کی ہوئی رقم کے بارے میں سوچ سوچ کر جانو بی بی کی بے چینی بڑھنے لگی اور تب انہوں نے اپنی سب سے قریبی سہیلی گڑیا رانی کو بلا کر ساری بات بتائی اور کہا کہ عجیب

آدمی تھے۔ پتا نہیں کہاں کہاں پیسے رکھ چھوڑے تھے اور مجھے بتائے بغیر مر بھی گئے۔ اب میں کیا کروں؟" سہیلی نے انہیں مشورہ دیا کہ شہر کے کنارے جو عامل بابا ہیں، ان کے پاس چلا جائے۔ وہ روح کو بلانے کا کام کرتے ہیں۔ اگر ان کے بلانے سے تمہارے مرحوم شوہر کی روح آ گئی تو اس سے پوچھ لینا۔ جانو بی بی کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور انہوں نے وہاں جانے کا ارادہ کر لیا۔ چنانچہ ایک دن دونوں عامل بابا کے پاس پہنچیں۔

عامل بابا شہر سے دور ایک بڑے ہیبت ناک مکان میں رہائش پذیر تھے جس میں باہر ایک برآمدہ تھا اور اندر کئی چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ جس وقت یہ دونوں وہاں پہنچیں تو وہاں پر عقیدت مندوں کا ہجوم موجود تھا۔ یہ دونوں بھی نمبر لگا کر بیٹھ گئیں اور اپنی باری کا انتظار کرنے لگیں۔ کافی دیر بعد جب ان کا نمبر آیا تو ایک مرید نے انہیں اشارہ کیا۔ وہ دونوں مرید کے ہمراہ اندر داخل ہوئیں۔ پورے کمرے میں ایک پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور لمبی جٹاؤں والے عامل بابا ایک سیاہ لبادے میں ملبوس، گلے میں منکوں کی کئی مالائیں ڈالے فرش پر بچھے شیر کی کھال پر جلوہ افروز تھے۔ جانو بی بی نے جب ان کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا تو ان کی آنکھیں سرخ ہو گئیں اور انہیں نے غراتے ہوئے کہا "کسی کی روح کو بلانا اتنا آسان نہیں۔ جب تک کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہوتا میں یہ کام نہیں کرتا۔"

جانو بی بی نے ان کے پیر پکڑ لیے اور ہچکیوں سے روتے ہوئے اپنی بپتا کچھ اس انداز میں بیان کی کہ عامل بابا کا دل پگھل گیا اور انہوں نے بی بی کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا "" "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ میں تمہارے شوہر کی روح کو تھوڑی دیر کے لیے بلا دوں گا۔ تم آج سے ساتویں روز سات بج کر سات منٹ میں سات کالی چیزیں سات سات کی تعداد میں لے آ کر آنا۔ سات کالے مرغے، کالے دھاگے کی سات ریل، کالے تل کے سات دانے، سات فٹ لمبی سات چھڑیاں کالے رنگ میں رنگی ہوئی، کالی روشنائی کی سات بوتلیں، اپنے سر کے سات بال اور سات میٹر کالا کپڑا۔"

جانو بی بی نے ساری باتیں ذہن نشیں کر لیں اور حسب ہدایت مقررہ وقت پر ساری مطلوبہ چیزیں لے کر حاضر ہو گئیں۔

اچھے سے اسپتال کا تم پوچھتے تو ہو
یہ جاں کا ہے وبال فقط اپنے رسک پر
میں مشورہ تو مفت میں دیتا ہوں مہرباں
پر جانا اسپتال فقط اپنے رسک پر

عامل بابا اس وقت باہر والے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنے ایک مرید کو اشارہ کیا۔ اس نے جانو بی بی سے ساری چیزیں لے لیں اور اندر والے کمرے میں رکھ آیا۔ اس کے بعد عامل بابا بھی اندر چلے گئے۔ جانو بی بی اپنی سہیلی کے ساتھ باہر والے کمرے میں بیٹھی رہیں۔ سارے مرید ان دونوں کو وہاں چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ کمرے میں بیٹھی دونوں سہیلیاں گھبراہٹ کا شکار ہو رہی تھیں اور ہر گذرتا لمحہ ان کی گھبراہٹ میں اضافہ کر رہا تھا۔ کافی دیر بعد وہ مرید جو سامان اندر لے کر گیا تھا، باہر نکلا اور جانو بی بی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا'' آپ کو باباجی اندر بلا رہے ہیں۔''

یہ سن کر جب دونوں اُٹھنے لگیں تو اس نے ثریا رانی کو روکتے ہوئے کہا'' صرف یہ اندر جائیں گی، آپ نہیں۔''

دونوں سہیلیوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر جانو بی بی دل کڑا کے تنہا ہی اندر والے کمرے میں داخل ہوئیں۔ اندر پہنچتے ہی ان کا دل دہل کر رہ گیا۔ کمرے کی دیواریں بالکل کالی تھیں۔ سامنے ایک اونچی سی میز تھی جس پر سات موم بتیاں جل رہی تھیں۔ میز پر ان کی لائی ہوئی تمام چیزوں کے ساتھ سات کھوپڑیاں اور سات ہڈیاں قرینے سے رکھی تھیں۔ مرغوں کی گردنیں کٹی ہوئی تھیں اور ان سے خون ٹپک ٹپک کر فرش پر گر رہا تھا۔ پورے کمرے میں کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی اور عامل بابا جھوم جھوم کر کچھ پڑھ رہے تھے۔ جانو بی بی کے سارے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور ان کے جی میں آیا کہ یہاں سے بھاگ کھڑی ہوں لیکن ایک انجانی طاقت نے ان کے پاؤں جکڑ لیے تھے اور وہ اپنی جگہ کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد بابا نے آنکھیں کھولیں اور کھڑے ہوتے ہوئے بولے'' گھبراؤ مت۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ تم ان موم بتیوں کو دیکھتی رہو۔ جب یہ بھڑک کر بجھ جائیں تو سمجھ لینا کہ تمہارے شوہر کی روح آ گئی ہے۔ پھر اس سے جو پوچھنا ہو پوچھ لینا۔ لیکن یاد رہے۔ سات منٹ سے زیادہ وہ روح یہاں نہیں رہے گی۔ جب یہ موم بتیاں خود بخود جل اُٹھیں تو سمجھنا کہ روح واپس چلی گئی ہے۔ تب تم اس کمرے سے نکل آنا۔''

اتنا کہہ کر عامل بابا باہر چلے گئے اور جانو بی بی نے موم بتیوں پر نگاہیں جما دیں۔ تھوڑی دیر بعد کمرے میں سرسراہٹ سی پیدا ہوئی اور ساری موم بتیاں یکبارگی بھڑک کر بجھ گئیں اور پھر عقیل میاں کی آواز ابھری'' کیا بات ہے؟ کیوں بلایا ہے مجھے؟؟''

عقیل میاں کی آواز سن کر ان کی ڈھارس بندھی اور انہوں نے نرم لہجے میں کہنا شروع کیا'' تم تو چلے گئے مجھے اکیلا چھوڑ کر۔ اب میں کس کے سہارے جیوں گی۔ چار پیسے ہاتھ میں ہوں تو کچھ آسرا رہتا ہے۔ تم نے کہاں کہاں پیسے جمع کیے مجھے بتایا تک نہیں۔ اگر وہ معلوم ہو جائے تو میرے حق میں بہتر ہوگا۔ ویسے بھی اب وہ پیسے تمہارے کس کام کے۔''

جانو بی بی اتنا کہہ کر چپ ہو گئیں۔ عقیل میاں کی روح نے جلدی جلدی انہیں سب کچھ بتا دیا۔ جانو بی بی نے ساری باتیں غور سے سنیں اور پھر چلتے چلتے پوچھ بیٹھیں'' اور بتاؤ، وہاں کیا حال ہے؟ ٹھیک ٹھاک ہو نا؟؟''

'' بالکل ٹھیک ہوں۔ آرام سے ہوں۔ مزے میں ہوں۔ کوئی کچ کچ نہیں، کوئی جھنجھٹ نہیں۔''

جانو بی بی نے حسرت بھری آواز میں پوچھا'' اچھا۔ یہ بتاؤ جنت کیسی جگہ ہے؟''

'' مجھے کیا پتا، میں تو جہنم میں ہوں۔''

اور اس کے ساتھ ہی ساری موم بتیاں ایک ساتھ جل اُٹھیں۔

اقبال حسن آزاد کا تعلق صوبۂ بہار (بھارت) سے ہے۔ بسلسلۂ ملازمت مونگیر میں مقیم ہیں۔ گزشتہ چالیس برسوں سے افسانے لکھ رہے ہیں۔ اب تک افسانوں کے تین مجموعے'' قطرہ قطرہ احساس'' (۲۰۰۵)، ''مردم گزیدہ'' (۲۰۰۵) اور'' پورٹریٹ'' (۲۰۱۷) شائع ہو چکے ہیں۔ چوتھا مجموعہ'' اوس کے موتی'' زیرِ ترتیب ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے خصوصی کرمفرما ہیں۔

نقد و نظر

مزاح مت

کے ایم خالد
kmkhalidphd@yahoo.com

خیالوں کی دنیا کتنی وسیع ہے۔ یہ آپ کی اپنی دنیا ہے۔ دنیا کی منافقت، ریاکاری اور جھوٹ سے پاک۔ سیاستدان ہوں یا مختلف شعبہ ہائے زندگی کی شخصیات، سب ''پبلک پراپرٹی'' ہیں ان پر بات کرنا بائیس کروڑ عوام کا ''جبری حق'' ہے۔ ''حدادب'' رہتے ہوئے ''خیالوں میں موصول'' ہونے والی کتابوں پر تبصرہ حاضر ہے۔

نوٹ: تبصرے کے لئے کتب کا نہیں خیال میں آنا ضروری ہے۔

دھرنے اور باراتیں

کتاب کا سرورق بینڈ باجوں، دولہا اور دلہن کی رنگین تصاویر سے مزین ہے جس سے کتاب کھولنے سے قبل ہی ایک تازگی کا احساس ہوتا ہے کتاب میں جابجا ماضی اور حال کے سیاسی شخصیات کی تصویریں ہیں بعض تو سہروں کی لڑیوں سے جھانک رہے ہیں اور کچھ فوٹو شاپ کا شاخسانہ محسوس ہو رہے ہیں۔ مصنف جی'' اے برکات'' نے پوری کتاب میں سارا زور اس بات پر دیا ہے کہ دھرنوں اور باراتوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ مصنف لکھتے ہیں'' حکومت کو اب ڈی چوک کے اس مقام پر سکیورٹی کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے جہاں پر دھرنا دیتے ہوئے ایک سیاسی پارٹی کے رہنما نے اپنی شادی کی دعا کی تھی اور یہ دعا نئے پاکستان سے پہلے ہی منظور ہوگئی تھی اب بہت سے نوجوان اس مقام کے آس پاس دعا مانگتے اور مختلف درختوں، سپریم کورٹ کے جنگلوں اور پریڈ گراونڈ کی سیڑھیوں پر منت کا دھاگہ باندھتے پائے گئے ہیں'' مصنف مزید لکھتے ہیں'' حکومت اگر کنٹینرز کو اسی مقام پر کھڑا کرنے کی اجازت دے دے تو منت مانگنے والے نوجوانوں کا منت کا دھاگہ باندھنے میں مشکل پیش نہ آئے اور چڑھاوے کے طور پر حکومت کے خزانے کو فوری ریلیف مل سکتا ہے جس''۔ مصنف نے سابق حکومت کے دور میں ایک ''خادم'' کی مبینہ شادی کو بھی دھرنوں کی وجہ قرار دیا کیونکہ ''خادم'' نے اس دور میں وفاقی حکومت کے خلاف نہ صرف دھرنوں کی دھمکی دی بلکہ ایک دو دھرنوں میں عوام کے ساتھ یک جہتی کے طور پر شریک بھی ہوئے۔ مصنف نے جہاں بہت سے سیاسی رہنماؤں کی شادیوں کا ذکر کیا وہاں مصنف نے ایک فلمی شخصیت مدیحہ شاہ نامی فلم''

حکومت کو اب ڈی چوک کے اس مقام پر سکیورٹی کی زیادہ ضرورت محسوس ہو رہی ہے جہاں پر دھرنا دیتے ہوئے ایک سیاسی پارٹی کے رہنما نے اپنی شادی کی دعا کی تھی اور یہ دعا نئے پاکستان سے پہلے ہی منظور ہو گئی تھی، چنانچہ اب بہت سے نوجوان اس مقام کے آس پاس دُعا مانگتے اور مختلف درختوں، سپریم کورٹ کے جنگلوں اور پریڈ گراونڈ کی سیڑھیوں پر منت کا دھاگہ باندھتے پائے گئے ہیں۔

ایکسرا۔لیں" کا ذکر بھی کیا ہے کہ اس بے چاری کی شادی بھی یوں لگتا ہے جیسے ہزاروں برسوں سے رکی ہوئی تھی حالیہ دھرنوں کے اچھے اثرات کی بدولت وہ بھی اپنے پیا دیس سدھار گئی ہیں۔ مصنف کھر نامی سیاست دان کے بارے میں بتانے سے قاصر ہے کہ اس کی مبینہ شادیاں کس کے خلاف دھرنوں کا شاخسانہ تھیں اور "شیخ صاحب" نامی سیاستدان پر ان دھرنوں کے اثرات کیوں کر مرتب نہیں ہوتے۔؟

میں، ڈینگی اور وہ

ڈینگی کا خیال ذہن میں آتے ہی خادم اعلی کا تصور ابھرتا ہے۔ کتاب کا سرورق دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جس پر خادم اعلی کو ڈینگی کا تعاقب کرتے دکھایا گیا ہے۔ کتاب پر مصنف کا کوئی نام درج نہیں ہے۔ مگر کتاب کے "بغور" مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے "میں" سے مراد ظاہر ہے خادم اعلی ہی ہونگے۔ ڈینگی سے مراد ڈینگی ہی ہے۔ اور "وہ" سے مراد بہت سے وہ ہیں۔ جن پر سے انہوں نے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ کتاب میں جا بجا ڈینگی اور خادم اعلی کی رنگین تصویریں ہیں۔ جن میں ڈینگی زیادہ ہیڈسم دکھائی دیتا ہے۔۔ لکھنے کو کتاب ڈینگی پر لکھی گئی ہے مگر

وہ کون ہے جس نے ڈینگی جیسے عفریت کو پنجاب میں دھکیلا۔ اس میں کون سا ملک اور اور اپنے ملک کی کون کون سی شخصیات ملوث ہیں۔ یہ اب صیغہ راز میں نہیں رہے گا۔ پھر جلی حروف میں درج ہے اس سے جلد پردہ اٹھا دیا جائے گا۔

کتاب کے تقریباً ستر فی صد حصہ میں وفاقی حکومت کی کارکردگی پر تنقید ہے۔ کتاب میں بہت سے مقام پر حبیب جالب کے اشعار سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اور کہیں کہیں تھوڑی بہت "تحریف " بھی فرمائی گئی ہے۔

ایسے دستور کو، صبح بے نور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا
ڈینگی سے مغرور کو، ایسے ناسور کو
میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا

مصنف نے مشہور زمانہ کبوتروں کی کہانی جو کہ ایک جال میں پھنس گئے تھے اور ایک دانا کبوتر کے مشورے پر جال سمیت اڑ گئے تھے۔ اس کہانی کو مصنف نے ایک سیاسی کہانی کا درجہ دیا ہے۔ مصنف کے مطابق اس کہانی سے فی زمانہ یہ سیاسی سبق ملتا ہے کہ کسی بھی دوسری سیاسی جماعت سے "یونفیکیشن گروپ" کسی بھی وقت جال سمیت اڑایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ یہ پریکٹس نہ صرف ایک آمر کے دور میں کام یاب ہو چکی ہے اور فی زمانہ اس سے گڈ گورننس بھی مستفید ہو چکی ہے۔

کتاب میں ڈینگی سے متعلق معلومات کا بیش بہا خزانہ موجود ہے۔ وکی پیڈیا سے اٹھائی گئی تحقیق اور معلومات کا کریڈٹ مصنف نے لپیٹنے کوشش کی ہے۔ مگر بہت سی جگہ پر مصنف وکی پیڈیا کا نام ہی کھرچ نہ سکا۔ کتاب کے آخر میں مصنف نے "وہ" سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ کون ہے جس نے ڈینگی جیسے عفریت کو پنجاب میں دھکیلا۔ اس میں کون سا ملک اور اور اپنے ملک کی کون کونسی شخصیات ملوث ہیں۔ یہ اب صیغہ راز میں نہیں رہے گا۔ پھر جلی حروف میں درج ہے اس سے جلد پردہ اٹھا دیا جائے گا۔ پنجاب انتظامیہ کے کون سا افسر ایسے تھے جنہوں نے ڈینگی کے پھیلاؤ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ اور ڈینگی کے خلاف سپرے

کے ''دھوئیں'' سے لاکھوں کمائے۔ کتاب کے پیش لفظ میں ایک اہم اعلان کیا گیا تھا کہ کتاب کے آخر میں کرپٹ افسروں کے نام شائع کئے جا رہے ہیں مگر آخری صفحہ پر یہ تحریر ہے۔ ''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ کرپٹ افسران حروف ابجد میں موجود ہیں

> **مصنف نے سابق حکومت کے دور میں ایک ''خادم'' کی مبینہ شادی کو بھی دھرنوں کی وجہ قرار دیا کیونکہ ''خادم'' نے اس دور میں وفاقی حکومت کے خلاف نہ صرف دھرنوں کی دھمکی دی بلکہ ایک دو دھرنوں میں عوام کے ساتھ یک جہتی کے طور پر شریک بھی ہوئے۔**

۔اور اس موجود کو باہر نکالنے میں خادم اعلیٰ کو کوئی دیر نہیں لگے گی۔ کتاب کے آخر میں خادم اعلیٰ نے پنجاب انتظامیہ کا شکریہ ادا کیا ہے کہ ملازمین ان سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ وہ ان کو معطل بھی کر دیں تو وہ پھر بھی نہیں کھسکتے۔ کتاب میں یہ خوش خبری بھی سنائی گئی ہے کہ خادم اعلیٰ کی سرکاری ٹونٹی میں ایک ڈینگی کو قید کرتے ہوئے تصویر کو ایک بین الاقوامی ادارے نے اپنے اگلے سال کے آنے والے کیلنڈر میں شامل کیا ہے۔ یہ ادارہ مچھروں کے خلاف سپرے بناتا ہے۔ یہ کتاب خادم اعلیٰ کی اپنی ''کاوش'' محسوس ہوتی ہے۔

لوٹے اور اڑانیں

تازہ موصول ہونے والی خوبصورت سرورق سے کتاب جس پر لوٹوں کے چہروں والے پرندے اڑانیں بھر رہے ہیں۔ کتاب میں میں لوٹوں کی اڑانیں بھرنے کی تازہ ترین کاروائیاں درج ہیں۔ کتاب میں مصنف کے نام کی بجائے ایک لوٹے کے قلم سے درج ہے۔ کتاب کا انتساب ''دنیا میں پہلے لوٹے کے نام'' درج ہے۔ چونکہ کتاب کافی ''کھول کر'' لکھنے کی کوشش کی گئی ہے لیکن چونکہ صیغہ راز میں ہمارا رہنا اور ان کا رکھنا مجبوری ہے۔ اسی لئے ہم بطور مبصر محتاط رویہ اپناتے ہیں۔ مصنف کے خیال میں اس کا آغاز مغلیہ دور سے ہوا۔ جب مختلف کاموں کے لئے کبوتروں کو استعمال کیا جانے لگا۔ پہلے پہل کبوتروں کی جونسل جاسوسی کے لئے استعمال کی گئی ان کے نتائج بہت شاندار تھے۔ مگر پھر بغیر سوچے سمجھے عاشق معشوق کے لئے استعمال کئے جانے والے کبوتروں کو جاسوسی کے لئے استعمال کیا گیا۔ یہ کبوتر چونکہ اچھی خوراک کے دل دادہ تھے۔ اس لئے ان کبوتروں کو جہاں اچھی خوراک ملی وہیں بیٹھتے چلے گئے۔ اور راز دشمن کے پاس جاتے رہے۔ مصنف نے مشہور زمانہ کبوتروں کی کہانی جو کہ ایک جال میں پھنس گئے تھے اور ایک دانا کبوتر کے مشورے پر جال سمیت اڑ گئے تھے۔ اس کہانی کو مصنف نے ایک سیاسی کہانی کا درجہ دیا ہے۔ مصنف کے مطابق اس کہانی سے فی زمانہ یہ سیاسی سبق ملتا ہے کہ کسی بھی دوسری سیاسی جماعت سے ''یونیفیکیشن گروپ'' کسی بھی وقت جال سمیت اڑایا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ یہ پریکٹس نہ صرف ایک آمر کے دور میں کامیاب ہو چکی ہے اور فی زمانہ اس سے گڈ گورننس بھی مستفید ہو چکی ہے۔ مصنف کے خیال میں لوٹے والی اصطلاح اب پرانی ہو چکی ہے۔ اب تو جس کا ''چھجا'' مضبوط اور ''دانہ دنکا'' کا ''کھلار'' زیادہ ہو گا سیاسی پرندوں کی اڑانیں بھی اسی کی طرف ہونگی۔ چونکہ اب ''جھیلیں'' خشک ہو چکی ہیں اس لئے مہمان پرندوں کی ڈانوں میں بھی تیزی آتی جا رہی ہے۔

> فکشن اور ڈرامے کی دنیا میں کے ایم خالد صاحب کا نام تعارف کا محتاج نہیں۔ خاصے طویل عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔ بہت سے ٹیلیویژن چینلوں سے ان کے ڈرامے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ پی ٹی وی سے ان کا ایک مزاحیہ پروگرام خاصے طویل عرصہ تک مسکراہٹیں بکھیرتا رہا۔ بہت سے رسائل میں ان کے مضامین شائع ہوتے ہیں۔ ایک قومی اخبار میں ''مزاح۔مت'' کے عنوان سے کالم بھی لکھتے ہیں۔ ''ارمغان ابتسام'' کی مجلسِ مشاورت کے نہایت اہم رکن ہیں۔

میں نے چابی نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب میں چابی نہ تھی۔ وہ دور کھڑی مسکرا رہی تھی جیسے کوئی بچہ کسی ساتھی سے چیونگم چھین کر اُسے ''چھیڑ'' رہا ہو۔

''چابی تو میرے پاس ہے اور تم جانے کی تیاری کر رہے ہو۔۔۔ بہتر ہے اپنا ''موڈ'' ٹھیک کر لو کیونکہ غصہ میں میں کیا کچھ بک دیتی ہوں آپ کو اس بات کا اندازہ ہے۔''

''اب تو مجھے جانا ہے کیونکہ تم انسان کی چاہے وہ تمہیں کتنا بھی عزیز ہو بے عزت کرتے ہوئے پریشان نہیں ہوتی حالانکہ تم جیسے ذہین لوگ ایسی باتوں پر بہت خیال رکھتے ہیں۔۔۔ کاش تم میں یہ نقص نہ ہوتا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''اچھا۔۔۔ یہ سردار کے گاؤں سے چلغوزے آئے ہیں!'' اُس نے پلیٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا۔۔۔ یہ تم نے مولوی کی بیٹی کے ساتھ اچھا تو نہیں کیا وہ بیچاری محلے بھر میں تمہاری وجہ سے بدنام ہوئی۔''

''چلو اگر تم مناسب سمجھتے ہو تو اس نقطہ پر Debate کر لیتے ہیں تمہیں پتہ ہے مولوی صاحب اپنی اس خوبصورت بیٹی کی جو کالج تک تعلیم حاصل کر چکی ہے، شادی اپنے بڑے بھائی کے اَن پڑھ، بدصورت اور عمر میں کہیں بڑے بیٹے کے ساتھ کرنا چاہتے تھے اور میں اس بے انصافی کے شدید خلاف ہوں حالانکہ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ اس معاشرے میں عورت کو آج بھی مرد سے دو Step کم از کم نیچے رہنا چاہئے یہ ہی ہمارے ارد گرد کا ماحول تقاضہ کرتا ہے۔۔۔ ایک اور بات بتاؤں ہر ماں باپ چاہتا ہے کہ اُن کا بیٹا اِدھر ڈگری لے اُدھر اُسے کسی اہم عہدے پر سرکاری جاب مل جائے حالانکہ تم پڑھے لکھے ہو اور سمجھتے ہو کہ CSS کرنے کے بعد بھی ایک ڈیڑھ سال کسی جاب پر لگنے میں صرف ہو جاتا ہے اور CSS سے پہلے بھی ڈیڑھ دو سال پوری توجہ اور صاف نیت سے پڑھنا پڑتا ہے۔۔۔ تیاری کرنی پڑتی ہے۔ میں نے یہ بات جان بوجھ کر محلے میں پھیلا دی تھی کہ زاہدہ عاقل خان کو پسند کرتی ہے اور دونوں آپس میں شادی بھی کرنا چاہتے ہیں اس میں ایسی کون سی بات تھی یہ تو مولوی صاحب نے خواہ مخواہ شور مچا دیا اپنی بدنامی کی اور محلے بھر میں مجھے رسوا کرنا چاہا۔۔۔ بدر صاحب اس معاشرے میں عورت اور مرد آج بھی پچاس سال پہلے سطح پر کھڑے ہیں آج بھی وہ عورتیں جنھوں نے شادی سے پہلے اپنے منگیتر تک کو جی بھر کے یا یوں کہہ لو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھا اور ماں باپ نے جہاں شادی کر دی چپکے سے روانہ ہو گئیں لیکن زندگی کے آخری بیس سال وہ دن رات

استغفار کرتی ہیں کوئی نماز لیٹ نہیں کرتیں تسبیح ہاتھ میں رکھتی ہیں اور پورے خشوع وخضوع کے ساتھ نہ صرف پانچ وقت کی نمازیں پڑھتی ہیں بلکہ ہر نماز کے بعد تسبیح اور درود شریف کا ورد جاری رکھتی ہیں۔۔۔ستائیسویں رات ہو، شب برأت ہو یا کوئی بھی اسلامی دن وہ پوری پوری رات اپنے اللہ کو راضی کرنے میں صرف کر دیتی ہیں جب کہ مرد چاہے ساٹھ سال کا ہو اُس کی آنکھ میں شرم حیا نام کی چیز زیادہ محسوس نہیں ہوتی۔۔۔نظر نہیں آتی۔۔۔ میں نے کئی بڑی عمر کے سفید داڑھی والے ''بابوں'' کو دیکھا ہے کہ وہ کالج سکول جاتی لڑکیوں کو بُری طرح گھورتے ہیں اپنی عمر اور اُن معصوموں کی معصومیت کا بالکل خیال نہیں کرتے اور پھر بھی محلے بھر میں معزز کہلاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محلے کی سبھی عورتیں اُن کی عزت کریں اُنھیں قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھیں حالانکہ وہ عورتیں جو تھوڑی بہت دنیا دار ہیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے ''بابوں'' کی حرکات وسکنات پر نظر رکھتی ہیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی بہت اُن کی عزت کر ڈالتی ہیں۔''

''تم نے تو آج عورتوں کی خوب وکالت کی ہے اور ایک مختلف اینگل سے کی ہے اور دبے لفظوں میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم نے مردوں پر آج خوب کیچڑ اُچھالا ہے!''

وہ پھر بولی ''رہی بات عاقل خان کی زاہدہ سے شادی اور محلے بھر میں رسوائی کی۔۔۔ اس سلسلہ میں میرا موقف آج بھی ٹھیک ہے اور میں اس پر فخر کرنے میں حق بجانب ہوں کیونکہ مولوی صاحب وہ ایک CSP آفیسر کے ساتھ نہایت خوشگوار زندگی گزار رہی ہے اور اس رشتے سے مولوی صاحب، اُن کے خاندان کا، اُن کے ملنے جلنے والوں کا رہن سہن کہیں بہتر ہوا ہے۔''

میں نے اُٹھنا چاہا تو اُس نے مجھے پکڑ کے پھر بیٹھنے کو کہا اور خود جیپ کی طرف چلی گئی تھوڑی دیر میں وہ جیپ سے پیسے سمیٹ کر لائی اور اُس نے نوٹوں کی تہہ لگا کر میرے سامنے رکھ دی اور بولی ''بدر یہ ایک کروڑ دس لاکھ روپے ہیں تم یہ پیسے لے جاؤ کیونکہ جس قدر بڑی اور خوفناک لڑائی کا میں نے آغاز کر دیا ہے وہ کوئی بھی رُخ اختیار کر سکتی ہے پروین کا بیٹا نادر بہرحال بڑے لیول کا جرائم پیشہ تو ہے نا۔۔۔ اور پروین کے شہر بھر کے جرائم پیشہ لوگوں سے پرانے تعلقات ہیں اور بہت سے بڑے سرکاری آفیسر اُس کے ملنے والے ہیں جو اچھے بُرے وقت میں اُس کے کام آتے رہے ہیں مجھے بھی جب کبھی بڑی مصیبت پڑی تو میں نے پروین کے

کتابیں اور کاغذ مہنگا ہونے سے شاعر اپنا کلام نہ چھپوا سکیں گے اور باعزت زندگی گزاریں گے۔ ہمارے ایک فلمی شاعر کے بقول غلطیوں کے علاوہ ہماری شاعری میں کوئی چیز اوریجنل نہیں۔ اگرچہ کاغذ بڑی صابر شے ہے۔ سچ بھی سہ جاتا ہے پھر بھی فی زمانہ کسی بھی کتاب کا سب سے قیمتی صفحہ اس کا خالی صفحہ ہی ہوتا ہے۔ ہمیں تو شاعری کی کتاب پڑھنے کی بجائے بقول جون ایلیا شاعروں کا ''گانا'' سننے مشاعروں میں جانا پسند ہے۔ ہمارے پسندیدہ شاعر مظفر وارثی ہیں جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اور دوسری یہ کہ ان کا ترنم بہت اچھا ہے۔ احمد فراز کی بھی آواز ہمیں پسند ہے لیکن ان کی دو سے زیادہ غزلیں ایک وقت میں سن لیں تو مہاسے نکل آتے ہیں۔ مشاعروں کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ زخمی کان پوری کی بیوی نے ایک بار کہا: ''کب سے کہہ رہی ہوں ٹماٹر لا دو۔'' بولے: ''بیگم تھوڑی دیر اور صبر کر لو۔ شام کو مجھے مشاعرے پر تو جانا ہی ہے۔'' البتہ کچھ شاعر مشاعروں میں لکھا ہوا پڑھتے ہیں۔ ہم نے ایک شاعر سے اس کی وجہ پوچھی تو بولے: ''لوگ کہنے لگے تھے مجھے لکھنا نہیں آتا۔'' دیکھا آپ نے الفاظ کس طرح زخمی کرتے ہیں، خصوصاً اس وقت جب آپ کی بیوی آپ پر ڈکشنری دے مارے۔

مزاح پارے از ڈاکٹر محمد یونس بٹ

تعلق والے لوگوں کو استعمال کیا وہ جادو گرنی ہے اور ایسی عورتیں جب میدان میں آجائیں اور کسی کام کو کرنے کی ٹھان لیں تو پھر وہ پوری طاقت اُسی کام میں لگا دیتی ہیں اور ہار نہیں مانتی ۔۔۔دوسری طرف مجھ جیسی جاہل عورت بھی ہار کہاں مانے گی اور پھر چل سوچل۔۔۔وہ سنجیدہ تھی مگر حسب عادت قہقہے بھی لگا رہی تھی۔۔۔میں یہ پیسے اس لیے تمھیں دے رہی ہوں کہ حالات جو بھی رُخ اختیار کریں اور جہاں جہاں مشکل وقت آئے تم یہ نوٹ پھینک کر وہاں سے گزر جانا میرے اور اپنے لیے راستہ بناتے ہوئے۔"

میں نے پانچ ہزار کے نوٹوں کا ایک پیکٹ پکڑا اور گنتی شروع کردی۔

"کیا فضول کام شروع کردیا ہے تم نے۔۔۔یہ نوٹ گنے ہوئے ہیں اور یہ تو بتاؤ کیا تمھیں مجھ پر اعتبار نہیں میں پھر بھی ان سنی کر کے نوٹ گنتا رہا میں نے ایک نوٹ مروڑ کے دہرا کردیا تین چار نوٹ کے بعد ایک اور نوٹ دہرا کردیا ایک کاپی میں پندرہ نوٹ جعلی تھے۔اُس کا رنگ فق ہوگیا اُس کے چہرے پر مجھے ہوائیاں اُڑتی ہوئی محسوس ہوئیں اس کا مطلب ہے کہ ۷۵ ہزار کے نوٹ جعلی ہیں باقی نوٹ کا کیا حال ہوگا؟

"چھوڑ دو، چھوڑ دو۔۔۔اس وقت تم نے نا چاہتے ہوئے بھی میرا "موڈ" خراب کردیا ہے یہ لو پکڑو چابی وہ کھڑی ہے تمھاری گاڑی۔۔۔جاؤ کام کرو میں خود ہی سب کچھ دیکھ لوں گی، میں خود ہی سب سے لڑلوں گی مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔"

اِس دوران فون کی گھنٹی بجی اُس نے موبائل پکڑا اور "جی جی" کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ میں نے گھر کا مین گیٹ بند کیا اور اپنی گاڑی اسٹارٹ کی میں نکلنے ہی لگا تھا کہ پولیس کی دو گاڑیاں تیزی سے ادھر ہی آتی ہوئی دکھائی دیں۔ میں مخمصے میں پڑ گیا اور لمحے بھر کے لیے پریشان ہوا کیونکہ ڈرائنگ روم میں اتنے نوٹ کھلے پڑے تھے اور اُن میں نا جانے کتنے جعلی تھے اور یہ بھی پتہ نہیں کہ باقی کے نوٹوں میں صورتحال کیا ہو میرے ذہن میں ایک نیا خوف طاری ہوگیا تو گویا فیمی مجھے اپنے ساتھ بینک محض اس لیے لے جا رہی تھی کہ یہ نوٹ میں بینک میں ڈیپازٹ کرواں تا کہ اگر بینک کا عملہ سورہا ہو یا اُنھوں نے آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو تو وہ یہ اصلی اور جعلی Mix نوٹ As it is وصول کرلیں اور اگر اُنھیں نوٹ گنتے ہوئے رنگ میں بھنگ محسوس ہو تو وہ فیمی کی بجائے مجھے پکڑ لیں اور میں سیدھا سادھا انسان کسی بڑے کیس میں دھر لیا جاؤں لیکن فوری طور پر تو مجھے یہ سوچنا تھا کہ پولیس کے دو گاڑیاں جو اس تیزی سے آرہی ہیں تو صورتحال کیا ہوگی اور اگر وہ دیوار پھلانگ کر اندر چلے گئے اور اُنھیں یہ نوٹ مل گئے تو وہ یقیناً اس کا کوئی منفی پہلو تلاش کرلیں گے اور پولیس والوں کو تو ویسے بھی ایسی چیزوں کی "بُو" محسوس ہو جاتی ہے اور ہر ایسی جگہ پر شک کرنا تو اُن پر جیسے فرض ہو؟"

میں نے فوری طور پر وہاں سے نکل جانے کا فیصلہ کیا کیونکہ مجھے اپنی بچت نکل جانے میں ہی محسوس ہو رہی تھی میں نے گاڑی کو چابی لگائی اور اسٹارٹ کرتے ہی اندھا دھند نکل پڑا۔

اِس دوران میں نے دیکھا سامنے سے کالے رنگ کی بڑی سی سبز نمبر پلیٹ والی گاڑی آتی دکھائی دی اُس کے پیچھے اسکورڈ والی گاڑی بھی تھی جس میں پولیس والے تھے جنھوں نے اپنی گنوں کی نالیاں باہر نکالی ہوئی تھیں۔

حافظ مظفر محسنؔ صاحب کا تعلق لاہور سے ہے۔ میں بچپن سے اِن کی کہانیاں اور نظمیں بچوں کے مختلف رسائل میں پڑھتا چلا آرہا ہوں۔ بچوں کے ادب میں اِن کا حصہ قابلِ ستائش ہے۔ بہت اچھے شاعر اور کالم نگار ہیں۔ ان کے کالم ایک مؤقر اخبار میں "طنز و مزاح" کے عنوان سے مسلسل شائع ہو رہے ہیں۔ مزاح نگاری اِن کا خصوصی میدان ہے۔ طنز و مزاح پر مبنی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اِن کے اندازِ تحریر میں شگفتہ بیانی، بیساختگی اور ڈرامائی عناصر وافر پائے جاتے ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کے لئے بہت عرصہ سے لکھ رہے ہیں۔

قسطوں قسط

چوتھی لڑی

قصۂ چہار درویشنیں

شفیق زادہ

اور یہیں سے شروع ہوتی ہے خالو کی ''درگت دی گریٹ''۔

اگلے سال موسلا دھار بارشوں کے بھیگے موسم میں دونوں خالاؤں نے مل کر ''نیو گھر آرڈر'' کی سازش میں ایک اور ٹیم ممبر کا اضافہ برداشت کرلیا۔ سوتنوں کی اِس تگڑم نے چنڈال چوکڑی کا روپ دھارنے میں صرف چند مہینے اور لیے۔ چھوٹی والی نے اپنی کم عمری اور نسب میں چھوٹے خاندان کے بل پر خالو کی ہنڈیا سے بچا کچھا مال ملیدہ صرف اپنے ہی نام کرنے کی جو سعی نا تمام کی، وہ تگڈم نے کمالِ صفائی سے ناکام بنا دی۔ پھر ہوا یوں کہ ریاست کے تین ستونوں، مقننہ، عدلیہ اور انتظامیہ میں آج کل جس بدمعاشی اور دھڑلے سے میڈیا گھس آیا ہے، اسی کی نقالی پر چھوٹی نے بھی شروع شروع میں اندرونِ خانہ کا انتظام و انصرام اپنے ہاتھ میں لینے کی غیر جمہوری کوشش کی۔ اُس کے انداز اور ہتھکنڈوں کو پہلے تو ''مثلثِ افواجِ ازواج'' نے نظر اندازی کے اوزار سے قابو کرنے کی کوشش کی، جس کو محترمہ پسپائی سمجھ بیٹھیں اور ناز اور نخرہ کے مصالحے سے پورے گھر پر سکہ جمانے کی کوشش شروع کی۔

اُن کا گمان تھا کہ میاں جی کے دل میں اگر پرانی والیوں کے لیے مزید گنجائش ہوتی تو بھلا مفتوحہ کرنے کے لیے منکوحہ بنا کر رال گراتے میرا گھونگٹ اُٹھانے اور ''منتھ سیریز'' ناولوں کی ٹریڈ مارک رسم کی ادائیگی کی زحمت کیوں گوارا کی جاتی۔ اس خود پسند خود اعتمادی نے اُنھیں کوئی نفع تو نہ پہنچایا، مگر تجربہ کار سوتنیں کلا بتو کی طرح سے اُٹھتے بیٹھتے اُلجھنے لگیں۔ وہ جب شوہرِ نامدار سے مدد کی طالب ہوئیں تو ٹکا سا جو

> حالات کے بے رحم تھپیڑوں پر جیتے، خود ناراضی کا شکار اپنے آپ سے لڑتے ایک شخص کی کہانی، جس نے زندگی سے انتقام لینے کی ٹھانی ہوئی تھی، چاہے اِس کوشش میں چاہت اور چہیتے ہی کیوں نہ بھسم ہو جائیں۔ جدید دور کی ایکتا کپوری ٹرینڈ! چار شرعی بیویوں کا دھماکہ خیز اتحاد، جس نے راہ میں آنے والی ہر رکاوٹ کا توڑ ابورا کرنے کی ٹھانی ہوئی تھی۔ رومانویت اور مزاح کا حسین امتزاج، جس میں چار بیویاں اپنے اکلوتے شوہر پر دعویدار ہیں۔ چہار درویشنیں حالات کا وہ آئینہ جس میں ہر مرد کو اپنی عکسی خواہش نظر آسکتی ہے جسے مسخ کرنے کے لیے زنانہ بریگیڈ بھی میسّر ہوتی ہے۔

جواب ملا، اِس کا مطلب اُنہوں نے یہی اخذ کیا کہ میرے، تمہارے اور ہمارے تعلقِ زن وشو میں کوئی کجی ہے تو اظہار کرو، عاجز ہر ممکن راحت بہم پہنچانے کی سعی کرے گا۔ ازدواجی حد بندی کے باہر کے تمام معاملات میں کسی طرح کی دخل اور عمل بشمول حمل بندۂ عاجز کے دائرۂ افکار اور اختیار سے ماورا ہے۔ جو کچھ سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی، اُس کے لیے اِس کٹھن چپڑ مشکل لشکری زبان کی ضرورت ہرگز نہ تھی، جو کہ نائیکاؤں اور بازارِ حسن کے دلالوں اور بھاڑوؤں نے بھی عرصۂ دراز ہوا ترک کر دی۔ آسان سا مطلب تھا ''ہم تم ہوں گے، بادل ہوگا، رقص میں سارا جنگل ہوگا''، دورانِ رقص اگر پیروں پر نظر پڑ جائے تو تمہارے آنسوؤں میں ہمیں کوئی دلچسپی نہیں۔ مشکل الفاظ کھرچ کھرچ کر جو مطلب واضح ہوا تو یہ کہ تم اپنی جنگ لڑو اور ہمیں طلبِ نشاط سے عاجز نہ کرو کہ زندگی کے دن چھوٹے سہی، مگر راتیں طویل بنائی جاسکتی ہیں۔ اس تعمیری کام میں اگر مدد کر سکو تو ٹھیک، ورنہ ؎

ہم ہیں راہی پیار کے ہم سے کچھ نہ بولیے
جو بھی راہ میں ملا ہم اُسی کے ہو لیے

چھوٹی خالہ کو خود سے سینئر تینوں سکھی سہیلیوں کے مزاحمتی عزم دیکھ کر ماجرا سمجھنے میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ تنہا رہ جانے کا غم اور آنے والی مہیب تنہائی کے احساس نے اُنہیں سمجھا دیا کہ بقا کے لیے سہاگ نہیں، بلکہ کھڑاگ کی ضرورت ہے، جس کے لیے جوگنوں کا جھمگٹا جوائن کرنا ہی پڑے گا۔ وہ بغیر کسی مزید حیل و حجت، پکّے آم کی طرح ٹپک کر اِس گروہ برائے تحفظِ حقوقِ سوتناں میں شامل ہوگئیں، جس پر فی الوقت شوہر کے نسیاں کا پردہ گرا ہوا تھا۔

خالو اکثر اسٹیٹ بینک کی پالیسیوں پر سر دھنتے تھے کہ جس نے نوٹوں پر اکسیر جملہ لکھوایا، ''حاملِ ہذا کو مطالبہ پر ادا کرے گا''۔ ہر خالہ کو یہ حکم تھا کہ نکاح نامہ کی ایک مائکرو کاپی تعویذ کی موم جامے میں باندھ کر منگل سوتر کی طرح ہر وقت اپنے گلے میں طوقِ سہاگن بنا کر لٹکائے رکھیں۔ خود خالو بھی چار مائکرو نقلیں تیار کرا کر ہمہ وقت شلوار کی جیب میں رکھتے تھے۔ انہوں نے بشری اور بدنی کمزوری کی وجہ سے خاص اہتمام کیا تھا کہ ہر نقل پلاسٹک کوٹڈ مگر نوکدار کونے والی نہ ہو۔ تمام خالاؤں کو شادی کی پہلی رات کو ہی معجّل اور موجّل مہر ہڑپ (بہ صورت زور و زبردستی یعنی رضا بالجبر) کرنے کے بعد اگلی ہدایت برائے خوشگوار ازدواجیات کرنسی نوٹ کی اکسیر عبارت کے مطابق دیتے کہ اب خالاؤں کی نتھ اور نکیل اُن کے ہاتھ میں تھی اور یہ معاملہ عین حلال بھی تھا۔ نکاح اور نکاح نامہ کی موجودگی میں تمام خالاؤں کے لیے اسٹیٹ بینک کی کرنسی ادائیگی والی پالیسی پر عمل کرنا لازمی قرار تھا۔ وہ اکثر اپنے دوستوں کے حلقے اور خالاؤں کی سہیلیوں کے جھرمٹ میں خود کو حاملِ ہذا سے متعارف کرواتے اور انگشتِ شہادت کا اشارہ موقعۂ واردات پر موجود کسی خالہ کی طرف ہوتا۔

خالو نے گھر میں کیبل ٹی وی کا کنکشن لگوا لیا تھا، اُن کے خیال میں دو سو روپے میں لاکھوں کے مزے، سودا مہنگا نہیں تھا۔ یہی سب دیکھنے کے لیے ہی تو جاگیر سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ کاش! اِس قسم کی ٹیکنالوجی کچھ عرصہ پہلے آجاتی تو کوٹھے جا کر گانا سننے اور ناچ اور ننجا گریبان دیکھنے کے شوق میں مال و متاع نہ لٹانا پڑتا۔ اب ایکتا کپوری انڈین ڈرامے دن میں خالاؤں کی عملی تربیت اور انگلش بے ہودہ قسم کے لیٹ نائٹ ایڈوینچرز خالو کے رت جگے کا سامان تھے۔

رات بھر کے جگے ہوئے تماشبین خالو کو دن بھر خالاؤں کے نیچے تلے اور با مقصد وار سہنے پڑتے۔ وہ ہر دو منٹ میں بازار کو دوڑائے جاتے کہ تین نمبر کو سات سو سات نمبر کا صابن اور دو نمبر کو ایک نمبر کی مرچی کی ضرورت ہوتی۔ ابھی ایک چکر لگا کر فارغ

فیض احمد فیض کے انتقال کے بعد ایک اخبار کے رپورٹر نے منیر نیازی سے کہا ''فیض احمد فیض کے انتقال کے بعد جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پُر کرنے کی ذمہ داری اب آپ پر عائد ہوتی ہے، اِس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''
اِس پر منیر نیازی نے انکسار سے جواب دیا ''یہ تو آپ لوگوں کی عنایت ہے ورنہ میں تو فیض صاحب کی زندگی میں ہی اُن کا خلا پورا کرتا رہا ہوں۔''

بھی نہ ہوتے کہ دوسری بیوی کوئی تیسرا کام بتا کر چکراتے خالو کو چوتھی کے حوالے کر دیتی۔ عورتوں کو کم عقل اور بشری کمزوریوں سے بھرپور سماجی جانور سمجھنے والے خالو کو سماجی جانوروں کی ماداؤں نے سہاگ کے سماجی رشتے سے باندھ کر انور رٹول بنا کر پلپلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ خالو اپنے ہی پیدا کردہ حالات کے آنول ڈور کا شکار ہو گئے تھے، جو پھندا بن کر اَب اُن ہی کے گلے میں لپٹ رہا تھا۔ ڈاکٹری زبان میں بولے تو ''اِن ٹینگل منٹ''۔ فلم ''چارلیز انجلز'' کے برعکس خالو کو تین کی بجائے چار خوبرو، مگر خرانٹ خوخیاتی خواتین یعنی بکمل و مستعد بیویوں کے خودکش حقوق حاصل تھے۔

تمام خالاؤں نے اپنی ایکتا اور جوڑ سے مل جل کر خالو حضور کی درگت بنا دی تھی۔ حوا کی بیٹیوں نے شوہر کا ہوا ختم کرنے کے لیے اِکٹھ کر لیا تھا۔ ویسے بھی اگر غور کیا جائے تو آپ بھی مان جائیں گے کہ سانپ سے کوئی کتنا ہی خوف کھائے، مگر پھر بھی وقت پڑنے پر لاٹھی سے مار مار کر بھرکس نکالنے کو تیار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ لیکن اگر کہیں سانپ کے چار منہ ہو جائیں تو بندہ بشر تو نظر پڑتے ہی بے ہوش ہو جائے۔ یہاں پر تو اُن کا پالا چار انسانوں سے تھا، بلکہ انسان کی سب سے خطرناک شکل عورت سے، جو کہ بیک وقت منکوحہ بھی تھیں اور سوتن بھی۔ اوّل الذکر صورت میں مفتوح اور بعد الذکر صورت میں ناگن کی خصلت رکھنے والی اِن چہار درویشنیوں نے خالو کو ایوانِ صدر کا مکین بنا کر آئینی اور شرعی حق سے بھی محروم کر دیا تھا۔ اب خالہ اوّل 'ون وومن آرمی' نہیں رہیں، بلکہ 'سواٹ' ٹیم ممبر بھی تھیں۔ وہ بیک وقت رہنما بھی تھیں اور وقت پڑنے پر رہزن بھی۔

ڈھلکتی عمر کے ساتھ نہ تو خالو کا لونڈیار پن غائب ہوا، نہ ہی شوہرانہ حقوق کو سود خور لالہ کی طرح باقاعدگی سے بے قاعدہ وصولی کی عادت۔ اِن چاروں کو یقین ہو چلا تھا کہ خالو نے شادی کا بندھن صرف اس لیے گوارہ کر لیا تھا کہ اِس بہانے چار بے زبانوں کو قید و بند کر کے وقت بے وقت مفت میں ازدواجی کیرم بورڈ کے مزے لُوٹ سکیں۔ مگر اِدھر تو معاملہ ہی اُلٹا ہو گیا اور خالو اسٹرائیکر سے کیرم بورڈ کی کوئن بن کر رہ گئے تھے۔ چاروں خالاؤں نے ایک ٹیم کی صورت اپنے جوڑ اور بناؤ سے اپنے اکلوتے حامل بِذا کی خوب رگڑ گھس شروع کر دی۔ رگڑائی اور رگیدنے کے اِس کدّ و کش عمل میں نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ پہلے سے موجود کوئی پتلون کمر پہ ٹکنے کو تیار نہ تھی اور پیٹی باندھنے کی صورت میں آخری سوراخ پر بھی پتلون بمشکل ٹکتی۔ کمر کے لحاظ سے خالو چالیس اور پچاس کی دہائیوں کی ہالی وڈ فلموں کی ہیروئن نظر آتے اور باقی جسامت سے اکیسویں صدی کے ٹھگنے اور مین پوری کے مارے فرہاد۔ ہر اگلے نکاح کو اپنی مردانہ طاقت کا اعجاز سمجھنے والے خالو کو چوتھی بیوی کے چوتھے والے روز ہی احساس ہو گیا تھا کہ اُن کے ساتھ ہاتھ ہو گیا ہے۔ خالو کے بال اور فطری خواہش تیزی سے کم ہونا شروع ہو گئے۔ جب اس کمی نے وزن کا رُخ اختیار کیا اور پتلون ڈھیلی پڑنے لگی تو خالو کو ریڈ لائٹ جھلمل کرتی نظر آنے لگی اور وہ سوچنے پہ مجبور ہو گئے کہ کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ ان بیبیوں نے خالو کو شطرنج کے بادشاہ کی طرح کونہ پکڑوا کر ضیق کرنا شروع کر دیا تھا۔

بے چارہ مرد اور وہ بھی زن گزیدہ، نہ گھر کا رہا، نہ باہر والیوں کا۔

وقت مُون واک کرتا پھسلتا گیا، جس کے ساتھ ساتھ چہار درویشنیں بھی ایک دوسرے کے نقشِ پا کے تعاقب میں عمر کی منزلیں طے کرتی ادھورے پن کا بوجھ اُٹھائے آگے بڑھتی گئیں۔

شفیق زادہ کراچی کے ایک علم دوست گھرانے کے چشم و چراغ ہیں۔ طنز و مزاح و فکشنل تھرلر کے دشت کے سیاح ہیں۔ قلم کو آنکس کی طرح استعمال کر کے ہنسانے اور رلانے کا فن جانتے ہیں۔ ان کی پہلوٹھی کی کتاب ''ہم تماشا'' فکاہیہ ادب میں قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ''پیارے میاں'' کے کردار کے خالق شفیق زادہ روٹی، روزگار اور روزی یعنی بھابھی کے لیے پردیس میں بسے ہوئے ہیں۔ یقیناً وہ قہقہہ سازی کے ضمن میں ''ارمغانِ ابتسام'' کے لئے ایک شاندار اضافہ ہیں۔

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

شام آئی رونقیں ہیں دکانوں کے آس پاس
ہیں روزہ دار جمع پکوڑوں کے آس پاس

مُنّے میاں ہیں عشق کے چکر میں جیل میں
ابا پھریں کچہریوں تھانوں کے آس پاس

ڈھونڈو نہ اُن کو نرگسی آنکھوں کے قُرب میں
ہیں ماہرانِ چشم تو بھینگوں کے آس پاس

جب روزگار کا ہی وسیلہ نہیں رہا
نائی تمام مر گئے گنجوں کے آس پاس

میک اپ زدہ دلہن سے تھا دولہا کا یہ سوال
وہ تل کہاں گیا ترا گالوں کے آس پاس

سب دودھ اپنا بیچ کے کنگال ہو گئیں
پھرتی ہیں بھینسیں اب تو گوالوں کے آس پاس

مستانہ چال کے سوا کچھ بھی نہیں رہا
کیا ڈھونڈتے ہو تم نرے کھسروں کے آس پاس

روشن چراغ کیجئے اندھوں کے شہر میں
بھونپو نہیں بجایئے بہروں کے آس پاس

خفیہ پولس نے کھینچ کے پیچھے کھڑا کیا
پڑھنے نہ دی نماز وزیروں کے آس پاس

عبداللطیف کی تو ہنسی بند ہو گئی
جھوٹی ہنسی ہے جاری لطیفوں کے آس پاس

فوارے یہ ہنسی کے ہیں اشکوں کی اِک پھوار
مظہر نہ ڈھونڈنا انہیں پلکوں کے آس پاس

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

عشق میں ایسی ہوئی مارکٹائی اپنی
ہم نے مشکل سے بڑی جان بچائی اپنی

قیس مفلس نہیں رہتا جو "پلاننگ" کرتا
عمر صحرا میں یونہی اُس نے گنوائی اپنی

اُس نے انکل جو کہا دل ہ قیامت ٹوٹی
کام کچھ ائی نہ داڑھی کی رنگائی اپنی

سر کے بل کوچہ محبوب میں جانے کے سبب
بج گئی ماتھے پہ ہی آبلہ پائی اپنی

رہی لے لی ہے بس اب بکرا ہے لینا باقی
"ہم بھی دیکھیں گے کہاں تک ہے رسائی اپنی"

بکرے والے نے دکھائی نہ لچک قیمت میں
اور قائم رہی ویسی ہی ڈھٹائی اپنی

میلے کپڑوں سے مرے مالِ تہمت لوٹا
ہو گئی ساتھ ہی جیبوں کی صفائی میری

مہر طے ہو نہ سکا مہر و محبت نہ رہی
بدلے کھانے کے ہوئی خوب پٹائی اپنی

داغ دھلنے کے نہیں ہیں یہ کسی سوپ سے بھی
پیش کرتے رہو بیگم کو صفائی اپنی

خاک کچھ اہلِ سیاست تجھے سمجھائیں گے
جن کو خود آپ سمجھ میں نہ ہو آئی اپنی

محفلِ شعر میں گویا تھا اسمبلی کا سماں
بس کسی نے نہ سُنا، سب نے سنائی اپنی

شاعری نے بھی ہمیں بخشی ہے عزت مظہر
ڈاکٹری ہی میں نہیں صرف کمائی اپنی

تنویر پھولؔ

ناز و ادا میاں کو دکھاتی ہیں بیویاں
ناراض ہوں تو دل کو جلاتی ہیں بیویاں

میکے سے آرہے ہوں اگر سالے سالیاں
کھانے مزے مزے کے پکاتی ہیں بیویاں

قسمت سے ان کو بدھو سا شوہر اگر ملے
دن رات اپنا حکم چلاتی ہیں بیویاں

کچھ بھی کرو، وہ کہتی ہیں تم نے کیا نہ کچھ!
اپنے میاں کو یوں بھی رلاتی ہیں بیویاں

ملنے سہیلیاں جو کبھی آئیں ان کے پاس
افسانہ غم کا اُن کو سناتی ہیں بیویاں

شوہر کو فون کرلے اگر کوئی نازنیں
طوفان ایک گھر میں اُٹھاتی ہیں بیویاں

ملتے ہیں کچے آم جو بازار میں انھیں
چٹنی ، اچار سب کو کھلاتی ہیں بیویاں

رہتی نظر ہمیشہ ہے شوہر کی جیب پر
باتیں بنا کے پیسے لٹاتی ہیں بیویاں

اُٹھتے ہی چائے مانگو تو جاتی کچن میں ہیں
بستر پہ لاکے چائے پلاتی ہیں بیویاں

ایسے بھی اپنے یار ہیں، مرغا بنے ہیں جو
ٹنگی کا ناچ اُن کو نچاتی ہیں بیویاں

اے پھولؔ! بیویوں کو محبت ہے پھول سے
جُوڑے میں اپنے پھول سجاتی ہیں بیویاں

تنویر پھولؔ

اُس کے گھر کا تو نہ دکھا رستہ عاشق کو
اُس کا ابا کر دے گا گنجا عاشق کو

عشق وہ کرسی سے کرتا ہے مجنوں جیسا
تخت بچھنا ، مل جائے گا تختہ عاشق کو

اُس کی گلی میں لوٹ رہا ہے ، جیسے کھوتا
کس نے دیا ہے چھوٹا پاجامہ عاشق کو

رات میں تارے گن گن کر وہ مرغ اُڑائے
غم نے اُس کے خوب کیا موٹا عاشق کو

عاشق کی آنکھوں میں دیکھو! خوں اُترا ہے
مت دینا تم خنجر یا برچھا عاشق کو

نام ریاض ہے، آتی نہیں ہے اُس کو ریاضی
عاشق صاحب ٹیچر، دو ڈنڈا عاشق کو

اُس کے ابا نے پالا ہے موٹا کتا
آنے دے گا در پر کیا کتا عاشق کو؟

فرقت میں محبوب کی اس کا حال برا ہے
لمحہ لمحہ لگتا ہے ہفتہ عاشق کو!

دولھا بن کر جلدی جائے ، دل تڑپا ہے
کوئی لاکر دے دے اِک گھوڑا عاشق کو

مرغی بنتا تو کچھ انڈے ہی دے دیتا !
پھولؔ ! بنایا کس نے ہے مرغا عاشق کو؟

سیّد فہیم الدین

کیجیے کوئی کام سڑکوں پر
آ نہ جائیں عوام سڑکوں پر

عشق میں یہ چلن بنایا ہے
دن محلے میں، شام سڑکوں پر

شاعری آ گئی ہے آؤٹ ڈور
کہہ رہے ہیں کلام سڑکوں پر

اب نہ لکھیں گے ساحلوں پر ہم
تیرا لکھیں گے نام سڑکوں پر

اک ٹرک سے لگا لیا ہے دل
بس کا انجن ہے جام سڑکوں پر

زندگی جیسے تاروں کی طرح
لمحہ لمحہ تمام سڑکوں پر

سیّد فہیم الدین

جو بندہ بھی نہیں ہو اُس کو دانشور بنا دینا
اور اپنے شہر میں دانشوروں کو خر بنا دینا

یہ ممکن ہے تمھارا اندرونی ایکسرے ہو، وہ
کہیں بھوسہ اگر دیکھو وہیں پر سر بنا دینا

پلاٹِ دل اگر خالی نظر آئے تو اے جاناں
یہ بہتر ہے کہ اپنا تم وہیں بستر بنا دینا

ہمارا کام ہے، خدمت عوامی کرتے رہتے ہیں
جہاں بھی امن دیکھا ہے وہیں پر شر بنا دینا

اُسے کہنا کہ ہے دعوت کوئی چھتر کبابوں کی
وہ جب ملنے چلا آئے، فقط چھتر بنا دینا

عرفان قادر

سکھا رہے ہیں "ایٹی کیٹس" جانور اُس کو
گدھا ہے عقل و خرد، لومڑی مکر اُس کو

جنابِ قیس بھی نکلا ہے عشق میں کورا
سمجھ رہے تھے سبھی یونہی ماسٹر اُس کو

یہ جانتے ہوئے ڈوبی تھی بھینس نیل میں ہی
تلاش کیوں کیا جاتا تھا کاشغر اُس کو؟

بنا دیا اُسے شاعر، جو تھا بھلا مانس
لگا دیا ہے، مری جان! کِس ڈگر اُس کو

گلی میں ہے نہیں باندھا ہوا کوئی بُلڈاگ
کُھلے گٹر نے بنایا ہے پُر خطر اُس کو

زمیں پہ بیٹھ گیا یونہی پالتی مارے
ملی نہ کوچہ دلدار میں چیئر اُس کو

نویں میں ہیر ہے پڑھتی، مَیں آٹھویں میں ہوں
مری دعا ہے خُدا سے کہ فیل کر اُس کو

نہ جانے کب وہ مری بات مان لے آخر
لگا چکا ہوں ابھی دو کلو "بٹر" اُس کو

ہمارے گھر میں اگر آئے گا کوئی مہمان
پلائیں گے کئی شعروں کا مکسچر اُس کو

ہے جب سے باس نئی آئی، میرے آفس میں
کبھی بھی کہہ نہ سکا بھول کر، میں "سر" اُس کو

عرفان قادر

ہر چیز کو ہے رکھا ہوا اعتدال میں
ہو دیگ یا پلیٹ نہیں، لاؤ تھال میں

ڈگری ہے گرچہ عشق و محبت میں قیس کی
پینڈو سا لگ رہا ہے مگر بول چال میں

مُرغی ہے گھر کی دال برابر اگر تو کیا؟
دِکھتی ہیں مُرغیاں ہمیں باہر کی دال میں

ہر اِک ہے فیس بک پہ زنانی بنا ہوا
دُنیا ہے مُبتلا ہوئی "قحط الرجال" میں

تھوپیں جو پاوڈر کی تہیں اُس کے سامنے
خود آئینہ بھی آنے لگا اشتعال میں

دیتا ہے سب کو داد ملی میٹروں میں کیوں؟
پھیلا ہوا ہے خود جو سوا دو کنال میں

لیلیٰ کو لے گیا ہے گھمانے مَری، مگر
ٹرخا دیا ہے ہیر کو دو سو کی شال میں

اُبلے ہوئے چنوں کی لگائے وہ چھابڑی
انجینئر جو بن نہ سکے آٹھ سال میں

کیوں "شاعرِ جنوب" اُسے کہہ رہے ہیں لوگ
گاؤں میں جس کا گھر ہے نہایت شمال میں

محمد خلیل الرحمٰن خلیق

میرے گھٹنے پہ بام ہو جائے
درد ایسے تمام ہو جائے

اتنا کالا ملے تجھے ساجن
تیرا ہر دن ہی شام ہو جائے

بیویوں سے جو ڈرتے رہتے ہیں
اُن کو میرا سلام ہو جائے

بے سُرے گیت اُس کے سُننے سے
نیند میری تمام ہو جائے

گاؤں میں اک فقیر کہتا تھا
ایک لسّی کا جام ہو جائے!

جب نہیں ہم مزاج مرد و زن
کس طرح انضمام ہو جائے؟

جس کی ریکھا میں کوئی شاعر ہو
اُس کا ''اُونچا'' مقام ہو جائے

دو مُلاؤں میں آ پھنسے جو بھی
پھر وہ مُرغی حرام ہو جائے

آج پھر اس مُشاعرے میں خلیقؔ
کیوں نہ ''تازہ کلام'' ہو جائے

محمد خلیل الرحمٰن خلیق

اب کے شوہر میں ہے جلال کہاں
زن مُریدی رہی وبال کہاں

کتنی موٹی ہے تُو نذیراں بی
اس جہاں میں تری مثال کہاں

کر لے شوگر نے جو بھی کرنا ہے
لاؤ برفی کا اب ہے تھال کہاں

اُس کی بیگم نے سب اُڑا ہی دیئے
دیکھ لو سر پہ اب ہیں بال کہاں

جو بتاتا متی ٹریل تمہیں
اُس کے جیسا ملے گا لال کہاں

نرم خُو کر دیا ہے شادی نے
تیری بھڑکیں، ترا جلال کہاں

مُجھ سے سو بار مچھلیوں نے کہا
''ہم اِدھر ہیں ترا ہے جال کہاں؟''

پھر غزل پڑھ رہا ہے وہ شاعر
یاد رہتا اسے ہے ''حال'' کہاں

کھا لیے سو پیاز سو جُوتے
تُو خلیقؔ اب بتا، ہے مال کہاں

نوید صدیقی

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے
دورِ حاضر میں بے ضمیر ہوئے

نہیں ملتی کہیں پہ عزت تک
ہو کے لیڈر بہت حقیر ہوئے

فیس بک کی سہولتیں کب تھیں
اس سے وڈر بہت شریر ہوئے

ایک مدت سے تھی نمود اپنی
نیب میں پھنس گئے، اخیر ہوئے

فائدے میں ہیں چند لوگ ابھی
جو کہ جرنیل، جج یا پیر ہوئے

نوید صدیقی

اصول ہے؟
فضول ہے

برا سہی
قبول ہے

ہمارا دل
ملول ہے

وہ سنگ ہے
وہ پھول ہے

امین بس
رسول ہے

زباں مری
ببول ہے

سخن ورو!
نزول ہے؟

عزیز فیصل

کمال یہ ہے کہ کوئی کمال ہوتا نہیں
اور اس بساط پہ دل کو ملال ہوتا نہیں

مری زبان ہے اتنی گریز حسن طلب
ہر ایرے غیرے کے آگے سوال ہوتا نہیں

زمانہ ساز کچھ ایسے بھی میرے شہر میں ہیں
محال کام بھی جن پر محال ہوتا نہیں

حصار حسن میں، بند ادا میں آئے بغیر
کوئی خیال بھی حسن خیال ہوتا نہیں

اجڑ گئے ہیں کئی پیڑ میری بستی کے
بیان مجھ سے پرندوں کا حال ہوتا نہیں

فراق یار ہے دراصل جائیداد جنوں
محبتوں کا اثاثہ وصال ہوتا نہیں

عزیز کوئی تو تجھ میں بڑی خرابی ہے
جو تیرا خود سے تعلق بحال ہوتا نہیں

عزیز فیصل

جیب کب اس کی یونہی خالی ہے
اس نے بیوی جو گھر میں پالی ہے

وہ پھر اک مالدار بوڑھے سے
ساٹھواں عشق کرنے والی ہے

اس کے دانتوں کے چند کیڑوں نے
اپنی اک یونین بنالی ہے

کتنے رانجھوں کو دے چکی ہے موچ
کوچہ ہیر کی جو نالی ہے

سر ہے میڈم مری کا ویسے ہی
گیند اندر سے جیسے خالی ہے

ایک گاڑی کے ایسے پہیے ہم
میں جنوبی ہوں، وہ شمالی ہے

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

کمنٹ در کمنٹ قیل وقال اوج پر ہے
ابھی فیس بک "خیر نال" اوج پر ہے

کسی وال پر سلفیاں سلفیاں ہیں
"مصور کا ذوقِ جمال اوج پر ہے"

یہاں ناقدوں کی کھپت تو نہیں ہے
مگر شاعروں کا جلال اوج پر ہے

نہ اصلاح کوئی غزل کی کرے گا
کہ بخیے اُدھڑنے کا مال اوج پر ہے

فقط چند نکتے عروضی ہیں ازبر
مگر اس کے فن کا کمال اوج پر ہے

مروت کا اک بھی نہیں شائبہ تک
مگر "چین دی۔۔" اشتعال اوج پر ہے

گہر جی ذرا منہ پہ تالا لگا دے
جھگڑنے کا یاں احتمال اوج پر ہے

گوہر رحمٰن گہر مردانوی

عشق سے مضروب بے جا بدگماں دیکھا ہوا
حضرت شاعر کو ہے ماتم کناں دیکھا ہوا

ہر کلام نو میں شکوہ ہے فقط محبوب سے
کوچۂ معشوق ہے اس نے کہاں دیکھا ہوا

دل تو بس دوران خوں رکھتا ہے ہردم تیز تر
کب بچارے نے ہے احساس زیاں دیکھا ہوا

آپ کے بھیجے میں گھستی تک نہیں باتیں مری
آپ سا پاگل نہیں میں نے یہاں دیکھا ہوا

دل تو کرتا ہے کہ دہلی چل کے آئیں تیرے پاس
شاؔز جی قسمے نہیں ہندوستاں دیکھا ہوا

بس کرو مردانوی گوہؔر کہ شاعر تم بھی ہو
تم نے کب ہے عشق کا کوہ گراں دیکھا ہوا

منیر انور

جوتا بازی کرتے جائیں الیکشن میں
جیسے "باندر کلہ" کھیلیں بچپن میں

جتنی "ساقی" نے بے سوچے بھر دی ہے
اتنی گنجائش ہی کب تھی برتن میں

مستقبل کے منظر میں یوں لگتا ہے
کوئی گریباں چاک پھرے گا "گلشن" میں

جانے اپنی "بک" میں اس نے کیا لکھا
جانے کیسا زہر بھرا ہے ناگن میں

کرسی کرسی کھیلنے والوں کی خاطر
ہم نے بھر لی نفرت اپنے دامن میں

کھوڑو سائیں پہ چھپڑ یوں برسے انورؔ
جیسے بن بادل برسات ہو ساون میں

محمد عارف

مرغ حلوے سے نپٹ کر گئے ترکاری پر
پھرتیاں خوب تھیں مولانا کی افطاری پر

کیا زمانہ تھا کتب ہوتی تھیں الماری میں
آج کل ہم نے اُٹھا رکھی ہیں الماری پر

کاش ہو جائے رقیبوں کی مرے یوں حالت
جیسے دُم بخت ہو بکرا کوئی "شتواری" پر

ٹھیک ہے آپ انھیں روک نہیں سکتے ہیں
سرزنش تو ہو کم از کم یہاں غداری پر

سائیکل مجھ کو چڑھائی پہ تھما دیتا ہے
خود چلائے تو چلاتا ہے وہ ہمواری پر

ہاشم علی خان ہمدم

چاند پہ کھینچا تانی کرتے عید کریں گے
دو ملاں یوں آگے پیچھے عید کریں گے

درزی مسجد جا بیٹھا ہے دس دن پہلے
ہائے میرے بچے کیسے عید کریں گے

میٹھی عید پہ میٹھے میٹھے لوگ ملیں گے
کھا کر برفی، لڈو، پیڑے عید کریں گے

مہنگے داموں بیچیں گے جو سستا سودا
عید سے پہلے ٹھیلے والے عید کریں گے

بیوی بچوں کو ٹالیں گے روزے والے
مہنگائی سے بچتے بچتے عید کریں گے

تبدیلی لائیں گے آخر شیدے میدے
ننھے منے، بھولے بھالے عید کریں گے

سسرائیل چلی جائیں گی ساری بلائیں
ماں کے پیارے راج دلارے عید کریں گے

کڑھتے رہیں گے بے بس شاعر اور صحافی
خاص لفافے لینے والے عید کریں گے

جس دن ہیریں شاپنگ کرنے گھر سے نکلیں
اس دن میرے شہر کے رانجھے عید کریں گے

خوش اسلوبی سے کاٹیں گے سب کی جیبیں
سیل لگا کر مال پلازے عید کریں گے

سنتے ہیں کہ اب کے برس بھی الیکشن ہو گا
ٹوٹے پھوٹے پ؟ر وہی لوٹے عید کریں گے

نتھو، خیرے، ماجھے، گامے ووٹر ہوں گے
وردی، پگڑی، ٹوپی والے عید کریں گے

ہمدم اس کو ہی میں یوم عید کہوں گا
جس دن میرے شہر کے بچے عید کریں گے

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

سبھی کہہ رہے ہیں سنواریں گے گلشن
بفضلِ خدا آ گیا ہے الیکشن

انہیں کی بدولت ہے سونا یہ آنگن
جنھیں اپنے دل کی سمجھتے تھے دھڑکن

سیاست کے ہیں یہ پرانے کھلاڑی
سبھی خود کو کہتے ہیں جو پاک دامن

بہاتے ہیں اب جو مگر مچھ کے آنسو
انھیں نے اُجاڑا ہے اپنا نشیمن

یہ وحشت کا ماحول ہے دین ان کی
تصور سے جس کے ہے بےچین تن من

لڑا کر ہمیں کررہے ہیں حکومت
سیاست میں ہیں جن کے آلودہ دامن

سبھی مِل کے رہتے تھے اپنے پرائے
ہمیں یاد آتا ہے اپنا وہ بچپن

نگاہوں سے اوجھل ہیں باغوں میں جھولے
ہے بارش کے موسم میں بے کیف ساون

کہاں کھو گئے دلنشیں وہ نظارے
ہے غایب نگاہوں سے اپنی وہ چلمن

نئی جن کی ہے اب بڑھاپے کی شادی
منانے ہنی مون جائیں گے لندن

اگر دیکھنا ہے انہیں اپنا چہرہ
کہو دیکھ لیں پھر سے جاکر وہ درپن

پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
الیکشن کے ہے نام سے مجھ کو الجھن

کسے ووٹ دیں، اور نہ دیں کس کو برقی
یہ رہبر نہیں عہدِ نو کے ہیں رہزن

شاہین فصیح ربانی

کہہ دو یہ حاکموں سے کہ سائل نہیں ہوں میں
ان کے کسی بھی فعل میں شامل نہیں ہوں میں

جو پوچھنا ہے، مجھ سے دھڑلے سے پوچھیے
ڈگری خرید رکھی ہے، جاہل نہیں ہوں میں

دکھلا رہا ہے موتیا آنکھوں میں اب بہار
اب تو تمہاری دید کے قابل نہیں ہوں میں

نازاں تو ہونا چاہیے کچھ میرے ساتھ پر
لیکن تمہارے پاؤں کی پائل نہیں ہوں میں

رستہ ہوں یا کہ سیڑھی کا اک پائیدان ہوں
یہ جانتا ہوں، آپ کی منزل نہیں ہوں میں

ہر دم رکھا ہے پیشِ نظر آپ کا مفاد
اور آپ کہہ رہے ہیں کہ لائل نہیں ہوں میں

تقسیم کا عمل ہوں، میں تفریق کا جواب
تم ایسا ضرب وجمع کا حاصل نہیں ہوں میں

قربان شاہِ وقت کرے مجھ پہ تاج وتخت
لیکن عذارِ حسن کا اک تل نہیں ہوں میں

کیوں مجھ کو دیکھتے ہی پریشاں ہو تم فصیح
بجلی کا، آب وگیس کا تو بل نہیں ہوں میں

نور جمشید پوری

گھر سے باہر کبھی وہ نکلتی نہیں
جب تلک آئینے پر سنورتی نہیں

پوت ڈالا ہے میک اپ کئی ٹن مگر
پھر بھی صورت تو ان کی نکھرتی نہیں

حسن زلفوں کا تب تک لبھاتا نہیں
ڈھل کے شانے پہ جب تک بکھرتی نہیں

ناز جب سے میاں سب اٹھانے لگے
پاؤں اپنے زمیں پر وہ دھرتی نہیں

ہوگئی جب سے بیوی کلکٹر، میاں
کام کرتا ہے سارے وہ کرتی نہیں

بھول سے آگئے گر کچن میں کبھی
کون سی ایسی روٹی جو جلتی نہیں

ملنا مشکل ہے بیوی جو ہر بات پر
آج اپنے میاں پر گرجتی نہیں

دل میں ان کے تھا طوفان کل تک مگر
اب تو کوئی تمنا مچلتی نہیں

ہم کو مرغا بناتے تھے استاد کل
کان بھی نسل اب کی پکڑتی نہیں

ایک عادت بتاؤں تمہیں نور کی
کر کے غلطی کبھی یہ اکڑتی نہیں

ڈاکٹر امواج الساحل

یہ عشق ہے جناب کہانی تو ہے نہیں
میں نے بھی یہ کسی کو سنائی تو ہے نہیں

کس واسطے چھپاتے رہے ہو تمام عمر
عینک نظر کی ہم نے چرائی تو ہے نہیں

رکھتے ہو کیوں سنبھال پرانے یہ کاغذات
محبوب گمشدہ کی نشانی تو ہے نہیں

ہوٹل میں لے کے آگئے تم مجھ کو کس لئے
دعوت یہاں پہ تم نے کھلائی تو ہے نہیں

ان ڈگریوں کو گھول کے پی جاؤں میں مگر
صحرا میں رہتے ہیں یہاں پانی تو ہے نہیں

اب ویڈیو پہ دیکھ لو محبوب جان کو
تصویر اس نے اپنی چھپائی تو ہے نہیں

کرتے ہو کیوں مذاق مری فائلوں کو تم
ہیں ورڈ کی یہ کوئی پرانی تو ہے نہیں

رخ کیوں کروں میں دریا کے پانی کا ایک دن
سوہنی کے ڈوبنے کی کہانی تو ہے نہیں

بچوں کو چھٹیاں ہیں تو ماں کو یہ فکر ہے
مصروف کیسے رکھوں گی نانی تو ہے نہیں

کیوں کر پڑھوں کیمسٹری اردو کو چھوڑ کر
اب اس میں کوئی چیز سہانی تو ہے نہیں

پنجاب جائیں کس لئے صحرا کو چھوڑ کر
دریا کے پانیوں میں روانی تو ہے نہیں

پڑھ پڑھ کے میں تو پاگلوں میں ہو گیا شمار
اب بس کرو کہ عمر گنوانی تو ہے نہیں

اب بس کرو یہ شاعری چھوڑو بھی اب صنم
اس دن کو اس نے جان بچانی تو ہے نہیں

جہانگیر نایابؔ

گاہے مشاعرے کا، اکثر مشاعرے کا
کرتا ہے تذکرہ وہ، دن بھر مشاعرے کا

کہتے ادب ہیں کس کو، اُردو زبان کیا ہے
کیوں اس سے رکھے مطلب، شاعر مشاعرے کا

ہے جو مشاعرے کے، ہر پینترے سے واقف
شاعر وہی ہے یارو، بہتر مشاعرے کا

اشعار کچھ نہیں ہیں، آواز کی بدولت
کس طرح چھا رہا ہے، شاعر مشاعرے کا

غزلیں اُدھار لے کر، مشہور ہو گیا "جو"
خود کو سمجھ رہا ہے "دلبر" مشاعرے کا

آئیں گے کتنے شاعر اور شاعرات کتنی
لیتا ہے آج کل وہ، بنڈر مشاعرے کا

اوریجنل ہیں شاعر، کتنے مشاعروں کے
میں حال جانتا ہوں، بہتر مشاعرے کا

کیسے مشاعرے میں، لینا ہے داد نایابؔ
آؤ تمہیں سکھا دوں، منتر مشاعرے کا

دلشاد نسیم

دیکھ کر لڑکی حسیں وہ آنے جانے لگ گیا
اور ڈھٹائی دیکھئے تحفے بھی لانے لگ گیا

تھی کڑاہی وہ مزے کی سیر ہو کے کھائی بھی
کھا کے کھانا وہ لبوری ہنہنانے لگ گیا

کہنے کو ہیں بیس دیواں یاد لیکن شعر دو
اور وہ ہی شعر شاعر تو سنانے لگ گیا

ماں نے لڑکی کی دکھائی تھی ابھی تصویر ہی
اور وہ گھر کو ابھی سے ہی سجانے لگ گیا

جب سے ابا نے کیا ہے نام میرے ایک گھر
وہ مری باتوں میں اب اکثر ہی آنے لگ گیا

تھے سبھی کے اپنے اپنے چاند پر اس عید یہ
میرے دل کا چاند کرتب بھی دکھانے لگ گیا

شہناز شازی

ہر سمت سیلفیوں کا ہے پھیلا بخار دیکھ
سیل فون کمپنیوں کا تو چڑھتا خمار دیکھ

ہاں عمر میں بڑا ہوں نذیراں تو کیا ہوا
ڈالر میں مل رہی ہے جو مجھ کو پگار دیکھ

بیگم فلرٹ کرنا بھی یونیک آرٹ ہے
تو مجھ پہ شک نہ کر مرا دسواں شکار دیکھ

گھٹنوں کیا ہے ویٹ ترا تپتی دھوپ میں
''تو میرا شوق دیکھ مرا انتظار دیکھ''

کیسی بساند پھیلی ہے قرب و جوار میں
ڈالا ہے آج گوبھی کا کس نے اچار دیکھ

آفس میں وائے فائے کنکشن لگا دیا
بیمار سو ہیں ان کے لئے اک انار دیکھ

اس کی نگاہ شُگنی کا ہے ایک ہی علاج
وہ ایک بار دیکھے تو تو بار بار دیکھ

گھٹنوں کا درد مول لیا تیرے عشق میں
لنگڑا کے چلتا ہے ترا اکشے کمار دیکھ

بجرنگی بھائی جان بنا ویزا پاسپورٹ
کیسے گیا سرنگ سے بارڈر کے پار دیکھ

قوس قزح کے رنگ ہیں سارے فلورسنٹ
ہر رنگ میں بسا مرے ایڈمنز کا پیار دیکھ

دیکھا ہے اس کے بھائی نے دونوں کو ساتھ ساتھ
عزت سے اپنے واسطے جائے فرار دیکھ

شازی نہ ہل چلا تو پرائی زمین وچ
بڑھتا ہے اس سے تیرے لہو کا فشار دیکھ

آثم پیرزادہ

ٹپکتی چھت کے تلے بیٹھ کر گزاری ہے
شب وصال کی بارش نے ریڑھ ماری ہے

سُنا ہے عشق کا انجام خودکشی ہے مگر
بغیر موت کے مرنا بھی کام بھاری ہے

مکان آدھا کرائے پہ لے لیا اُس کا
اب اُس کے ساتھ برابر کی حصہ داری ہے

ہمارے عہد میں مجنوں ہیں سینکڑوں لیکن
نہ اب وہ عشق ، نہ صحرا نہ آہ و زاری ہے

سکون گھر میں نہیں ہے تو کیا ہوا آثم
مصیبتوں سے تو دیرینہ رشتہ داری ہے

اسانغنی مشتاق رفیقی

اس دور میں ہر کوئی پریشان سا کیوں ہے
ظاہر میں سکوں ، اصل میں گھمسان سا کیوں ہے
مدت ہوئی نوٹس کوئی نکلا نہیں پھر سے
ماحول مرے شہر کا ویران سا کیوں ہے
شادی کی بھی تقریب میں رہتا ہے وہ غمگیں
اُجڑی ہوئی منڈی کا وہ بیجمان سا کیوں ہے
بنگلہ بھی ہے ، گاڑی بھی ہے ، بیوی بھی ہے سُندر
پھر بھی ترے چہرے پہ یہ شمشان سا کیوں ہے
کرتا ہے ہر اک شخص کو آداب وہ جھک کر
عادات میں حاکم مرا دربان سا کیوں ہے
لگتا ہے تو کھاتا ہے بہت عمدہ دوائیں
واعظ! تری تقریر میں ہیجان سا کیوں ہے
کیا تجھ کو خبر ہے کہ میں زردار نہیں ہوں
مسجد میں بھی یوں مجھ سے تو انجان سا کیوں ہو
ایوب تو صابر تھے، مگر تیرا یہ حلیہ
ہاتھوں میں طمنچہ لئے افغان سا کیوں ہے
راون ترے اوتار کے اب کیا ہیں ارادے
کُرسی کے لئے مودی پریشان سا کیوں ہے
دل بدلو رہا تو بھی تو، کل پنچھ کنول آج
یوں میرے بدل جانے پہ حیران سا کیوں ہے
داڑھی بھی وہ رکھتا ہے، مسلماں بھی نہیں ہے
وہ شخص مگر شکل میں شیطان سا کیوں ہے
گُل پھینکا ہے بیگم نے میں سمجھا تھا یہ لیکن
سر پر جو گرا آکے تو گلدان سا کیوں ہے
سُنتے ہیں وہ رستم تھا بڑا شادی سے پہلے
اب چہرے پہ اُس دولہے کے یرقان سا کیوں ہے
پڑھ کر میرے اشعار ، وہ ہنستے ہوئے بولے
مشتاق رفیقی تو نمکدان سا کیوں ہے

ڈاکٹر محمد اشرف کمالؔ

ایک آواز چیختی ہے ابھی
کوئی دیوار سے گری ہے ابھی

پھر پڑوسن نے ہنس کے دیکھا ہے
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

قرض واپس بھی مل ہی جائے گا
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

شور برپا ہے ٹیلی ویژن میں
کوئی تازہ وکٹ اُڑی ہے ابھی

سبزی کھانے سے جی نہیں بھرتا
لنچ میں روسٹ کی کمی ہے ابھی

پیٹ میں چوہے دوڑتے ہیں کمالؔ
بھوک پھر زور کی لگی ہے ابھی

اقبال شانہؔ

بلاتے بلاتے سحر ہو گئی
اُنہیں آتے آتے سحر ہو گئی

مناتے مناتے سحر ہو گئی
قریب آتے آتے سحر ہو گئی

سرِ شام حمام میں گھس گئے ہیں
نہاتے نہاتے سحر ہو گئی

میں کھا نہ سکا شب خیالی پلاؤ
پکاتے پکاتے سحر ہو گئی

شبِ وصل ہے یا چنے آہنی ہیں
چباتے چباتے سحر ہو گئی

سمجھ نہ سکا رات بھر بات اُن کی
سمجھ آتے آتے سحر ہو گئی

وہ شانہؔ ہے یا قہقہوں کا ہے طوفاں
ہنساتے ہنساتے سحر ہو گئی

روبینہ شاہین بینا

دیکھا ہے اب کے بار عجب سین عید پر
بیٹھے میاں بھی ہو گئے نمکین عید پر

پچھلے برس جو عید پہ نوشی کے ساتھ تھا
اس بار مل گئی اسے نوشین عید پر

چینی ملا کے اور بھی میٹھا کریں اسے
جی چاہتا ہے ہم بھی چلیں چین عید پر

پوپل، منیب، آئنہ دیکھا ہے بار بار
دیکھے ہیں ہم نے چاند بھی دو تین عید پر

خراٹے لینے کے سوا آئے نہ کام کچھ
پھر کس رہے ہیں کس لئے وہ زین عید پر

اصلی ہیں سانپ جن کے نہ اصلی پٹاریاں
بینا بجا رہے ہیں وہی بین عید پر

روبینہ شاہین بینا

حلوہ کھا کر کرتا ہے جو شوگر سے پرہیز
ایسے دو رنگے کردار سے، لیڈر سے پرہیز

بیگم جی بی پی کم کرنے کا نسخہ ہے بس
مرچ مصالحے، نمک، موبائل، شوہر سے پرہیز

بھوک ہڑتال ختم کر دی ہے چارے نے آج
آخر کب تک منا کرتا فیڈر سے پرہیز

فیل نہ ہوں تو ہو جاتے ہیں تھرڈ ڈویژن پاس
کرتے ہیں جو کالج میں بھی ٹیچر سے پرہیز

گپ لگانی ہے تو جا کر مردانے میں بیٹھ
کر تو زن مرید، نکھٹو، نوکر سے پرہیز

کھیل تماشا یوں نہ برپا ہوتا دیس میں آج
سنجیدہ ہو کر جو کرتے جوکر سے پرہیز

قومی خسارا آخر تو نے پورا کرنا ہے
بل نہ پرکھنا پیارے صارف، میٹر سے پرہیز

ان کو سمجھانا مشکل ہے بیناؔ سچی بات
برساتی مینڈک نہ کریں گے ٹرٹر سے پرہیز

نوید ظفر کیانی

گن افسروں کے شوق سے گا لو مرے عزیز
دُم کو بھی گاہے گاہے ہلا لو مرے عزیز

درکار کس لئے ہے ائر ویز کا ٹکٹ
خود کو ہی تم جہاز بنالو مرے عزیز

لو پھر مرا وجود نشانے پہ آ گیا
ارمان اپنے دل کے نکا لو مرے عزیز

پسلی کہاں ہے تم میں بھلا جذبِ عشق کی
بھولے سے بھی یہ طوطا نہ پا لو مرے عزیز

کرنے لگا ہے قتل تمھارے بھلے کو وہ
چپ چاپ اپنے سر کو جھکا لو مرے عزیز

یہ ہیکلیٔ ہجر ہے یا کیڑے پیٹ کے
بہتر ہے ڈاکٹر سے دوا لو مرے عزیز

مونچھیں ہیں گھر کی کھیتی، بہت منہ لگاؤ مت
چاہے بڑھا لو، چاہے گھٹا لو مرے عزیز

اِس باب میں معاون ہیں حالاتِ حاضرہ
جگتیں طرح طرح کی لگا لو مرے عزیز

اب دیکھ لو کہ باجے ہے کتنا گھٹا ظفر
کس نے کہا تھا تھوتھا چنا لو مرے عزیز

نوید ظفر کیانی

چار سو بیس تھا بچپن میں بھی
نرا لیڈر ہے وہ پچپن میں بھی
صرف میک اپ ہی کیا ہے یا پھر
دے کے منہ آئی ہے روغن میں بھی؟
جب بھی آئے سرِ دستِ بیگم
ایک پیغام ہے بیلن میں بھی
یہ سمجھ میں نہیں آتا، کیسے؟
لوگ جی لیتے ہیں پنشن میں بھی
مسکرا کر مجھے جب دیکھتی ہو
دُم ہلا دیتا ہوں فوراً میں بھی
صرف لوہار نہیں ہیں صاحب
ویسے سریا تو ہے گردن میں بھی
دور بینیں وہیں نظروں کی ہیں
کیوں جھلکتا ہے وہ چلمن میں بھی
جس کو کنفیوز بہت کہتے ہو
ڈال سکتا ہے وہ الجھن میں بھی
اب تغیر کوئی کیا آئے گا
کھرا کنڈی ہے الیکشن میں بھی
اب تو ہر چیز کمرشل ٹھہری
کیوں فلیور نہیں "منجن" میں بھی
مجھ کو خچر ہی سمجھ بیٹھا ہے
جھولے لینے لگا دھڑکن میں بھی
اب تو پھر اُس پہ شباب آیا ہے
وہ تو کافر تھا لڑکپن میں بھی

ایک ایکٹ کا کھیل

ٹرسٹن برنارڈ / نوید ظفر کیانی

اپنے اپنے داؤ

کردار:

ہنری۔ ایک نوجوان۔
جینی ۔ اس کی بیوی۔

زمانہ اور شہر:

موجودہ زمانہ، پیرس کے مخصوص مکان کا ایک کمرہ۔

منظر:

ایک چھوٹا سا مگر پر آرائش کمرہ، پردہ اُٹھتا ہے تو جینی بائیں جانب سے کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ اُس کے پیچھے ہنری بھی ہے۔ وہ صوفے پر بیٹھ جاتی ہے جو سٹیج کے داہنی جانب بچھا ہوا ہے۔ ہنری کھڑکی کی جانب جاتا ہے، باہر جھانکتا ہے اور پھر سٹیج کی طرف لوٹ آتا ہے اور صوفے کے داہنی جانب بچھی ہوئی کرسی پر براجمان ہو جاتا ہے۔ کرسی کے ساتھ ایک چھوٹی سی میز بھی موجود ہے جہاں کافی کا سامان پڑا ہوا ہے۔

ہنری: ایک تو میں اس موسم سے تنگ آ گیا ہوں۔ ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے موسم صرف مجھ سے مذاق کرنے کے لئے بنایا ہو۔ دوپہر تک یہ بہترین رہتا ہے اور پھر یکلخت کہیں سے بادل آن نکلتے ہیں۔ یا تو ہلکے ہلکے سروں میں ہونے والی بارش شروع ہو جاتی ہے یا آندھی کا طوفانِ بدتمیزی شروع ہو جاتا ہے اور یہ ہمیشہ اُسی وقت ہوتا ہے جب میں ریس کے لئے جانے لگتا ہوں۔

جینی: کیا آج بھی تم نے جانا ہے؟

ہنری: (سنجیدگی سے) بالکل، یاد نہیں رہا کیا، صبح ہی تو بتایا تھا تمھیں۔

جینی: تو اس کا مطلب ہے کہ تم اور پیسہ اُڑانا چاہتے ہو۔

ہنری: ارے نہیں، کس نے کہا تم سے؟ تمھیں تو پتہ ہی ہے کہ میں شرطیں ورطیں نہیں لگاتا۔

جینی: تو کیا تم آج پھر مجھے اکیلا چھوڑ جاؤ گے؟ میں بھی چلوں گی تمھارے ساتھ۔

ہنری: نہیں، ہرگز نہیں، میرا مطلب ہے کہ جب میں اکیلا جاتا ہوں تو کوئی ٹیکسی پکڑتا ہوں، پانچ فرینک ادا کرتا ہوں اور بس۔۔۔ واپسی پر کوئی یار بیلی مل جاتا ہے جو مجھے واپس چھوڑ جاتا ہے۔ لیکن جب تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو مجھے سپیشل ٹیکسی کرنی پڑتی ہے اور میرے پچیس تیس فرانک ڈھیلے ہو جاتے ہیں۔

جینی: لیکن پچھلے ہفتے تو صرف پندرہ فرانک لگے تھے۔

ہنری: اُس وقت موسم بہت خراب تھا۔ اب یہی دیکھ لو، وہاں

ریس کورس میں تمھارا ٹکٹ بھی لینا پڑتا ہے یعنی دس روپے مزید، میں اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ کسی روز اپنی ذات پر اس قدر پیسے صرف کر دوں اور وہ بھی ایسی معمولی مد میں۔ ویسے بھی اتنے پیسے خرچ کر کے کیا ملے گا، تمھیں تو مزا بھی نہیں آتا وہاں جا کر، یونہی فضول وقت ہی برباد کرتی ہو۔ تم خود ہزاروں بار بتا چکی ہو کہ تمھیں ریس وغیرہ سے قطعاً دلچسپی نہیں۔ یوں بھی جب کہیں کوئی ایسا بندہ کسی کے ساتھ ہو جو حظ ہی نہیں اُٹھا رہا ہو تو خود بندے کا اپنا وقت بھی کھوٹا ہوتا ہے۔

جینی مبالغہ آرائی کچھ زیادہ نہیں ہو گئی؟

ہنری نہیں، یہ حقیقت ہے۔ وہاں میرا وقت اچھا اُسی وقت گزرتا ہے جب میں اکیلا ہوتا ہوں، جب تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو میں بندھ جاتا ہوں، ادھر اُدھر ہو ہی نہیں پاتا۔ گھوڑوں کے لئے نہ اصطبل جا پاتا ہوں، نہ ججوں کے کیبن میں اور نہ ہی کہیں اور۔ میں اکیلا ہوتا ہوں تو جو چاہتا ہوں، کر گزرتا ہوں، جہاں جانا چاہتا ہوں چلا جاتا ہوں۔ یوں بھی جب تم میرے ساتھ ہوتی ہو تو مجھے پر تکلف کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ نیا سوٹ، نیا کوٹ، نئے بوٹ اور سچ پوچھو تو مجھے ان پر تکلف کپڑوں میں ایک پل کو بھی سکون نہیں ملتا۔ ہاں اگر تم نے میرے ساتھ ضرور جانا ہے تو کہیں اور چلے چلتے ہیں مثلاً کہیں واک کر لیتے ہیں یا کسی تفریحی مقام کی سیر کر لیتے ہیں لیکن ریس کورس میں تو ہرگز ہرگز نہیں۔۔۔

جینی ہاں ہاں ٹھیک کہتے ہو تم، اب ''چیمپ ایلیسی'' کو ہی لے لو، ہم دونوں وہاں ساتھ ساتھ گئے تھے ناں، ایسا لگتا تھا کہ میں تمھیں گھسیٹ کر لے جا رہی ہوں۔ میں جب بھی تمھارے ساتھ کہیں جاتی ہوں تو تم ایسی جلی کٹی باتیں کرتے ہو کہ سیر کا سارا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہنری سچ پوچھو تو تمھیں میرے ساتھ چلنا آتا ہی نہیں۔

جینی کیا احمقانہ بات کر رہے ہو تم۔

ہنری میں سچ کہہ رہا ہوں۔ تمھیں پیدل چلنے کے طور طریقے آتے ہی نہیں۔ پتہ نہیں تمھیں اس قدر تیز تیز چلنے، بلکہ تقریباً بھاگنے میں کیا مزا آتا ہے۔ اب پچھلے ہفتے کی سیر کو ہی لے لو، تم نے چلتے چلتے آگے جاتے ہوئے بندے کو کراس کرنا تھا، تم نے کیا کیا؟ ایک دم میرے سامنے آ گئیں، میرے چلنے کی جگہ ہی نہیں رہی۔ پھر تم نے تقریباً دوڑتے ہوئے اُس بندے کو کراس کیا۔ مجھے تمھارے ساتھ ہونے کے لئے احمقانہ انداز میں بھاگ بھاگ کر آگے جانا پڑا۔ کیا یہ اچھا لگتا ہے کہ میں اس عمر میں بچوں کی طرح تمھاری ہمراہی کے لئے دوڑتا بھاگتا پھروں۔ تم یہ بات قطعاً نہیں سوچتی کہ اس چوکشن میں لوگ ہمارے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔ کیا وہ یہ نہیں سوچتے ہوں گے کہ تم مجھ سے پیچھا چھڑا رہی ہو اور یہ کہ میں کوئی اوباش قسم کا نوجوان ہوں جو تمھارے ساتھ زبردستی نتھی ہونا چاہتا ہوں۔

جینی لیکن تم چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ اکیلی باہر جایا کروں۔

ہنری میں چاہتا تو ہوں لیکن۔۔۔

جینی ظاہر ہے، جب میں اکیلے باہر جاؤں گی تو جاننے والے سوچیں گے کہ تم کیسے بندے ہو کہ تمھاری بیوی اکیلی باہر پھر رہی ہے۔ تمھارے پاس کیا جواب ہو گا۔

ہنری بہر حال، مجھے تمھارے ساتھ باہر جانے کا کوئی شوق نہیں اور نہ ہی تم میرا ساتھ پسند کرتی ہو۔

جینی ظاہر ہے، ایسے میں مجھے خاک مزا آئے گا، لیکن اگر تم میرے ساتھ نفیس انسانوں کی طرح چلو اور ہر وقت جلی کٹی سنانے سے گریز کرو تو مجھے تمھارے ساتھ آنے جانے میں اُتنا ہی مزا آئے گا جتنا تمھیں ریسز میں جانے میں آتا ہے۔

ہنری (ایک وقفے کے بعد) کیا وقت ہوا ہے؟

جینی: کوئی وقت شخت نہیں ہوا۔ یہاں جو گھڑیال لگا ہوا ہے، پچھلے ہفتے سے کام نہیں کر رہا ہے۔

ہنری: ٹھیک ہے، میں باورچی خانے والے گھڑیال سے ٹائم دیکھے لیتا ہوں۔

جینی: تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہاں کا گھڑیا بھی ٹھیک نہیں۔ وہ یا تو ایک آدھ گھنٹہ تیز چلتا ہے یا ایک آدھ گھنٹہ آہستہ۔۔۔ کھانے کے اوقات کے مطابق اپنی رفتار تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ہنری: اب میں چلتا ہوں۔ مجھے بگھی کی ضرورت نہیں، میں ''سینٹ لازارے'' سٹیشن سے ٹرین پکڑلوں گا۔

(وہ الوداعی بوسے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

جینی: تو تم واقعی مجھے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو، ٹھیک ہے۔

ہنری: (جینی کو لپٹاتے ہوئے) جانے بھی دو یار، تمھارا کیا جاتا ہے اگر میں کچھ دیر کو بے ضرر تفریح کے لئے کہیں جاتا ہوں۔ اگر میں گھر میں ہوتا ہوں تب بھی تو تم بور ہی ہوتی ہو۔

جینی: چہ خوب، گویا میں گھر میں اکیلی پڑی رہوں اور مجازی خدا صاحب اکیلے اکیلے باہر لطف اندوز ہوتے پھریں، اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ہنری: لیکن موسم ایسا نہیں ہے کہ تم میرے ساتھ واک پر چلو یا ہم کہیں ڈرائیو پر چلیں۔

جینی: تو کیا ایسے موسم میں ریس کورس جانا اچھا ہے؟

ہنری: بالکل، گھوڑوں کی دوڑ کا اہتمام قسم کے موسم میں ہو جاتا ہے۔ ویسے تو خراب موسم میں ریسز میں بھی ویسا لطف نہیں جیسا ہونا چاہئے۔ جیسا آج کا موسم ہے، مجھے پتہ ہے کہ گھڑے کی دوڑ میں بھی کوئی خاص مزا نہیں آئے گا لیکن کیا کیا جاسکتا ہے۔

جینی: تو پھر مجھے کیوں ساتھ نہیں لے کر جا رہے ہو؟

ہنری: میں پہلے ہی تم سے ساری طوطا کہانی بیان کر چکا ہوں۔ ویسے بھی اب بارش خاصی تیز ہو گئی ہے، تمھارے کپڑے ہی خراب ہوں گے۔

جینی: میں کوئی پرانے والے پہن لیتی ہوں۔

ہنری: تمھارا وہاں وقت بھی کچھ اچھا نہیں گزرے گا۔ (بے چینی سے اُٹھتا ہے) نہیں، میں سمجھتا ہوں کہ یہ ٹھیک بات نہیں ہے کہ پچیس تیس فرانکس یونہی بیکار میں اُڑا دئے جائیں اور پھر تم آنے والے وقت میں مجھے میری فضول خرچیوں کا طعنہ دیتی پھرو۔

جینی: میں بھی سمجھتی ہوں کہ اس قدر خطیر رقم ریس کورس میں اُڑانا قطعاً اچھی بات نہیں، کیوں کہ اِن پیسوں سے تھیٹر جایا جاسکتا ہے اور فلم کے بعد عمدہ قسم کا کھانا بھی کھایا جاسکتا ہے۔

ہنری: تم بالکل ٹھیک سوچ رہی ہو۔ تم یقیناً ایک ذمہ دار خاتون ہو، بہت پریکٹیکل۔۔۔ تو میں جاتا ہوں (وہ اُس کے قریب ہوتا ہے) تو تم چاہتی ہو کہ میں چلا جاؤں؟

جینی: جو تمھارے جی میں آئے، کرو۔

ہنری: تو تم کہہ دو کہ تم خوشی سے مجھے جانے کی اجازت دیتی ہو۔

جینی: تم اپنے فیصلوں میں آزاد ہو۔

ہنری: میں ہرگز نہیں جاؤں گا اگر تم خوشی سے مجھے جانے کی اجازت نہیں دوگی۔

جینی: تو کیا تم چاہتے ہو کہ میں خوشی سے قلقاریاں بھروں کہ تم مجھے بھرے پڑے گھر میں تنِ تنہا چھوڑ کر مزے اُڑانے جا رہے ہو۔

ہنری: تو تم باہر نہیں جا رہی؟

جینی: اکیلی؟ کیوں جاؤں میں؟؟

ہنری: چھوٹی موٹی سیر کے لئے، تمھیں تازہ ہوا کی ضرورت ہے۔ (جانے کی نیت سے اُٹھتا ہے) تو پھر۔۔۔ (جینی کی طرف دیکھ کر اشتعال میں آ جاتا ہے) لو تمھارا منہ پھر سُوج گیا، تم نہایت ضدی لڑکی ہو۔

جینی: کیوں، تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو۔

ہنری: تم ہر موقع پر منہ بسُورتی ہو اور میری ساری خوشی کرکری ہو کر رہ جاتی ہے۔ تمھیں اچھی طرح پتہ ہے کہ مجھے ریسز کا کتنا شوق ہے۔ میں جا رہا ہوں (اوپیرا والا چشمہ اور ہیٹ اُٹھاتا ہے) یہ عورتیں بھی کتنی خودغرض ہوتی ہیں (جینی کی طرف مڑتا ہے) اللہ حافظ، مجھے الوداعی بوسہ نہیں دوگی؟

جینی: ہرگز نہیں!

ہنری: کیوں نہیں؟ (برا سا منہ بنا کر) اب تم مجھے بوسہ بھی دینے سے گئیں۔

جینی: میں ایسے شخص کو بوسہ کیسے دے سکتی ہوں جو مجھے فضول میں ضدی لڑکی پکار رہا ہو۔

ہنری: اچھا، یوں ہے تو یونہی سہی، (اپنا چشمہ اور ہیٹ دوبارہ رکھ دیتا ہے) تو تم مجھے ریسز میں جانے سے روکنا چاہتی ہو، ٹھیک ہے، میں نہیں جاتا، اب تم خوش ہو۔ میرے پاس بیس فرینک کا ٹکٹ ہے، میں اسے پھاڑنے لگا ہوں (وہ ٹکٹ اپنی پتلون کی جیب سے نکالتا ہے) میں اسے پھاڑنے لگا ہوں، کیا پھاڑ دوں؟ بیس فرینک کا ہے یہ!

جینی: اس کی کوئی قیمت اُس وقت ہوگی جب تم اسے استعمال کروگے، اگر تم ایسا نہیں کرتے اور نہ ہی بیچتے ہو تو پھر یہ ٹکے کا بھی نہیں۔

ہنری: (ٹکٹ واپس جیب میں ڈالتے ہوئے) تو پھر ٹھیک ہے ڈیئر، تمھارے لئے میرے پاس ایکتیویز ہے (اُس کے پہلو میں بیٹھ جاتا ہے) تمھیں پتہ ہے کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں اگلے پندرہ منٹ تک یہیں تمھارے پاس بیٹھا رہوں گا، چاہے "سینٹ لازارے" کی ٹرین چھوٹ جائے۔ بعد میں کوئی ٹیکسی پکڑلوں گا۔

جینی: اگر تم نے جانا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ فوراً چلے جاؤ اور ٹیکسی کا کرایہ بچالو۔

ہنری: اچھا، ٹھیک ہے، جیسا تم کہتی ہو، میں چلتا ہوں، اللہ حافظ، الوداعی بوسہ؟ (اُٹھتا ہے اور بوسے کے لئے جھکتا ہے)

جینی: (کوئی توجہ نہیں دیتی) ٹھیک ہے۔

ہنری: اُفوہ، تم تو مجھے بددل کر کے رکھ دیتی ہو۔ (جینی اُٹھتی ہے اور ہنری کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں چلی جاتی ہے، ہنری آہستگی سے اُٹھتا ہے، اپنا چشمہ اور ہیٹ اُٹھاتا ہے، جانا چاہتا ہے لیکن پھر جھجک جاتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد جینی دوبارہ کمرے میں داخل ہوتی ہے)۔

جینی: ارے، گئے نہیں تم؟ (ہنری کوئی جواب نہیں دیتا) کوئی تمھیں کہیں جانے سے نہیں روک رہا ہے، میں خود جارہی ہوں۔

ہنری: کہاں جارہی ہو تم؟

جینی: جولیٹ کو ٹیلیگرام بھیجنے، وہ بھی سارا دن گھر پڑی رہتی ہے اور اُسے گلہ ہی رہتا ہے کہ میں اُس سے ملنے نہیں جاتی۔

ہنری: بہت اچھا فیصلہ ہے (اُٹھتا ہے) میں چلا، اللہ حافظ۔

جینی: للہ حافظ (ہنری دروازے پر پہنچ چکا ہے) دن بخیر!

ہنری: (رُک جاتا ہے اور اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھتا ہے) کیا کہا؟

جینی: میں نے کہا، دن بخیر۔

ہنری: کیا تم خوش ہو کہ میں جارہا ہوں۔

جینی: بالکل، تمھیں ریسز کا شوق جو ہے۔

ہنری: تب میرا خیال ہے کہ مجھے رُک جانا چاہئے۔ (وہ اپنا چشمہ اور ہیٹ میز پر رکھ دیتا ہے اور بیٹھ جاتا ہے، انداز خاصا اُکھڑا اُکھڑا سا لگ رہا ہے) تمھاری خوشی مجھے فطری نہیں لگ رہی ہے۔ ذرا مجھے وہ ٹیلیگرام تو دکھانا جو تم جولیٹ کی طرف بھیج رہی ہو۔

جینی: اس قدرپُر اسراریت کیوں پیدا کر رہے ہو۔ یہ رہا

ٹیلیگرام، خوب اچھی طرح دیکھ لو (اُسے ٹیلیگرام دکھاتی ہے)

ہنری: تم نے کتنی جلدی ٹیلیگرام مجھے تھما دیا، کیوں؟ تم پہلے اتنی فرمانبردار تو کبھی نہ تھیں کہ اِدھر میرے منہ سے نکلا اور اُدھر تم حاضر! ضرور کوئی بات ہے۔

جینی: مجھے تمھاری دماغی صحت پر شبہ ہونے لگا ہے۔

ہنری: ہاں ہاں، بالکل، تم یا تو مجھے پاگل سمجھتی ہو یا پاگل۔۔۔ یہ جو جولیٹ کی طرف ٹیلیگرام ہے، یہ کیا ہے، کسی قسم کا اشارہ۔۔۔ یا پھر تمھارا کوئی انتقامی ارادہ؟

جینی: کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو تم۔۔۔ میں ایسی باتوں کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔

ہنری: یہی تمھارے حق میں بہتر ہے۔۔۔ ہے کہ نہیں؟ ایسا شائد پہلی بار ہو رہا ہے کہ میں ارادہ کر کے بھی ریس کورس نہیں جا رہا، خیر کوئی بات نہیں، ایسے حالات میں میرا کہیں جانا بھی نہیں بنتا، میری خوشیوں کا خون تو ویسے بھی ہو چکا۔۔۔ میں اب تمھارے ساتھ رہوں گا۔

جینی: یہ تم ٹھیک نہیں کر رہے ہو۔

ہنری: ہاں ہاں، میں جانتا ہوں کہ تمھارے جو ارادے ہیں، یہ اُس کے لئے ٹھیک نہیں ہوگا۔ اور میں ایسا ہونے بھی نہیں دوں گا۔ ظاہر ہے تم نے اور جولیٹ نے پہلے سے منصوبہ بنا رکھا تھا۔ تم جولیٹ کی آڑ میں کس سے ملنا چاہتی ہو۔۔۔ یقین مانو، تم نے میرے بارے میں بالکل غلط اندازہ لگایا ہے، تم مجھے دھوکہ نہیں دے سکتیں (غصیلے انداز میں) میرا خیال ہے کہ اب ہمارے درمیان اس امر پر بات ہو ہی جانی چاہئے۔

جینی: کون؟ تم کس کی بات کر رہے ہو، میں کسی ایسے کو نہیں جانتی۔

ہنری: اس دوران میں یہیں انتظار کروں گا۔ (میز پر مکہ مارتے ہوئے) بغیر کسی دخل اندازی کے، سمجھیں۔

جینی: (اضطراری کیفیت میں ہنری کا ہیٹ اُس کے سر پر ٹھونستے ہوئے) میری بات سمجھنے کی کوشش کرو، بہتر یہی ہے کہ تم ریس کے لئے چلے جاؤ اور میرے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش مت کرو۔ میں سارا دن کسی ایسے شخص کے ساتھ نہیں گزار سکتی جو ماش کے آٹے کی طرح اکڑا ہوا اور ہر بات میں مین میخ ڈھونڈتا پھر رہا ہو۔

ہنری: میں یہاں ہوں اور یہیں رہوں گا۔ تم مجھے کہیں جانے پر مجبور نہیں کر سکتیں۔

جینی: لیکن تمھیں مسئلہ کیا ہے؟

ہنری: (تحکمانہ انداز میں) میں نہیں چاہتا کہ تم جولیٹ۔۔۔ یا کسی اور سے ملنے جاؤ۔

جینی: اگر تم چاہو تو خود مجھے جولیٹ کے پاس لے جا سکتے ہو۔

ہنری: اچھا، کیا واقعی تم ایسا چاہتی ہو (اُٹھ پڑتا ہے) ٹھیک ہے، ہیٹ پہن لو (جینی اپنے کمرے کی طرف جانے لگتی ہے لیکن اسی دوران وہ اُس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے) پھر سوچ لو، کیا واقعی تم چاہتی ہو کہ میں تمھارے ساتھ جولیٹ کے گھر چلوں، میری آنکھوں میں دیکھ کر بولو!

جینی: اچھا! لو بولے دیتی ہوں۔۔۔ بالکل، تو پھر کیا؟

ہنری: تب پھر میں ریسز کے لئے جا رہا ہوں، میں دیکھ رہا ہوں کہ تمھارے انداز میں سچائی جھلکتی ہے۔ اللہ حافظ ڈئر (اُسے بوسہ دیتا ہے) تمھیں اندازہ نہیں کہ تم نے مجھے کس قدر سکون اور خوشی دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میری غیر موجودگی میں تم گھر پر ہی رہو، جولیٹ کے گھر نہ جاؤ۔

جینی: ہاں ہاں، تم ہر حال میں ٹھیک ہو۔ میں اکیلے کہیں جاؤں تو تمھارا ماتھا ٹھنکتا ہے لیکن تم مجھے مسلسل نظر انداز کرو اور چاہو کہ میں گھر سے باہر بھی نہ نکلوں؟

ہنری: اور تم از خود بھی کہیں نہیں جا رہی ہو؟ گھر پر ہی ٹھہری رہو گی، اکیلی؟؟

جینی: ہاں، میں گھر پر ہی رہوں گی، اکیلی! یہی چاہتے ہو ناں تم؟

ہنری: تو پھر ڈیئر (وہ اٹھتا ہے) تو پھر میں چلا (گنگناتے ہوئے) اپنے مرقد کی طرف، رقصِ اسپ کی طرف (اوپرا کا چشمہ اور ہیٹ پہنتا ہے اور داہنی جانب والے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے، جینی کی طرف نرم نگاہی سے دیکھتا ہے) اللہ حافظ (باہر نکل جاتا ہے)۔

جینی: (چند ایک لمحے انتظار کرتی ہے، بند دروازے سے کچھ سننے کی کوشش کرتی ہے، پھر پچھلے والے دروازے کی طرف جاتی ہے، سٹیج سے باہر موجود کسی شخص سے بات کرتے ہوئے) میری، ابھی نہیں جانا، پہلے مجھے چاکلیٹ کا بڑا سا مگ بھر کر دو۔ دو رول بھی لیتی آنا۔ اور ہاں فوراً میرے کمرے میں جاؤ اور میرا ربنوں اور پیٹیوں والا صندوق لیتی آؤ (وہ سٹیج کے نچلے حصے میں آتی ہے اور پر مسرت آواز میں کہتی ہے) خوب مزا آئے گا، آج سب سہیلیوں کے ساتھ خوب خوب رقص کروں گی۔

(پردہ گرتا ہے)

ٹرسٹن برنارڈ (۷/ستمبر ۱۸۶۶ء تا ۷/دسمبر ۱۹۴۷ء) فرانس کے مشہور پلے رائٹر، ناول نگار، صحافی اور وکیل تھے۔ قانون کی تعلیم کے بعد وہ ایک درسگاہ سے وابستہ ہو گئے۔ ۱۸۹۱ء کے بعد وہ ایک ناول نگار کی حیثیت سے متعارف ہوئے۔ اُنہوں نے بے شمار فلموں کی کہانیاں لکھیں۔ لگ بھگ دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں۔

ہمزاد کے قلم سے
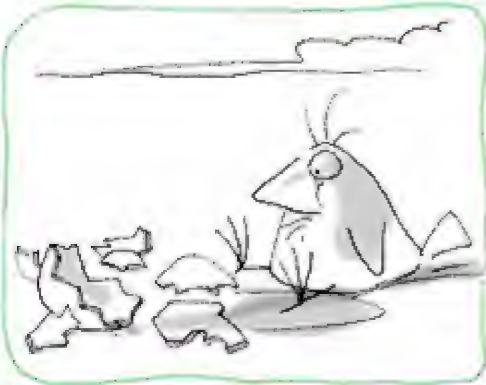
عجیب و امیر شخص

خادم حسین مجاہدؔ

خادم حسین مجاہدؔ جتنا عجیب انسان میں نے زندگی بھر نہیں دیکھا لوگوں کو جوان بننے کا شوق ہوتا ہے ان کو بزرگ ہونے کا اسی لئے ہر ایک کو اپنی عمر آٹھ دس سال زائد بتاتے ہیں تاکہ ان پر بزرگی کا رعب پڑے اور وہ ان کی ہر بات کو بلاچوں چرا تسلیم کرلیں اسی لئے اپنے سفید ہوتے بالوں کو کالا نہیں کرتے کہ اس سے عمر آٹھ دس سال کم لگنے کا خدشہ ہے۔ کہتے ہیں میں ''اوریجنلیٹی'' کا قائل ہوں اور بال کالے کرنا بھی فریب کی ہی ایک صورت ہے، یعنی ان کو خطرہ ہے کہ کسی کو دھوکہ نہ ہو جائے۔ چاہے کسی کا دل ٹوٹ جائے۔۔۔ اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں، جہاں تک نئی نسل کا تعلق ہے تو وہ بزرگی کے رعب میں آتی ہی نہیں نہ ہی کوئی بات مانتی ہے۔ ان کا تو اب ایک ہی بزرگ ہے جس کی وہ ہر بات مانتے ہیں اور وہ ہے بابا گوگل، اسی ''اوریجنلیٹی'' کے چکر میں یہ اپنی سمز ان کے اصلی نیٹ ورک سے دیگر نیٹ ورک پر منتقل نہیں کراتے حالانکہ اس سے بے شمار منٹس، ایس ایم ایس، اور ایم بی از، ملتے ہیں۔ کہتے ہیں ایسا کرنے سے پیکج پر کال کرنے والوں کو مشکل ہوگی حالانکہ ایسے لوگوں سے جان چھڑانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں۔ خود یہ پیکج کے سخت خلاف ہیں کہ پھر پیسے پورے کرنے کے لئے ایک منٹ کی بات کو ایک گھنٹے تک پھیلانا پڑتا ہے۔

جدید ایجادات سے یہ جس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں وہ بھی ایک الگ کہانی ہے۔ انہوں نے گھر میں دو مانیٹرز کے ساتھ دو ڈیوائسز لگا رکھی ہیں۔ کہتے ہیں دونوں الگ الگ کمپنیوں کے ہیں اور کچھ سٹیشن ایک ڈیوائس کیچ نہیں کرتی اور کچھ دوسری، اسی طرح کچھ کے رنگ ایک مانیٹر پر صاف ہیں اور کچھ کے دوسری پر۔ حتیٰ کہ ایک دن دو ریموٹ کنٹرول سے ایک ڈیوائس کی ٹیوننگ کر رہے تھے پوچھنے پر بتایا کہ کیا کروں کچھ بٹن ایک ریموٹ کے کام نہیں کرتے اور کچھ دوسری کے، یہی حال ان کے موبائلز کا ہے ایک پر نیٹ کی وڈیو نہیں چلتی اور دوسرے پر تصویر۔ کال کرنے کے لئے انہوں نے الگ موبائل رکھا ہوا ہے اور ایس ایم ایس کے لئے الگ۔ کمپیوٹر بھی انہوں نے دو رکھے ہوئے ہیں کیونکہ کچھ پروگرام ایک پر نہیں چلتے اور کچھ دوسرے پر۔ موٹر سائیکل ان کے پاس ایک ہی ہے لیکن کچھ پرزے ٹو سٹروک کے لگا رکھے ہیں اور کچھ فور سٹروک کے یعنی ایک ٹکٹ میں دو دو مزے۔ کہتے ہیں کہ گاڑی اور بیوی ایک ہی ہونی چاہیئے دو دو کے خرچے اس مہنگائی میں اٹھانا

آسان نہیں۔

انہوں نے ایک رائٹنگ ٹیبل بنوا رکھی ہے جو آدھی سے زیادہ ان کی بیگم کے استعمال میں رہتی ہے کہ وہ اس پر کپڑے بھی استری کرتی ہیں اور فریج اور چولہے کے درمیان ہونے کی وجہ سے اس پر ضروری برتن وغیرہ بھی رکھتی ہیں، یوں ان کے پاس ایک تہائی ٹیبل ہی بچتی ہے لیکن یہ اس پر بھی اپنا کام کر لیتے ہیں، باقی یہ ٹیبل کھانے اور بچوں کے ہوم ورک کے لئے بھی استعمال ہوتی ہے اور اس پر چڑھ کر یہ چھت کے والے پنکھوں کے کپیسٹر بھی بدل لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ دھلنے کے بعد کپڑے بھی اسی میز پر ڈھیر کئے جاتے ہیں جو استری ہونے تک وہیں براجمان رہتے ہیں، اسی دوران انہوں نے جو کچھ لکھنا ہو تو پہلے میز کو واگزار کرانا پڑتا ہے۔ ان کے کام ایسے ہیں کہ اگر ان کو سی ڈی روم مل جائے تو بیگم کو کہتے ہیں ''سنبھال لو اس میں کمپیوٹر ڈلوائیں گے۔'' فوٹو کاپیاں زیادہ کرانا پڑیں تو کاپیئر مشین لینے کا سوچتے ہیں۔

ان کو گرمی بہت لگتی ہے اس لئے گرمیوں میں ایک دن میں سات بار نہاتے ہیں البتہ سردیوں میں سات دن میں ایک بار ہی نہانے کو کافی سمجھتے ہیں۔ گھر میں گیٹ سے داخل ہوتے ہی فالتو کپڑے اتارنا شروع کر دیتے ہیں اور پہلے حاضری غسل خانے میں لگواتے ہیں۔ گھر میں بنیان اور ٹراوزر میں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں علامہ اقبال بھی گھر میں دھوتی بنیان ہی پہنتے تھے میں تو پھر بھی پاجامہ پہنتا ہوں کیونکہ مجھے دھوتی جیسے مادر پدر آزاد لباس کی ترکیب استعمال معلوم نہیں، البتہ باہر نکلتے وقت، لباس کے تمام لوازمات پورے کر کے نکلتے ہیں چاہے دستک کے جواب میں یہی پتا کرنا ہو کہ باہر کون ہے۔

یہ بالکل فارغ نہیں بیٹھتے۔ کوئی کام نہ ہو تو بھی خود کو مصروف بنا کر مصروف ہو جاتے ہیں گھر میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ اور کسی بھی قسم کی خرابی ٹھیک کر یا کرا دیتے ہیں حتیٰ کہ گھر کا کوئی فرد کسی چیز سے جان چھڑانے کے لئے اسے خراب بھی کر دے تو بھی اسے ٹھیک کر کے اس کے حوالے کر دیتے ہیں یعنی کوئی نئی چیز اسی وقت لے سکتا ہے جب ان کو پتہ نہ چلے اور ان کا نگرانی کا نظام اتنا طاقتور ہے کہ مجال ہے کہ ان کو کسی ایسی واردات کی خبر نہ ہو نازک مزاج اتنے ہیں کہ ذرا موسم یا خوراک میں تبدیلی ہو تو انہیں ''انفیکشن'' ہو جاتی ہے اس لئے ایک تو کسی کے گھر کچھ کھاتے نہیں دوسرا خصوصاً سردیوں میں کیموفلاج ہو کر نکلتے ہیں کہ جیسے محاذ جنگ پر جا رہے ہوں مجال ہے کہ ہوا کسی بھی طرف سے ان کے جسم تک پہنچ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ گرمیوں میں صبح پندرہ منٹ میں تیار ہو جاتے ہیں اور سردیوں میں پورے ایک گھنٹے میں اور رات کو یہ سب کچھ اُتارنے میں کم از کم آدھا گھنٹا لگا دیتے ہیں۔

پچاس سال کے دوران ان کے گھر میں جتنے تالے خراب بیکار یا گم ہوئے، ان کی چابیاں آج تک ان کے گھر کی چابیوں کے گچھے میں موجود ہیں اور اس گچھے میں زیادہ سے زیادہ دس فیصد کارآمد ہیں اس لئے گھر کے افراد کے لئے بھی تالے کھولنا کاردارد ہے۔ فالتو چابیاں یہ نہیں نکالتے، کہتے ہیں کہ جب کوئی تالہ کھل نہ رہا ہو تو یہ چابیاں کام آتی ہیں لیکن ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ یہی حال ان کے درازوں کا بھی ہے کہ ان میں الم غلم ہر چیز ٹھونس رکھی ہے۔ اور ان کے سوا کسی کے لئے ممکن نہیں کہ اس میں سے کچھ ڈھونڈ سکے۔

ان کا بائیک بھی عجوبہ روزگار ہے۔ عام طور پر بائکس کی ہر جگہ کے لئے ایک ہی چابی ہوتی ہے لیکن ان کی بائک پرانی ہونے کی وجہ سے پرزے بدلنے کے باعث اگنیشن کی چابی الگ ہے، پٹرول ٹینک کی الگ، ہینڈل لاک کی الگ اور سائیڈ ٹاپوں کی الگ، اس لئے ان کی موٹر سائیکل چرانا آسان نہیں۔ حتیٰ کہ اگر چابیاں بھی کسی کے ہاتھ لگ جائیں تو کوئی فائدہ نہیں کہ جب تک یہ نہ بتائیں کہ کون سی چابی کہاں لگے گی، مانگ کر لے جانے والے بھی چلا نہیں سکتے، اسی لئے ان کی بائیک کوئی مانگ کر بھی نہیں لے جاتا کیونکہ اس کی ترکیب استعمال ان کے پاس ہے۔ جب تک وہ اس کے اسرار و رموز سے آگاہ نہ کریں، چلانے والے کا خیریت سے واپس آنا محال ہے کیونکہ ایک تو اس کا ہینڈل ایک مخصوص وقت ڈول مارتا ہے دوسرے اس کی گئر گراری کا دندانہ ٹوٹا ہوا ہے جو چوتھا گئر لگاتے ہی خوفناک آواز دیتا ہے اور جو ان

خرابیوں سے آگاہ نہیں ہوتے، وہ ضرور گرتے ہیں، شائد اسی لئے اسے ٹھیک نہیں کراتے کیونکہ انہیں تو اس کا پتہ ہے اور اسے خود تو یہ کنٹرول کرنا جانتے ہیں، اور کسی کو دیں تو اسے سمجھا بھی دیتے ہیں لیکن خواہ مخواہ کے مانگنے والوں کو بالکل نہیں بتاتے، نتیجہ یہ کہ ایک بار لے جا کر وہ دوبارہ کبھی نہیں مانگتے۔ کئی بار گھر والوں نے کہا ہے کہ نئی لے لو کہنے لگے لے تو لوں لو مگر یہ کہتے ہیں کہ اس کے جتنے پرزے خراب ہوئے میں نے جاپانی ڈلوا دئے ہیں لیکن ماڈل چونکہ چائنہ کا ہے اس لئے لینے والے کباڑ کا بھاؤ خریدنا چاہتے ہیں اور اسے بیچنے سے سراسر نقصان ہوگا اس لئے یہی بہتر ہے۔ کم از کم چوری تو کوئی نہیں کرتا اور مانگنے والے بھی اب باز آ گئے ہیں نیا لے بیٹھا تو اسے ہم خود کم اور دوسرے دوست رشتہ دار زیادہ چلائیں گے کیونکہ نہ تو یہ کسی کو نہیں کر سکتے۔

یہ خود ہی عجیب نہیں ان کے ساتھ واقعات بھی عجیب ہی ہوتے ہیں۔ کہیں جانا ہو تو رات سے ہی سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ کیا کیا لے کر جانا ہے اور صبح تیاری میں گھنٹوں لگا دیتے ہیں کہ کوئی چیز رہ نہ جائے پھر بھی نصف راستے میں یاد آتا ہے کہ فلاں چیز تو پھر بھی رہ گئی ایک دفعہ افراتفری میں موٹر سائیکل کی رجسٹریشن کاپی جیب میں ڈالی جو موٹر سائیکل کی طرح ہی پرانے دور کی ہے جو چھوٹی سی مضبوط جلد میں لگی ہوتی ہے۔ شہر میں ایک چوک میں ٹریفک کانسٹیبل نے کاغذات چیک کرنے کے لئے روکا تو کاپی کی جگہ سٹیمپ پیڈ نکلا جو شاید کاپی کے ساتھ پڑا تھا اور تیزی میں وہی جیب میں ڈال کر لے آئے تھے۔ سارجنٹ نے پہلے تو سٹیمپ پیڈ کو دیکھا پھر ان کو اور آخر میں موٹر سائیکل کو اور پھر۔۔۔ ان کو جانے کا اشارہ کر دیا۔ شاید ان کی پریشانی اور موٹر سائیکل کی حالت دیکھ کر اس نے سوچا ہوگا ان سے کیا ملے گا۔ ایک بار ان کا موٹر سائیکل گڑبڑ کر رہا تھا تو یہ ٹھیک کرانے کی غرض سے شہر روانہ ہو گئے راستے میں موٹر سائیکل خود بخود ٹھیک چلنے لگا شہر پہنچ کر بھول گئے کس کام سے شہر آئے تھے گھر فون کر کے پتا کیا مگر ان کو تو یہ بتا کر ہی نہیں آئے تھے، وہ کیا بتاتے شام تک ادھر ادھر پھرتے رہے اور پھر واپسی کی راہ لی آدھے راستے میں موٹر سائیکل پھر گڑبڑ کرنے لگا تو انہیں یاد آیا کہ شہر کس لئے گئے تھے مگر تب شہر جانے کا وقت نکل گیا تھا۔

سرکاری سکولوں میں تیسری جماعت کا ٹیبلٹ فون پر ٹیسٹ ہوتا ہے جس کے لئے اس میں ایک تعلیمی ایپلی کیشن انسٹال کرنی ہوتی ہے۔۔۔ اس لئے ہر اسکول میں تیسری جماعت کے اساتذہ کو ایک ایک ٹیبلٹ ملا ہوا ہے۔ ایک دن یہ سکول سے نکل کر بکڈپو پر کوئی چیز لینے گئے، ٹیبلٹ ان کے ہاتھ میں تھا بکڈپو والے نے پوچھا کہ کن اساتذہ کو ٹیبلٹ ملا ہے تو انہوں نے کہا "جن کے پاس تیسری ہے ان کو۔" اس پر وہ لڑکا بولا "واقعی تیسری کرنے والوں کی ہمت ہے ان کو اس کا انعام تو ملنا ہی چاہیئے۔ لیکن آپ نے تو ابھی دوسری شادی ہی نہیں کی تو پھر یہ تیسری کہاں سے آ گئی؟" انہوں نے اس کی بات سن کر سر پیٹ لیا دراصل اس کی شادی نہیں ہو رہی تھی اس لئے اس کا سارا دھیان۔۔۔ کی طرف ہی تھا۔ ان کو اصلاح کا وہم ہے اور وہ بھی دوسروں کی اپنی اصلاح کرنے کی کوشش کم ہی کرتے ہیں البتہ جب بیگم کی غلطیاں ٹھیک کرنے کی غلطی کرتے ہیں تو وہ خود ہی ان کی اصلاح کر دیتی ہے ایک بار ان کو کسی لڑکی نے کسی کا لیٹر دیا تو انہوں نے پوچھا "کیا یہ تم نے لکھا ہے؟" تو وہ بولی "نا جی میں کیسے لکھ سکتی ہوں میں تو چٹی ان پڑھ ہوں!" انہوں نے اس کے رنگ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "نہیں بھئی تم تو کالی ان پڑھ ہو۔" پھر لیٹر پڑھ کر جواب دینے کی بجائے غلطیاں نکال کر واپس بھیج دیا یوں اصلاح کے خبط میں انہوں نے نجانے کتنے دل توڑے اور کتنی ہی محبتیں آغاز سے پہلے ہی انجام کو پہنچ گئیں اور باقی ان کی کفایت شعاری کی نذر ہو گئیں۔

خادم حسین مجاہد کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ موصوف بچپن سے ہی لکھتے آ رہے ہیں۔ بچوں کے لئے بہت کچھ لکھا۔ شستہ اندازِ تحریر کے مالک ہیں۔ ظرافت نگاری کے ساتھ ساتھ ان کے طنز کی کاٹ سے بھی انکار ممکن نہیں۔ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ "ارمغانِ ابتسام" کی مجلسِ مشاورت میں شامل ہیں اور اوّلین شمارے سے اس کے ساتھ ہیں۔

آندھی

نذیر احمد شیخ

کھڑکی کھڑکے، سرکی سرکے، پھڑکے روشن دان
ناکہ بندی کرتے کرتے سب گھر ریگستان
ٹوٹے بھنوٹے چھپر آئیں گھٹتے گھٹتے سانس
پیڑوں سے چمگادڑ چمٹے سر پر کھڑکیں بانس
جھاڑو جھاڑن موج منائیں اُن کا اپنا راج
پپا بیٹھا ڈھول بجائے کتھک ناچے چھاج
درہم برہم سب تصویریں، طرفہ تر احوال
مرزا غالب اُلٹے لٹکے، سجدے میں اقبال
چھت پر ہم جو بستر ڈھونڈیں عقل ہماری دنگ
کھاٹ بچاری اُڑن کھٹولا بستر ڈور پتنگ
ایک بگولہ سب سے اولیٰ، بھوتوں کا سردار
لوٹ پلٹ کر پڑھتا جائے دنیا کے اخبار
سُنتے سُنتے شور شرابا کانوں کا یہ حال
بیگم اپنی شال منگائے نوکر لائے ڈال
سڑکوں پر حلوائی بیٹھے مفت لٹائیں تھال
کُبڑے کُبڑے کنجڑے کھیلیں گوبھی سے فٹبال
بکھری بکھری داڑھی دیکھی، اُڑتی اُڑتی مونچھ
جتنا دابیں پنکھ پکھیرو، اُتنی اُچھلے پونچھ
دنیا ساری بھوت بنی ہے گورا کالا ایک
بنئے نے جب دھنیا تولا، مرچ مسالہ ایک
ساڑھی کھینچے، چولی جھپٹے دھوبی باندھے پوٹ
پنکھ لگا کر اُڑتے جائیں لہنگا پتلی کوٹ
سُود اسامی دونوں غائب خان کھڑا بیزار
منہ میں جھونکے لیکن جائے آنکھوں میں نسوار
اُڑتی پھرتی جھاڑی پکڑے لوگوں کی شلوار
جب تک وہ شلوار چھڑوائیں رخصت ہو دستار
مشکل میں قصاب بچارا، سودا اُڑتی کھیل
آگے آگے بوٹی جائے پیچھے پیچھے چیل
پیچ جو چو پیچ بھاندے دونوں آنکھیں میچ
نالی سے دو نالی چھوٹے کھاتا جائے پیچ

لڑکا لڑکی قسما قسمی جیون جیون ساتھ
جھگڑ ایسے تھپڑ ماریں دونوں چھوڑیں ہاتھ
چھجے نے جب جھٹکا کھا کر دھڑ سے پھینکی اینٹ
مٹکے کا وہ جھٹکا دیکھا سر سے گزری چھینٹ
دائیں موڑو بائیں جائے، موٹر کھائے جھول
آندھی سیدھی راہ دکھائے دنیا ڈانوں ڈول
پیڑوں کے جب ٹہنے ٹوٹے سب کی ٹوٹی آس
اُپلے چھت سے فوراً کودے سیدھے چولہے پاس
سینگ چھپائیں کان اُٹھائیں بچھڑے ڈنگر ڈھور
پیٹھ پھرا کر اُس کو روکیں آندھی جی کا زور
منزل غائب رستہ اندھا کیسے مانے بات
تانگے والا چابک مارے گھوڑا مارے لات
سائیں جی کی بیڑی سُلگے گدڑی پکڑے آگ
جب تک وہ ملہار الاپیں دیپک اُٹھے جاگ

بہشت میں

ڈاکٹر مظہر عباس رضوی

آیا ہے لینے مولوی چندہ بہشت میں
کیا دیں اسے جواب خدایا بہشت میں

نہ "اکھ مٹکا" ہو نہ اشارہ بہشت میں
عاشق بچارہ کیا کرے یارا بہشت میں

فرمائشوں نے حوروں کی رسوا بہت کیا
سوچا تھا ہم نے ہوگا نہ خرچہ بہشت میں

یہ سوچتے ہیں ہم وہاں دل کا کریں گے کیا
جب کوئی بھی نہ ہوگی تمنا بہشت میں

پھر ڈاکٹر زمیں پہ بھیجے گا کیا مریض
ہوگا نہ ٹھیک گر کوئی بندہ بہشت میں

بچے بھی خوش رہیں گے چلو موج ہوگئی
استاد کا چلے گا نہ ڈنڈا بہشت میں

یارب کہاں پہ جائیں گے اہلِ بہشت پھر
خودکش نے کردیا جو دھماکہ بہشت میں

دوزخ سے ڈائیریکٹ ہی دیکھا کریں گے پھر
ابلیس کا سیاسی تماشا بہشت میں

ہم روٹیاں پکائیں گے دوزخ کی آگ پر
ہوگا نہ جب کہیں پہ بھی چولہا بہشت میں

مظہر سے کہہ رہا تھا یہ جنت کا ٹھیکیدار
کر بیٹھنا نہ جھگڑا دوبارہ بہشت میں

دلدار نے بھیجیں ہیں مزیدار سوّیاں
خوشیوں کو دوبالا کریں اس بار سوّیاں

اک قحط زدہ عاشقِ صادق کا ہے کہنا
زلفیں نظر آتی ہیں تری یار سوّیاں

یوں لات نہ مارے کوئی حاتم کی لحد پر
کنجوس نے بھیجیں مرے گھر چار سوّیاں

سیاں ہیں چھپے اس میں ہٹاؤ ذرا واؤ
خوش بخت ہیں کیا دیکھئے سرکار سوّیاں

جل جائیں اگر تھوڑی سی غفلت سے کہیں یہ
رسوا کریں دیوار کے اُس پار سوّیاں

اک آگ سی لگ جاتی ہے معدے میں ہمیشہ
گاتی ہیں پلیٹوں میں جو ملہار سوّیاں

حلوہ شبِ بارات کا ''رمضاں'' میں ہوا ختم
اب چین سے کھائیں گے لگاتار سوّیاں

گر گر پڑی جاتی ہیں یہ چمچوں سے پھسل کر
کھانی ہمیں ہوجاتی ہیں دشوار سوّیاں

تھا سائیکالوجسٹ کی ہر بات میں الجھاؤ
تہہ دار تھیں باتیں تو تھیں تہہ دار سوّیاں

نیٹ پر سے اتاری تھی پکانے کی یہ ترکیب
آئیں گی پسند آپ کو اس بار سوّیاں

ڈھاتا ہے ستم پر وہ ستم عید کے دن بھی
بوسے کی جگہ دیتا ہے دلدار سویاں

ہے عید پہ مظہر وہی معدے کی دہائی
کرتا ہے فقط ایک ہی تکرار ، سوّیاں

ایک کتبہ
یہاں جو دفن ہیں
وہ انتہائی سادہ انساں تھے
دیانت دار افسر تھے
چنانچہ رائے عامہ میں ''پھٹیچر'' تھے
کبھی سرزد ہوا اِن سے
نہ کچھ ترچھا، نہ کچھ آڑھا
کرپشن کر کے دعویٰ پارسائی کا نہیں جھاڑا
نہ جی آئی ٹی بنی اُن پر
نہ وہ پیشی کی رسوائی سے گزرے
یونہی بیکار ساری عمر کاٹی ہے
اِسی عالم میں حضرت نے فنا کی خاک چاٹی ہے
خدایا مغفرت کرنا
نوید ظفر کیانی

پھجے کا لڑکا

بالغ ٹپے

نوید ظفر کیانی

پھجے کا لڑکا
جس بات پر کل
بیکار بھڑکا

☆☆☆

اُس بات پر تو
خود اُس کا لیڈر
(خود اُس کا ہیرو

☆☆☆

اور اُس کا ویری
دِتے کا لیڈر
ہنستے تھے مل کر
بیٹھے تھے باہم
جب لنچ پر وہ
(شعلہ و شبنم)
کھانے کھلانے
ہنسنے ہنسانے
گپیں لڑانے

پھجا تو لڑ کر
تھانے میں پہنچا
ناحق جھگڑ کر

☆☆☆

بیچارہ یونہی
بھگتے گا برسوں
تھانہ کچہری

☆☆☆

سوچے گا میں کیوں
بیکار کڑکا
پھجے کا لڑکا

تنویر پھول
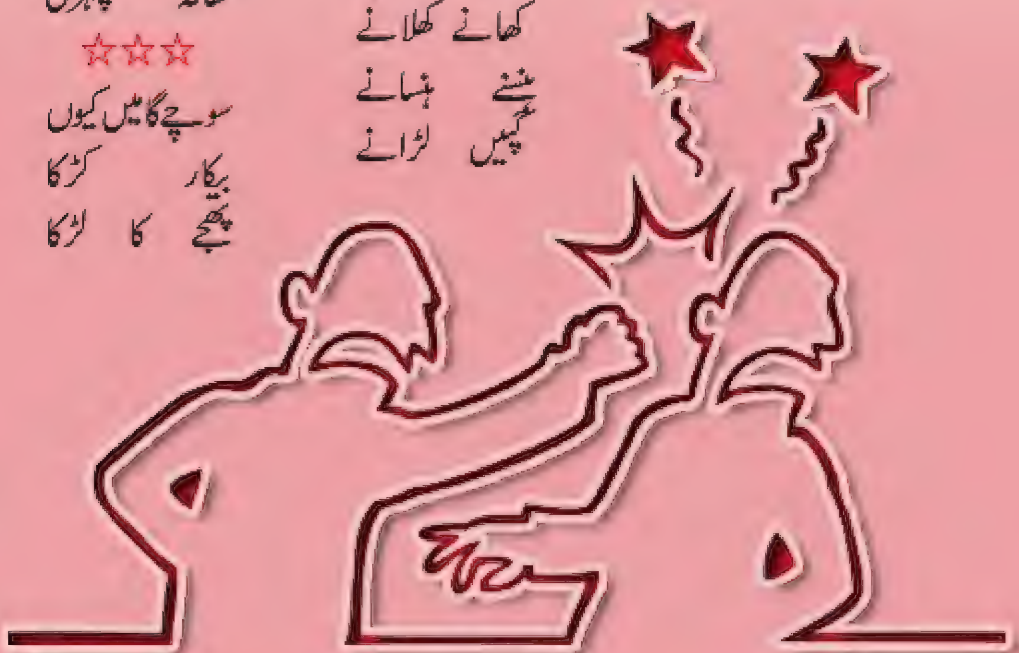
شاہین

سُنا کہ شاعرِ مشرق پسند کرتے تھے
وہ اِک پرندہ کہ شاہین جس کو ہیں کہتے

ہمارے یار بنے خود سے پیروِ اقبالؔ
محلّے میں تھی جو شاہین اُس کے پیچھے لگے

جو عشق کرنے لگے، سوچا شاعری بھی کریں
ہمارے پاس لئے مصرعِ سخن آئے

لگے وہ کہنے، ذرا دیکھ لو! کہا ہے یہ
''اسیرِ گیسوئے شاہیں ہوں اِک زمانے سے''

کہا یہ ہم نے کہ اقبالؔ کا جو شاہیں تھا
وہ اِک پرندہ تھا، اقبالؔ چاہتے تھے اُسے

کرو جو پیروی اقبالؔ کی تو یوں کہہ دو
اسیرِ پنجۂ شاہیں ہوں اِک زمانے سے!

چمچے

اسا نغنی مشتاق رفیقی

چکنا دیکھا پھسل گئے چمچے
پینترا ہی بدل گئے چمچے
ہم کو کالا ہے کہہ کہ چھوڑ دیا
اُجلا دیکھا اُچھل گئے چمچے
کل تلک تھے اپوزیشن بن کر
آج رولنگ سے مل گئے چمچے
شیر کو مارنے کی بات کریں
جھینگروں سے دہل گئے چمچے
ہم کو آخر میں ہڈیاں ہی ملیں
مُرغیاں سب نگل گئے چمچے
کر رہے ہیں سلام وہ مجھ کو
لگ رہا ہے سنبھل گئے چمچے

ہم اصولوں کی بات کرتے رہے
بے اُصولی میں ڈھل گئے چمچے
کتنا ہلکا مزاج رکھتے ہیں
لے کے پیسے بدل گئے چمچے
خوب حلوہ بنا انانس کا
سونگھ کر ہی پگھل گئے چمچے
کھا کے بریانی وہ بھی بکرے کی
چسکے سے دَل بدل گئے چمچے
نہیں کرتا رفیقی چمچہ گری
اس لئے اُس سے جل گئے چمچے

احمد علوی

اِک حویلی کی پیشانی پر دوستو
فضل ربی لکھا دیکھا شیطان نے
وہ دُکھی ہو کے گویا ہوا اس طرح
کیسا دھوکا کیا مجھ سے انسان نے

کیوں حویلی پہ یہ فضل ربی لکھا
میرے احساں کا اس نے دیا یہ بدل
یہ عمارت مرے فیض سے ہے بنی
اس کے سر پہ نہ تھا ایک چھپر بھی کل

میں نے بکوائی اس سے افیم اور چرس
میں نے ہتھیاروں کا دھندہ اس کو دیا
سیکھ دی قتل و غارت گری کی اسے
کہتا ہے فضل ربی اسے بے وفا

میرے ہی فضل سے اتنی دولت ملی
ٹیکس چوروں پہ کب فضل ربی ہوا
میرے رب نے انہیں منھ لگایا نہیں
سود خوروں پہ کب فضل ربی ہوا

فضل میرا ہے کاروں میں چلتا ہے اب
فضل ربی سے ٹم ٹم چلا کے دکھا
ملٹی اسٹوری بلڈنگ بڑی چیز ہے
تو شرافت سے اک گھر بنا کر دکھا

لوٹنے کا ہنر اس کو میں نے دیا
ورنہ ایمان کا اک پجاری تھا یہ
میں نے پیسہ بنانا سکھایا اسے
گندے پٹ پاتھ کا اک بھکاری تھا یہ

گھر کے دروازوں پر پھر بھی لکھتا ہے یہ
فضل ربی ہمیشہ بڑی شان سے
کہتا ہے فضل ربی مرے فضل کو
دو قدم بڑھ کے انساں ہے شیطان سے

احمد علوی

برسوں کی تحقیق نے ثابت کردی ہے یہ بات
اُلٹے ناموں کے ہوتے ہیں ہستی پر اثرات

نام کے الٹے اثر کی یوں بھی ہوتی ہے تصدیق
کام وکالت کا کرتے ہیں صادق اور صدیق

اپنے شہر میں جتنے بھی تھے ایک سے ایک خراب
کچھ کے نام شہنشاہ نکلے اور کچھ کے نام نواب

کوڑا چنتا بازاروں میں دیکھا گیا نفیس
بھیک مانگتا اسٹیشن پر پکڑا گیا رئیس

دو دو دن کا فاقہ کرتے ہیں عبدالرزاق
اور کنویں کا مینڈک ہوتے افلاک و آفاق

کہتے ہیں یہ اک ملا جی جن کی بیگم تین
شیریں نام کی دوشیزائیں ہوتی ہیں نمکین

کیسے کیسے کھیل دکھائے مولا تیری شان
پیشہ ور جلاد مگر ہے نام عبدالرحمٰن

شیر محمد خاں چوہوں سے ڈرتے دیکھے
رستم خاں بیوی کو سجدے کرتے دیکھے

بھینس برابر لگتا جس کو کالا اکشر
اس کو ہی اب دانشور کہتے دانشور

دانوں پر پڑھتے دیکھے ہیں سورہ یاسین
چاقو دیکھ کے ڈرجاتے ہیں ملا سیف الدین

رشوت کھلم کھلا لیتے اختر الایمان
رشوت خوری گھر دفتر میں ان کی ہے پہچان

داغ ہیں دین کی پیشانی پر نام ہے شمس الدین
بھگوا پگڑی پہن کے اب اتراتے ہیں یاسین

عشرت نام کے مزدوری ہی کرتے دیکھے
لاوارث سڑکوں پر اکثر مرتے دیکھے

چلنے اور پھرنے سے قاصر قادر اور مختار
نام حکیم اللہ ہے جن کا رہتے ہیں بیمار

نور عالم کی دیکھو دونوں آنکھیں ہیں بے نور
صوفی جن کو کہتے ہیں سب رہتے ہیں مخمور

اپنے بھیجے سے باہر ہیں قدرت کے یہ راز
کم عمری میں ٹھوکر کھا کر مر گئے عمر دراز

نام امیر احمد ہے لیکن گداگری پہچان
اور فقیر احمد کی یارو سونے کی ہیں کان

اماں ابا ان کو گھر میں کہتے ہیں گلفام
افریقی شکل وصورت ہے چاند میاں ہے نام

مینا کی ہندی فلموں کے گھر میں ہوتے سین
نام مسرت ہے بیگم کا رہتی ہیں غمگین

چھوڑو بہت برا ہے علوی یہ ناموں کا پھیر
روشن گوشہ کوئی نہیں ہے سب کچھ ہے اندھیر

ساہنوں نانگے نال پیار ہو گیا

عنصر شبیر

دیامیر یعنی کہ "پریوں کا دیس"۔۔۔ نانگا پربت۔ یہ دنیا کی چھٹی بڑی اور سب سے خوبصورت اور سب سے قاتل چوٹی ہے۔

۱۹۸۸ء کی ایک سرد رات اب تک دماغ کے نہاں خانوں میں ہلچل مچاتی ہے تو خوف سے ایک جھرجھری سی آ جاتی ہے۔ اپنے خیمے میں سوئے سوئے یکدم پٹک سے میری آنکھ کھل گئی جو کہ پہاڑی علاقوں میں ایک غیر فطری عمل ہوتا ہے کہ سارے دن کی تھکاوٹ سے چور جسم کو جب سلیپنگ بیگ کی گرمی اور موسم کی سردی چھوتی ہے تو مستی خود بخود غالب آ جاتی ہے۔ خیر اک عجیب سی پراسرار خاموشی ماحول میں چھائی ہے جبکہ دماغ یہ کہتا ہے کہ تمھاری آنکھ کسی دھماکے سے کھلی ہے اور اب ایسی خاموشی ہے کہ "فیری میڈو" میں دن کے وقت نہ کبھی ہوئی۔۔۔ سمجھ نہ آئی کہ ہوا کیا ہے؟ دل اچھل اچھل کے کہتا ہے کہ "کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟" اور پھر یکدم سے دماغ کی یادداشت والے نہاں خانوں میں ایک جھماکا ہوا۔ میں نے اضطراری کیفیت میں یکدم اٹھتے ہوئے خیمے کی زپ کھولی۔ تیز ٹھنڈی جسم کو چیرتی ہوئی ہوا جسم کو کھدھڑنے پھدھڑنے لگی۔۔۔ دریا۔۔۔ دریا کہ جس کے کنارے میں خیمہ زن تھا، اس دریا کا شور اس وقت نہیں تھا۔ لیکن۔۔۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اتنی تندی اور تیزی کے ساتھ بہتا ہوا دریا کہ ہاتھی بھی اس میں کھڑا ہو تو اس کو حقیر کیڑے کی طرح بہا لے جائے کہ جسکا شور رات کے سناٹے میں آپ کو سونے نہ دے۔۔۔ وہی دریا اس وقت بہہ نہیں رہا۔۔ اس کا جلترنگ کے جیسا شور اس وقت نہیں ہے۔۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ہو سکتا ہے دریا چلنا بند ہو گیا ہو؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟۔۔ میں نے اپنی سرد پڑتی کلائی پہ کاٹا کہ کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔ پھر دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے دونوں کانوں کو ڈھول کی صورت بجا کر "آں آں" کی آوازیں منہ سے نکالی کہ تسلی ہو کہ میرے کان ٹھنڈک سے بند تو نہیں ہیں۔ کان تو ذرست سن رہے ہیں لیکن دریا کا شور نہیں ہے۔ جستجو کے کیڑے نے اکسایا اور میں خیمے سے نکل کر دریا کی سمت چل دیا۔ ہر سو اندھیرے کا راج تھا اور ہلکی ہلکی چاندنی میں سفید بدن "نانگا پربت" کسی سفید دودھیا بدن، تیکھے نقش و نگار اور جسمانی ساخت والی "برہنہ دوشیزہ" کی طرح بالکل برہنہ میرے سامنے کھڑا تھا۔۔۔ سر سے لے کر پیر تک برہنہ۔۔۔ کہ جس میں خوبصورت گولائیاں، چڑھائیاں، اترائیاں، کمر کی سی نازک مزاجی، تھائیز کی گولائی اور سختی، غرض اسوقت اس کی ہر ادا کسی خوبصورت، دل پہ بجلیاں گرانے والی حسینہ جیسی تھی۔۔۔ میں سدا کا لفنٹر، دریا کے شور کو بھول کر دریا پار نانگا پربت کی برہنگی کو دیکھنے میں محو ہو گیا۔۔۔ کسی لفنٹر، ٹھرکی، بیشرم اور بے حیاء تماشبین کی

طرح۔۔۔اور کیوں نہ ہوتا، ذرا تصور کیجئے۔۔۔گھپ اندھیرے میں ہلکی چاندنی ہو، سرد موسم ہو، ایسے میں کوئی دودھیا سفید چمکتے جسم والی آفت کی پرکالا خاتون مکمل برہنہ حالت میں آپ کے سامنے آکھڑی ہوتو کون کافر ہو کہ نہ بہکے۔۔۔میں بھی بہک گیا۔

دم بخودگی، بے اختیاری، خودسپردگی کی سی صورت حال مجھ پہ طاری ہونے لگی۔۔اور۔۔اور۔۔پھر مجھے یوں محسوس ہوا کہ نانگا پربت کا برہنہ دودھیا جسم مجھے اپنی آغوش میں لینے کو آگے بڑھنا شروع ہوگیا ہو۔ میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے۔۔۔رات کا پچھلا پہر، یہ تنہائی اور یہ صریحا برہنگی۔۔۔آغوش میں لینے والی برہنگی۔۔۔ نہ جانے کیا کیا گل کھلاتی کہ۔۔۔یکدم۔۔۔یکدم ہی سے وہی دھماکہ ہوا کہ جس سے میری آنکھ کھلی تھی۔اس دھماکے نے سارا طلسم توڑ دیا۔اور پھر حیرت انگیز طور پر وہی دریا کا حیرت انگیز طور پر شور۔۔۔رات کے سناٹے میں ہیبت ناک شور۔۔دریا کے چلنے کا شور۔۔اور پھر وہی تند و تیز سرکش ٹھنڈا یخ پانی میرے پاؤں میں آگیا۔ میں گھبرا گیا۔۔۔کیونکہ پانی کا زور میرے قدم اکھاڑ رہا تھا۔۔۔میں بھاگم بھاگ خوف سے ہانپتا کانپتا اپنے خیمے میں آگیا۔ پیچھے مڑ کے دیکھا تو۔۔وہ خودسپردگی کے عالم میں میری طرف بڑھتا ہوا سفید جسم (نانگا پربت) واپس اپنی جگہ پہ چلا گیا۔۔شائد اسے بھی یہ دخل اندازی اچھی نہیں لگی تھی، یا پھر کسی خوش اندام حسینہ کی طرح بدنامی کے خوف نے اسے واپس جانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ نہ آیا کہ ہوا کیا ہے لیکن میں نے اپنی زندگی میں ایسا خوبصورت نظارہ پھر کبھی نہ دیکھا۔ساری رات میری یہ سوچتے ہوئے گزر گئی کہ آخر یہ دخل در نامعقولات دھماکہ کیسا تھا جو میری عشقیہ داستان میں ''کیدو'' بن کر آگیا۔۔۔اور اور پھر یہ رُکا ہوا پانی کیسے چل پڑا؟ اور اگر اس نے چلنا ہی تھا تو پھر رُکا کیوں تھا۔۔۔شائد نانگا پربت نے روکا ہو اور مجھے بلاتا ہو کہ ؎

لنگ آجا پتن چنادا یار   لنگ آجا پتن چنادا یار

لیکن مجھے میرے کسی سوال کا جواب رات بھر خود سے نہ ملا۔ ملا بھی تو صبح۔۔۔اگلی ہی صبح ملا جب میں نے اس واقعہ کا ذکر ایک مقامی چرواہے سے کیا تو وہ ٹھٹک سا گیا اور خوفزدگی کے عالم میں مجھ سے کرید کرید کے اس واقعہ بارے سوال پہ سوال کرنے لگا۔

پانی رُکنے کی توجیح تو اس نے یہ بتائی کہ زیر برف بہنے والے دریا کے راستے میں کبھی کبھار کوئی برف کا بڑا تودا گر کر اس کی گزرگاہ کو بند کر دیتا ہے یا سردی کی شدت سے گزرگاہ میں پانی جم کر برف بن کر راستہ روک دیتا ہے تو پھر پیچھے سے آنے والا پانی کسی بند کی صورت اکٹھا ہوتا جاتا ہے جسے پھر یہ اکٹھا ہونے والے پانی کے دباؤ سے یکدم ایک دھماکے کے ساتھ اس رکاوٹ کو توڑ دیتا ہے اور راستہ کھول دیتا ہے۔

پھر مجھ سے پریشان لہجے میں بولا ''بابو! ایک بات یقین سے بولو۔ کیا نانگا پربت واقعی تمہاری طرف بڑھ رہا تھا تم کو آغوش میں لینے کے واسطے۔؟''

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا ''مجھے تو یہی محسوس ہوا اس وقت، کیوں کیا ہوا؟''

وہ پریشان ہوگیا اور بے چارگی کے سے انداز میں بولا ''اوہ اوہ۔۔۔بابو صاب، تم ادھر سے بھاگ جاؤ۔ ابھی کے ابھی بھاگ جاؤ اور پھر دوبارہ ادھر مت آنا۔''

میں اس کی بیوقوفی اور سادہ دلی پر مسکرا دیا۔لیکن۔۔۔لیکن پھر حیرت انگیز طور پر ایسا ہی ہوا، اور میں اپنی مرضی سے اپنے قدموں پہ چل کر موت کے منہ میں چلا گیا اگر تین فرشتے مجھے عین وقت پہ آکر نہ بچاتے۔

عنصر شبیر صاحب کا تعلق پنجاب کے شہر ''گوجرانوالہ'' سے ہے ۔معاشیات اور اُردو میں ایم اے کر چکے ہیں۔ پیدائشی کھلاڑی ہوئے ہیں۔قومی سطح تک فٹبال کھیلے اور کوہ پیمائی کی۔ شمالی علاقہ جات کی مختلف مقامات کی ہائیک کر چکے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں ''کے ٹو'' بیس کیمپ پر پہنچے اور وہاں سے ''گوندو گورولا گلیشیر'' سر کیا،جب تک چند ایک پاکستانیوں نے ہی اس درے کو عبور کیا تھا۔مختلف ادبی تنظیموں کے رکن ہیں۔ من موجی قلمکار ہیں، تین عدد سفرنامے لکھ چکے ہیں اور جب جی چاہے چھوٹا موٹا کالم بھی لکھ مارتے ہیں۔

ارمان یوسف

سفرنامے
لندن ایکسپریس
کا ایک باب

باب نہم

اوکسفرڈ یونیورسٹی میں

یوں تو برطانیہ میں کون سا ایسا علم نہیں جو آپ حاصل نہ کر سکتے ہوں، کون سی ایسی ڈگری ہے جس کے عالمی معیار کے ادارے قائم نہ ہوں۔ سائنس ہو یا سیاست، فلسفہ ہو یا معیشت، قانون ہو یا ستاروں کا علم۔۔۔ سب یہاں پڑھنے، تحقیق کرنے اور ڈگری حاصل کرنے کو ملتا ہے۔ کیمبرج اور اوکسفورڈ یونیورسٹیاں دنیا کی بہترین یونیورسٹیوں میں سے ایک ہیں۔ برطانیہ کے شہر اوکسفورڈ میں واقع اوکسفورڈ یونیورسٹی دنیا کی دوسری قدیم ترین اور انگریزی زبان کی پہلی پرانی یونیورسٹی ہے، تو آیئے آپ کو لئے چلتے ہیں ''شہر علم'' اوکسفورڈ میں۔ خیال رہے کہ اکثر سیاح یہاں آ کر مقامی لوگوں سے پوچھتے ہیں کہ انہیں اوکسفورڈ یونیورسٹی میں جانا ہے۔ ان کا بھی قصور نہیں کیونکہ باقی یونیورسٹیوں کی طرح اس کا کوئی ایک کیمپس کسی ایک جگہ پر نہیں ہے بلکہ یہ ۳۸ کالجوں اور ۶ ہالوں پر مشتمل یونیورسٹی ہے جو قریب قریب کے مختلف مقامات پر واقع ہیں۔ اس یونیورسٹی میں گیارہویں صدی سے علم کے چشمے پھوٹ رہے ہیں اور علم کے پیاسے یہاں سے سیر ہو کر دنیا بھر میں علم و ادب کی برسات کر رہے ہیں۔

۱۲۴۹ء یونیورسٹی کالج، اوکسفورڈ بنا، جو سب سے پہلا کالج تھا اور پھر ۲۰۰۸ء میں بننے والا ''گرین ٹمپلٹن'' کالج اب تک کا آخری کالج ہے۔ یونیورسٹی کی عمارت گذشتہ سینکڑوں سالوں سے انگریزی طرز تعمیر کے اعلیٰ نمونوں کی نہ صرف امین ہے بلکہ شاہکار بھی ہے۔ اس یونیورسٹی نے اپنے قیام سے آج تک اعلیٰ پائے کے سیاست دان، قائدین، سائنسدان، ماہرین معیشت اور اپنے اپنے میدان کے شاہکار پیدا کیے ہیں۔ دنیا کی ۳۲ نوبل انعام یافتہ ہستیاں بھی اسی یونیورسٹی کی فارغ التحصیل ہیں۔ دنیا بھر سے یہاں پر ''طالبان'' پڑھنے کو آتے ہیں، یہ طالبان بارود والے نہیں بلکہ درود والے ہیں یعنی علم کے متلاشی نہ کہ ظلم و جہالت کے علمبردار۔ ۲۰۱۳ء میں دنیا بھر سے ۲۰۰۰۷ طلباء یہاں پر پائے گئے تھے۔

اوکسفورڈ یونیورسٹی پریس، دنیا کا سب سے بڑا پرنٹنگ پریس بھی ہے، جس کی قریب پانچ ہزار شاخیں دنیا بھر میں پھیلی ہیں۔ اس پریس کی چھپی کتابیں دنیا بھر میں پڑھی جاتی ہیں۔

ہمارے کچھ منچلے ہوٹلوں پہ چائے کی چسکی لگاتے اور اخبار کے رنگین صفحوں کو الٹتے پلٹتے یہ کہتے ہوئے بھی پائے جاتے ہیں کہ جس دور میں یہ یونیورسٹی بن رہی تھی اس دور میں ہمارے ہندوستان کے حکمران تاج محل جیسی فضولیات میں مشغول

تھے۔ بھئی اول تو یہ کہ دونوں عمارتوں میں کوئی قدر مشترک نہیں، نہ تاریخ اور نہ مقصدِ تعمیر۔ اور پھر دوسرا یہ کہ اگر ساری دنیا یونیورسٹیاں ہی بنانے لگ جائے تو تاج محل جیسے عجوبے کا کیا بنے گا جو آج بھی اپنے طرز کی ایک شاہکار ہی نہیں بلکہ نادر و نایاب عمارت بھی تصور کی جاتی ہے۔ فنِ تعمیر کا ایک ایسا نمونہ جو دنیا کے سات عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ رہی بات یونیورسٹی کی کمی کی تو وہ آپ پوری کر دیں کم از کم اس دور میں ہی سہی۔ نئے تاج محل بنانے سے رہے تو بنی بنائی عمارتوں پہ طعنہ زنی کیسی۔ سائنس و ٹیکنالوجی اور علمی و ادبی ترقی جادو کی چھڑی نہیں جو گھما کے سب ٹھیک کر دیا جائے۔

اسی دنیا کی عظیم ترین یونیورسٹی میں بیسویں صدی کے وسط تک صرف ایک ہی عیسائی فرقے کو پڑھنے کی اجازت تھی، دوسرے کو نہیں۔ بیوقوفی کے نہ تو سینگ ہوتے ہیں اور نہ یہ کسی ایک ملک یا خطے کی ملکیت ہوتی ہے۔ اس زمانے کو یہ لوگ تاریک زمانہ کہتے ہیں جو وہاں سے ایشیا بھر میں شفٹ ہو گیا ہے جس کا عملی مظاہرہ ہندوستان اور پاکستان میں بھی ہر روز دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر ان لوگوں نے عقل سے کام لیا، مذہبی رہنماؤں کو حکومتی کاروبار سے دور کیا اور آج دنیا کے پر امن اور ترقی یافتہ معاشروں کے امین ہیں۔ اور ہم۔۔۔

خیر، مزہ کرکرا کئے بغیر واپس آئیے اوکسفورڈ یونیورسٹی میں، جہاں ہم اس کی لائبریری کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ یہ ہے برطانیہ کی دوسری بڑی لائبریری، جس میں گیارہ ملین کتابیں موجود ہیں۔ حساب کتاب آتا ہے نا، گیارہ ملین یعنی ایک کروڑ سے زائد کتب۔ ۱۹۰ کلومیٹر طویل شیلفوں میں سجی ہیں۔ صرف اسی ایک یونیورسٹی میں، اور یوکے میں ۳۲۴ یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے کالج ہیں۔ یہ عالم ہے ان کی علم دوستی کا۔۔۔ اور ہم غلیل بنا کے چلے ہیں مقابلہ کرنے۔۔۔ اور جب احتجاجی مظاہروں میں اپنے ہی ملک کی املاک کو جلا کر، چیخ چیخ کر انگریزوں کو گالیاں دے کر سر میں درد ہو جاتا ہے تو سر درد کی گولی بھی انہی کی بنائی ہوئی کھاتے ہیں۔۔۔ ہم زندہ قوم ہیں!

لائبریری کے علاوہ کئی میوزیم اور آرٹ گیلریز بھی ہیں جنہیں ہیں لاکھ سیاح ہر سال دیکھنے کو آتے ہیں۔

ستر ایکڑ پر مشتمل یونیورسٹی کا پارک عام لوگوں کے لئے بھی کھلا ہے۔ دنیا کے قدیم ترین تجرباتی باغات میں سے ایک بھی یہیں واقع ہے۔ گرمیوں میں کشتی رانی ایک وکھرا شغل ہے، جسے منچلے بڑے شوق سے کرتے ہیں۔

یہاں رنگا رنگی اس لئے بھی زیادہ ہے کہ تقریباً ہر کالج کا اپنا یونیفارم ہے۔

یوں ''اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیراہن'' میں پریاں بغیر کسی قطار کے ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ تقریبات کے بھی اپنے اپنے ڈریس کوڈ ہیں۔ جن میں کالے رنگ کی ٹائی لگا کے جانا ضروری ہے اور کئی میں سفید ٹائی۔

یونیورسٹی کے لائق شاگردوں میں خود برطانیہ کے ۲۶ وزرائے اعظم بھی شامل ہیں اور کامن ہاؤس کے سینکڑوں ارکان بھی۔ پاکستان کے ۵ سابق وزیر اعظموں یعنی لیاقت علی خان، حسین شہید سہروردی، فیروز خان نون، ذوالفقار علی بھٹو اور بینظیر بھٹو اور ہندوستان کی اندرا گاندھی اور منموہن سنگھ سمیت کم از کم ۳۰ کے قریب مختلف ممالک کے سیاسی وڈیروں اور قائدین کی ڈگری بھی اسی یونیورسٹی کی مرہونِ منت ہے۔ البتہ سابق وزیر اعلیٰ بلوچستان اسلم ریئسانی کا یہ فلسفہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ''ڈگری ڈگری ہی ہوتی ہے، جعلی ہو یا اصلی۔''

ارمان یوسف کا پشتنی تعلق مظفر گڑھ سے ہے لیکن سکونت برسہا برس سے لندن میں ہے۔ ارمان صاحب خوبصورت لب و لہجے کے شاعر اور ایک اچھے انشاء پرداز ہیں۔ مختلف رسائل و جرائد میں باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہے ہیں۔ طنز و مزاح ان کا سلوبِ بیان ہے۔ ان کی اوّلین تصنیف ''لندن ایکسپریس'' ہے۔ یہ اُن کا سفرنامہ ہے جو ''ارمغانِ ابتسام'' میں بھی قسط وار شائع ہو رہا ہے۔ ''ارمغانِ ابتسام'' کے اولین کرم فرماؤں میں سے ہیں۔

لوٹے

نیاز محمود

لوٹے شروع ہی سے سستے ترین برتن رہے ہیں۔ ابتدا میں مٹی اور دھات کے ہوا کرتے تھے۔ اس سے کسی کی ستر پوشیدہ نہ تھی۔ ہر گھر، محلے، مسجد اور حجرے کی ضرورت ہوا کرتے تھے۔ اسے خاص کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ پانی رکھنے کے بھی کام آتے تھے۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ لوٹوں کی جگہ دوسری اشیاء نے لے لی۔ پائپ آگئے اور یوں لوٹے صفحۂ ہستی سے مٹنے لگے۔ ابھی ان کا وجود خطرے میں تھا ہی کہ جدت پسندی کی لہر چلی اور لوٹے بھی اس لہر میں آگئے۔ اب لوٹے اپنے جدید شکل وصورت کے ساتھ میدان میں اترے۔ مختلف دھاتوں سلور، پیتل، لوہے، سٹیل اور تانبے کے ساتھ ساتھ پلاسٹک کے لوٹے مارکیٹ میں مختلف رنگوں، شکلوں اور خصوصیات کے ساتھ نظر آنے لگے۔ مٹی کے سستے لوٹوں کی جگہ پلاسٹک کے لوٹوں نے لے لی۔ یوں ان کی قیمت بہت گر گئی جس نے اسے حقیر ترین چیز بنا دیا۔ لیکن خوبیٔ قسمت تو دیکھئے کہ پچھلے کچھ عرصے میں لوٹوں کی مانگ میں بے حد اضافہ ہوا جس کی وجہ سے اس کی اقسام بلحاظِ ساخت ومقاصد کے تبدیل ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔

اب گوشت پوست کے لوٹے بھی دستیاب ہونے لگے ان لوٹوں کی خصوصیات ان گنت ہیں تبھی تو اس کی قیمت ہزاروں، لاکھوں سے ہوتی ہوئی کروڑوں تک جا پہنچی ہے۔۔۔ موجودہ صورتحال میں لوٹے کی قدر ومنزلت زیادہ ہوگئی ہے، اگر یہی حالت رہی تو قوی یقین ہے کہ اس سے بہتر اور منافع بخش کاروبار کوئی نہیں رہے گا۔ سنا ہے کہ لوٹوں کے ایک مالک نے ایک عجیب انداز اپنا لیا ہے۔ اور دو لوٹوں کی خریداری پر ایک لوٹا مفت میں دیتا ہے۔ یعنی دو کے ساتھ ایک لوٹا بغیر ادائیگی قیمت کے۔ یہ یقیناً لوٹوں کے کاروبار میں بہت بڑی تبدیلی ہے۔

کہتے ہیں یہ صاحب پہلے اس کے خلاف تھے لیکن اچانک یوٹرن لیتے ہوئے واپس لوٹے۔ ویسے یہ بھی سنا ہے کہ گیا محبوب لوٹ کے نہیں آتا اور اکثر یہی حال لوٹے مال کا بھی ہوتا ہے لیکن کبھی کبھار انہونی بھی ہوجاتی ہے۔ یقین مانیں لوٹوں پہ آج کل بہار آئی ہوئی ہے دیکھتے ہیں یہ بہار کب تک رہتی ہیں۔ آیا یہ بھی لوٹ کے واپس چلی جائے گی یا نہیں۔ خیر جانا تو ہے اسے اک دن۔ خوشیوں اور آسائیشوں کو اک جگہ ٹکتے کسی نے دیکھا تھوڑی ہے۔ ایک اور بھی تھا جو سب کچھ لوٹ رہا تھا۔ جب تک لوٹتا رہا اسے لوٹنے کی فکر نہ رہی لیکن جب لوٹا تو بھی احساس نہ رہا کہ وہ تو لوٹ کے واپس آیا تھا ایسا نہ ہو پھر لوٹنے کا موقع ہی نہ۔ ملے۔ عجیب سی بات ہے کہ جس کے لوٹ آنے کا انتظار رہتا ہے وہ کبھی نہیں لوٹتا۔ اور جس پہ اعتبار رہتا ہے وہی ہمیشہ لوٹتا ہے۔ لوٹ لوٹ کا یہ کھیل ایک دن لوٹوں کو بھی لوٹ لے گا لیکن تب بہت دیر ہوچکی ہوگی۔ شاید پھر ان کو لوٹنے کا موقع ہی نہ ملے۔

کہتے ہیں صبح کا بھولا اگر شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے لیکن اگر بھولا ہوا شام کا ہو اور رات بھر گھر واپس نہ آئے تو اس کے لیے کیا حکم ہے؟ ویسے ملک شام کی بات ہرگز نہیں کر رہا آپ گھبرائیں نہیں۔ جب سب لوٹوں اور لوٹ کی فکر میں ہیں تو آپ ہم کیوں شام کی فکر کریں۔ ویسے شام کے بعد رات لازمی ہوتی ہے اور رات کو سونا تو پڑتا ہے۔ لیکن وہ والا سونا نہیں جو قیمتی ہوتا ہے۔ یہ وہ سونا ہے جسے آدھی موت کہا جاتا ہے اور آدھی موت کے عالم میں بھی اکثر بد بخت لوٹے بغیر نہیں چھوڑتے اسی طرح جب سارا عالم سو جاتا ہے تب کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر روتے ہیں تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے اور عزتوں کے لٹنے کا ڈر نہ ہو۔ خیر انہیں کیا پتہ، رات ہی تو لوٹنے اور لٹنے کا وقت ہوتا ہے۔ دن بھر کے کام کاج کے بعد جب تھک ہار کر بندہ گھر کو لوٹتا ہے تو ساری تھکن دور ہوجاتی ہے لیکن جو لوگ سوتے رہتے ہیں ان کی بھینس بچے نہیں جنتی۔ لہٰذا جاگا کریں تاکہ بعد میں آپ کو کھیت چگنے کا پچھتاوا نہ ہو۔۔۔

حقیقی مثال

صداقت حسین ساجد

چیونٹی ہر روز صبح سویرے اپنے کام پر جاتی تھی، فوراً ہی اپنا کام شروع کر دیتی تھی۔ وہ بہت محنت سے کام کرتی تھی، اس کی پروڈکشن بھی بہت زیادہ تھی اور وہ اپنے کام سے خوش بھی تھی۔

جنگل کا بادشاہ شیر، چیونٹی کے کام سے بہت حیران تھا، کیوں کہ اس پر کوئی نگران نہیں تھا۔ شیر نے سوچا ''اگر چیونٹی کسی نگران کے بغیر اتنی زیادہ پیداوار حاصل کر رہی ہے تو اگر وہ کسی افسر کی ماتحتی میں کام کرے، تو اس کی پروڈکشن اس سے کئی گنا زیادہ ہوجائے گی۔''

یوں شیر نے ایک لال بیگ کو اس کا افسر مقرر کر دیا، جو کہ آفس کا تجربہ رکھتا تھا اور رپورٹ لکھنے میں بہت مشہور تھا۔ لال بیگ نے چیونٹی پر کنٹرول رکھنے کے لیے کام کی جگہ پر اس کے آنے اور جانے کے وقت کو نوٹ کرنے والا ایک بورڈ لگا دیا۔ اب لال بیگ کو ایک اور مددگار کی ضرورت تھی، جو ان رپورٹس کو لکھ سکے، اس لیے اس نے اس کام کے لیے نیز فائلوں کو آرکائیوز کرنے کے لیے ایک مکڑی کو تعینات کر دیا۔ شیر، لال بیگ کے کام سے خوش تھا۔ شیر نے اس سے کہا ''ایک گراف بناؤ، جس میں چیونٹی کی بڑھتی ہوئی پروڈکشن کی شرح درج ہو، جسے میں جنگل کے باقی دوستوں کے سامنے پیش کروں۔''

لال بیگ نے اس کام کے لئے ایک عدد کمپیوٹر اور پرنٹر خریدا

اور اس نے اس جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کے لیے ایک عدد ریٹائرڈ مکھی کو بھی تعینات کر لیا۔

چیونٹی جو کبھی بہت پرسکون ہو کر اپنا کام کرتی تھی۔ اب آئے روز کی میٹنگز اور کاغذی کارروائی میں اس کا وقت ضائع ہونے لگا، جس سے اس کے اندر بے زاری پیدا ہونے لگی اور اس کی پروڈکشن بھی متاثر ہونے لگی۔

اب شیر اس نتیجے پر پہنچا کہ ایک داخلی آفیسر تعینات کرے، جو اس جگہ کا معائنہ کرے، جہاں چیونٹی کام کرتی تھی اور یہ عہدہ ایک ٹڈی کو دے دیا گیا۔ ٹڈی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے کام کرنے کی جگہ لیے ایک کارپٹ اور ایک کرسی خریدی۔ یوں اسے اپنے کام کے لیے ایک کمپیوٹر اور ہیلپر کی ضرورت تھی، جو اس نے سابقہ جاب والی جگہ سے منگوا لیے تاکہ بجٹ کی ترتیب اور منیجمنٹ کا کام آسانی سے انجام دے سکے۔

جس ماحول میں چیونٹی کام کر رہی تھی، اب جذبات سے خالی ہو چکا تھا، اب اس میں کوئی جوش و خروش باقی نہیں رہا تھا۔ اب کوئی بھی ہنسی خوشی نہیں رہتا تھا بلکہ سب غمگین تھے۔

جب یہ رپورٹس شیر تک پہنچیں کہ چیونٹی کی پروڈکشن میں پہلے کی نسبت خاطر خواہ کمی واقع ہوئی ہے، تو اس نے ایک اچھی پرسنیلٹی والے اُلو کو اپنا مشیر بنایا اور اسے حکم دیا کہ وہ پروڈکشن میں

کمی کی وجوہات کا پتا لگائے اور ان وجوہات کا کوئی حل بتائے۔

الو نے اس کام میں تین مہینے لگائے اور کئی جلدوں پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مشکلات کی اصل وجہ ورکرز کی زیادہ تعداد ہے، اس لیے ورکرز کی تعداد کو کم کیا جائے۔

یہ رپورٹ ملتے ہی شیر نے حکم دیا "چیونٹیوں کو بہانے بہانے سے نوکری سے نکال دیا جائے، کیوں کہ ان میں اب کام کرنے کا جذبہ باقی نہیں رہا۔"

اس کے حکم پر فوراً ہی عمل کر دیا گیا اور یوں سب چیونٹیاں ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ نہ رہیں چیونٹیاں اور نہ رہی پروڈکشن گویا نہ رہا بانس اور نہ رہی بانسری۔

وزن کم کرنے کے ۱۳ طریقے

ابنِ منیب

ا۔ کپڑے ڈھیلے پہنیں

۲۔ تصویر ہمیشہ دور سے لیں اور کوشش کریں کہ پاس کوئی بڑی چیز جیسے بس ٹرک یا بلند عمارت ہو

۳۔ وزن کرتے ہوئے ہمیشہ ایک پاؤں زمین پر رکھیں (اور دوسرے سے سکیل کو دبائیں یہاں تک کہ سوئی آپ کے آج کے ہدف تک پہنچ جائے)

۴۔ ڈبلے پتلے اور خوراک کا خیال رکھنے والے دوستوں سے تعلقات توڑ دیں

۵۔ خود کو یقین دلائیں کہ موٹاپے کا احساس صرف اور صرف آپ کے دماغ کی خرافات ہیں۔ روزانہ سو مرتبہ یہ ورد کریں "آئی ایم بیوٹی فل، آئی ایم پرفیکٹ"

۶۔ گھر کے تمام آئینے توڑ کر باہر پھینک دیں

۷۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں خوب کھانا کھائیں تا کہ کھانے کے وقت بھوک کم لگے

۸۔ کھانا ہمیشہ بہت زیادہ بنائیں تا کہ بچے ہوئے کھانے کو دیکھ کر یہی احساس ہو کہ کم کھایا

۹۔ ڈاکٹر کو رشوت دے کر "مکمل صحتمندی" کا سرٹیفکیٹ حاصل کریں

۱۰۔ اپنے کمرے میں جگہ جگہ جاپانی پہلوانوں کے پوسٹر اور تصاویر آویزاں کریں

۱۱۔ روزانہ متعدد بار ورزش سے بھاگیں۔ بقیہ اوقات میں ریلیکس کریں اور ورزش کا خیال دل میں نہ لائیں

۱۲۔ موٹاپے کی طرف توجہ دلوانے والے دوستوں کو غلط وزن بتائیں اور انہیں اپنی آنکھیں چیک کروانے کا مشورہ دیں

۱۳۔ کھاتے ہوئے یاد رکھیں کہ کم کھانے کی صورت میں جلد ہی ایک شدید احساسِ محرومی آپ کو لاتعداد اشیائے خورد و نوش دیوانہ وار منہ میں ڈالنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ ایک متوازن انسان کبھی ایسے احساسات کو قریب پھٹکنے نہیں دیتا۔ اور آپ تو ہیں ہی بیوٹی فل، پرفیکٹ اور بیلینسڈ۔

سر درد

ارسلان بلوچ

بیگم کے سر میں درد تھا۔ میں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا اور دوا لکھ دی۔ میں نے چلتے چلتے پرہیز کے بارے میں پوچھا۔ ڈاکٹر نے کہا "یہ جتنا کم بولیں ان کے لئے اچھا ہے۔" خیر ہم نے دوا لی اور گھر آ گئے۔ بیگم نے دوا کھائی اور ٹھیک ہو گئی۔ چند دن بعد پھر سر میں درد ہوئی۔ میں پھر ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے پوچھا "پرہیز کیا یا نہیں؟" یہ بات کرتے کرتے ڈاکٹر صاحب مجھے پاس کھڑے پیڈسٹل فین کے پاس لے گئے اور میرا ہاتھ پکڑ کے پنکھے پر رکھا اور کہنے لگے "دیکھو یہ کتنا گرم ہے کیونکہ اس کے پر سارا دن چلتا رہتا ہیں۔ اس لئے یہ گرم ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں زیادہ دیر چلنے سے جل بھی سکتا ہے بالکل اسی طرح آپ کی بیگم کی زبان زیادہ چلنے کی وجہ سے اُن کا دماغ گرم ہو جاتا ہے اور سر درد شروع ہو جاتا ہے اور اس میں بہتری لانے کے لئے بالکل پنکھے کی طرح زبان کو کچھ دیر بند کرنا پڑتا ہے۔" خیر پھر ڈاکٹر نے دوا دی۔ جاتے جاتے میرے ذہن میں سوال آیا اور میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ جس طرح گرم حالت میں زیادہ دیر پنکھا چلنے سے پنکھا خراب ہونے کا خدشہ ہے کیا اس طرح دماغ بھی خراب ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلایا اور کہنے لگے "جی ہو سکتا ہے مگر انکا نہیں آپ کا۔"

بریکنگ نیوز

کراچی: معروف مزاح نگار
مشتاق یوسفی انتقال کر گئے

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

عنایت علی خان

یوسفی صاحب

یوسفی صاحب بھی اپنی زندگی کے چورانوے سال اس جہان فانی میں بسر کر کے اقتضائے کُلّ مَن علیھا فَان وَّیبقیٰ وَجہُ رَبِّکَ ذُوالجلال وَالِاکرام (سورہ رحمٰن) (جو کچھ برسرِ زمین ہے وہ سب ختم ہوجانے والا ہے اور باقی رہنے والی ذات تو تیرے صاحب جلال واکرام رب ہی کی ہے) دارالبقا کو ہجرت کر گئے۔ ''اِنا للہ وانا الیہ راجعون۔'' بے شک ہم اللہ ہی کے (بندے) ہیں اور لازماً ہمیں اُسی کی جانب لوٹ کر جانا ہے۔

جناب ظہیر فتح پوری کے اس جملے کی صداقت کی تائید کس معتبر ادیب نے نہیں کی ہوگی کہ ہم مزاحیہ ادب کے دور یوسفی میں جی رہے ہیں اور انہیں کے قبیلے کے نمایاں ترین شگفتہ نگار ادیب و شاعر جناب ابن انشا نے بھی یہی کہا ہے کہ اگر ہم اس دور کو کسی ادیب کے نام سے منسوب کر سکتے ہیں تو وہ مشتاق یوسفی کا نام ہے۔

یوسفی صاحب نے اپنی پیدائش کے حوالے سے لکھا ہے کہ والد مرحوم نواب صاحب ریاست ٹونک کے نہ صرف سیکرٹری تھے بلکہ ریاستی ماحول کے مطابق اپنے حافظ قرآن نواب کے معتقدین میں بھی تھے اور اُس وقت تک یہ روایت باقی تھی کہ نوزائیدہ کی پہلی پوشش ازرہ عقیدت مندی وحصول برکت کسی بزرگ کی اُترن سے تیار کی جاتی تھی۔ شومی قسمت سے ان کی پیدائش کے موقع پر نواب صاحب موصوف چند روز کے لیے ٹونک سے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں اُن کا استعمال شدہ کرتا میسر آنا کار دارد اور موصوف کی اُترن کے سوا کسی اور کپڑے سے نوزائیدہ کا جھبلا بننا منافی عقیدت تھا۔ چناں چہ نواب صاحب کی ٹونک مراجعت تک (جس میں متعدد دن لگ گئے) یہ اپنے بستر پر ننگ دھڑنگ ہی پڑے رہے۔ اب یہ نواب صاحب کی اُترن کا کرشمہ تو یقیناً نہیں تھا کہ نوزائیدہ نے عروس ادب کو وہ خلعتِ فاخرہ عطا کیا جس کی دلکشی نے ادب سے شغف رکھنے والے ہر فرد کی نظر کو خیرہ اور فکر کو بالیدگی عطا کی۔ اگر یہ مذکورہ اُترن ہی کا کرشمہ ہوتا تو نواب صاحب کے اخلاف کی اکثریت ریاست کے اختتام پر اس کسمپرسی کا شکار نہ ہوتی جس کا عبرت ناک مشاہدہ راقم نے کیا، کیوں کہ پہلی پوشش ان کی بھی یقیناً نواب صاحب کی اُترن ہی سے ہوتی ہوگی۔ لیکن بقول شاعر (بادنیٰ تصرف) ؎

ایں سعادت ''بجبر'' اُترن نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

لفظ تصرف درمیان میں رہ گیا ہے تو اصل موضوع سے چندے گریز کر کے یوسفی صاحب کی زیرکی وحس مزاح کا یہ واقعہ سنتے چلیے کہ ایک بار حاضر خدمت ہوا اور یہ حاضری کا شرف بربنائے ہم وطن ہی تھا ورنہ جیسا کہ ایک موقع پر راقم کی ہمت افزائی کے طور پر فرمایا تھا کہ میں اور یہ (بیگم) دونوں آپ کے مداح ہیں تو عرض کیا تھا یوسفی صاحب آپ اور میرے مداح، کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی۔ ہاں تو فرمایا تھا بھائی میں نے بھی دو تصرفات کیے ہیں۔ عرض کیا آپ تو تصرفات کے بادشاہ ہیں مثلاً:

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

یا ؎

مضمحل ہوگئے قویٰ غالبؔ
اب عناصر میں ابتذال کہاں

یا ''وارداتِ قلبی'' وغیرہ۔ تو عطا فرمایئے۔ فرمایا دونوں اشعار ہمارے پیارے دوست (اس موقع پر پیارے دوست ہی کہا تھا ورنہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو اپنے دورِ جوانی کے پیارے دوستوں کو ''معشوق'' کہا کرتے تھے۔) اپنے جیپوری کالج کے ساتھی الیاس عشقی (ڈائرکٹر ریڈیو حیدرآباد کا حال احوال مجھ سے اسی لقب سے پوچھا کرتے تھے۔) افتخار عارف کے ہیں۔ (پرسوں نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے) ان کا مشہور شعر ہے ''تجھ سے بچھڑ کر زندہ ہیں۔ جان! بہت شرمندہ ہیں۔ فرمایا جب صدر غلام اسحاق خان نے بے نظیر کو وزارت سے برطرف کیا تو یہ چند نکتوں کا ہیر پھیر ہو گیا تھا۔

تجھ سے پچھڑ کر زندہ ہیں
خان بہت شرمندہ ہیں

اب ''جان'' کو ''خان'' تو شاید راقم بھی اپنی افتادِ طبع سے بنا لیتا لیکن بچھڑنے کو پچھڑنا بنانا یوسفی صاحب ہی کا کام تھا۔ عرض کیا اور دوسرا تصرف بھی عطا فرمایئے ارشاد ہوا وہ بھی انہی کا شعر ہے کہ۔

مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اُتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

پھر تمہیداً ارشاد ہوا مٹی کے علاوہ پانی بھی تو ایک عنصر ہے۔ عرض کیا وہ تو کراچی میں کمیاب ہونے کی وجہ سے بڑا اہم عنصر ہے۔ اب تصرف سنیے کہ لفظ ''واجب'' سے کیا استفادہ کیا ہے۔ ارشاد ہوا۔

پانی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ غسل اُتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

اور جب میں نے ایک ادنیٰ ترین تصرف گوش گزار کیا کہ مصرع میں کسی لفظ یا نکتے کا رد و بدل یا حک و اضافہ نہ تھا بلکہ تخلص غالب کے حروف کی نشست کو اُلٹ دیا گیا تھا۔

پوچھتے ہیں وہ کہ بالغ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

لیجیے تصرفات کی رو میں ''ہم کہاں سے چلے تھے کہاں آ گئے''

یوسفی صاحب

یوسفی اردو ادب کی شان تھے
ایک نستعلیق وہ انسان تھے
آئے ہجرت کر کے ہندوستان سے
سر بسر لیکن وہ پاکستان تھے
تھے تو پطرس بھی پشاور سے ضرور
کچھ کا کہنا ہے کہ یہ بھی خان تھے
ساتھ کوئی بزم میں ہو یا نہ ہو
وہ اکیلے بزم کے دل جان تھے
منتظر رہتے تھے سب ان کو سنیں
وہ کہ ایسے دلنشیں مہمان تھے

عتیق الرحمٰن

بات بچپن میں تیار کردہ پیرہن سے چلی تھی جس کا چند روز انتظار کرنا پڑا تھا کیوں کہ اس کا استعمال شدہ ہونا ضروری تھا اور جو ایک بے نام مبغضہ گوشت کو ڈھانپنے کے لیے درکار تھا اور وہی ناچیز و بے نام مبغضہ گوشت اپنی شعوری زندگی سے لے کر اپنی بے مثال صلاحیتوں تک جلوہ ریزی اور دنیائے ادب کے عروج کمال تک پہنچنے کے بعد (اور پھر ہم جسے بڑی عمر دیتے ہیں اُسے ابتدائی کیفیت کی طرف لوٹا دیتے ہیں) کے بموجب زندگی کے آخری ایام میں پوشش کے لیے ان تین بے سلی سفید چادروں کا منتظر تھا جن کی قسمت پر کسی ریاست نواب کا کیا ذکر زمانے کے شہنشاہ منزلت افراد بھی رشک کرتے۔ وہ جسم جس کی ابتدا بھی بے چارگی کی حالت میں ہوئی تھی، دنیائے شعور و ادراک سے اپنا لوہا منوا کر دوبارہ اسی بے چارگی کی حالت میں اپنے لاتعداد مداحوں کے جھرمٹ میں آسودہ خاک پڑا یہ ناطق فیصلہ سن رہا تھا کہ ''منہا خلقنٰکم وفیہا نعیدکم ومنہا نخرجکم تارۃً اُخریٰ'' (ہم نے اسی (مٹی) سے تمہاری تخلیق کی اسی میں تمہیں واپس لائیں گے اور پھر دوبارہ اسی سے اُٹھا کر کھڑا کر دیں گے۔) مداحوں کی فرمائش پر راقم بدرگاہِ ربّ غفور دست بدعا تھا کہ بارالٰہ ہمارے اِن بزرگ کی لغزشوں سے ہم گنہگاروں کی سفارش سے درگزر فرما اور ان کی نیکیوں کا بیش از بیش اجر عطا کر۔ ان کی مغفرت فرما۔

حافظ سید عبدالکریم رضوان

یوسفی کی ظرافت نگاری

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کے موجودہ دور میں اردو کے طنزیہ ومزاحیہ ادب میں جو مقبول نام گردش کررہے ہیں ان میں ایک نام مشتاق احمد یوسفی کا بھی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی راجستھان کے ٹونک شہر میں ۱۹۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن جے پور تھا جہاں انہوں نے گریجویشن تک کی تعلیم حاصل کی پھر علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم۔اے اور ایل۔ایل بی۔ کیا۔ پی۔سی۔ایس کا امتحان پاس کرکے ۱۹۵۰ء تک ہندوستان میں ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر فائز رہے۔ والدین کے ہجرت کرنے کی وجہ سے انہوں نے بھی ۱۹۵۰ء میں ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان کے کراچی شہر میں سکونت اختیار کی اور بینک کی ملازمت کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا۔ بینک میں مختلف عہدوں پر رہتے ہوئے مشتاق احمد یوسفی نے لندن کا بھی سفر کیا وہاں انہوں نے گیارہ سال گزارے اور ۱۹۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر کراچی میں اپنے شب وروز گزار رہے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی کا ادبی سفر ۱۹۵۵ء میں مضمون ''صنف لاغر'' سے شروع ہوتا ہے جو لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ ''سویرا'' کی زینت بنا۔ اس طرح مختلف رسالے میں گاہے گاہے ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ ۱۹۶۱ء میں مختلف انشائیوں اور مضامین کو یکجا کرکے مشتاق احمد یوسفی کا پہلا مجموعہ ''چراغ تلے'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔ اب تک ان کے کل پانچ مجموعے شائع ہوچکے ہیں۔ جن کی فہرست اس طرح ہے۔ ''چراغ تلے'' ۱۹۶۱ء، ''خاکم بدہن'' ۱۹۹۰ء، ''زرگزشت'' ۱۹۷۶ء، ''آب گم'' ۱۹۸۹ء اور ''شام شعرِ یاراں'' ۲۰۱۴ء میں۔

یہ ساری کتابیں اپنی تمام تر مزاحیہ چاشنی کے ساتھ اردو زبان وادب کے قارئین کو مسحور کیے ہوئے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کا نام اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے بھی ہجرت کی کربنا کیوں کو اپنے تخلیقی شعور کے ذریعے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا حصہ بنادیا۔ ان کی تحریروں میں انشائیے، خاکے، آپ بیتی اور پیروڈی سب کچھ شامل ہے اور ان سب میں طنز ومزاح کی وہ پرلطف روانی موجود ہے جسے پڑھ کر اردو زبان کے مزاحیہ ادب کا ہر قاری مشتاق احمد یوسفی کا گرویدہ نظر آتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی کی تخلیقات میں سماج کی بدلتی قدروں اور ماضی کی یادوں کا ایسا منظر نامہ موجود ہے جس کی روشنی میں ہم ایک مہاجر کی زندگی اور اس کے ذہنی وفکری شعور کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ ان کی نگارشات کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان کی تحریروں میں جابجا ان کے آبائی وطن کی جھلکیاں کسی نہ کسی صورت میں نظر آتی ہیں مثال کے طور پر رسم ورواج کے تعلق سے جب گفتگو ہوتی ہے تو کس طرح ان کی تحریروں میں راجستھان کا ذکر آتا ہے ملاحظہ کریں:

> ''راجستھان کے راجپوتوں میں الٹا دستور ہے اونٹ پر بیٹھی ہوئی عورت کے انداز نشست کو دیکھ کر ایک میل دور سے بتلا سکتے ہیں کہ وہ سوار کی بہن ہے یا بیوی۔ بہن کو راجپوت سردار ہمیشہ آگے بٹھاتے ہیں تاکہ خدانخواستہ گر پڑے تو فوراً پتہ چل جائے۔ بیوی کو پیچھے بٹھاتے ہیں۔ اور محبوبہ کو اغوا کے لیے دیس میں

ہمیشہ گھوڑے استعمال ہوتے ہیں۔"۳۸

اس اقتباس میں جہاں مزاح کی شگفتہ لہر دکھائی دیتی ہے وہیں مشتاق احمد یوسفی کے تحت الشعور میں بیٹھی ماضی کی یادوں کو قلم بند کرنے کی شعوری کوشش بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ کسی بھی انسان کا سب سے یادگار لمحہ اس کا بچپن اور اس کی یادگار سرزمین وہ جگہ ہوتی ہے جہاں اس نے اپنے بچپن کے کھٹے میٹھے پل گزارے ہوں۔ انسان اس کی یادوں اور اس کے ذکر سے بچ نہیں سکتا اور اگر یہ کسی شاعر یا ادیب کی یادوں کا حصہ ہو تو اس کا فنی اظہار تو لامحالہ ہوگا ہی۔ مشتاق احمد یوسفی کی اس خصوصیت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر مظہر احمد نے اپنی کتاب "صاحب طرز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ" میں لکھا ہے:

'ناسٹل جیا دراصل مشتاق احمد یوسفی کا ناسٹل جیا نہیں، ان پاکستانیوں کا بھی ناسٹل جیا ہے جو تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین پاکستان گئے تھے اور جس نے تادم تحریر انہیں گلے سے نہیں لگایا اور ہمیشہ "مہاجر" کی تہمت ان پر لگی رہی۔ ان پاکستانیوں میں وہ حلقہ جو ادیب اور شاعر کہلاتا ہے۔ اس ناسٹل جیائی کیفیت کا نسبتاً زیادہ شکار رہا۔ انہیں اپنے وطن، اپنے بچپن، جوانی اور زندگی کے ایک بڑے حصے کی یاد ستاتی رہی جس کا اظہار انہوں نے اپنے ادب میں کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر پاکستانی ادیبوں کی تخلیقات میں ماضی پرستی کی ایک مسلسل کیملتی ہے۔ مشتاق احمد یوسفی جن کا اصل وطن راجستھان ہے اس سے کس طرح بچ سکتے تھے۔"۱

ڈاکٹر مظہر احمد کی ان تحریروں کی روشنی میں یہ بات پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ مشتاق احمد یوسفی نے جہاں اردو زبان کے مزاحیہ ادب کو فروغ دیا وہیں اس کے پس پردہ اپنے یاد ماضی کا غم بھی غلط کیا ہے۔ بہر کیف اس سے قطع نظر اگر مشتاق احمد یوسفی کی ظرافت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو ان کے ہاں مزاح نگاری کے ساتھ ساتھ طنزیہ تحریریں بھی وافر مقدار میں موجود ہیں۔ جس

قطعۂ تاریخِ وفاتِ یوسفی

پھولؔ! رخصت ہو گئے دنیا سے اک اعلیٰ ادیب
دے گئے بزمِ ادب کو اک خزانہ وہ بڑا
راستی کا درس دیتے تھے وہ از راہِ مزاح
"خوش ادا مشتاق احمد یوسفی اہلِ ہُدا"
(۲۰۱۸عیسوی)

تنویر پھولؔ، نیویارک

میں انہوں نے سیاست، سماج، مذہب اور ادب میں پیدا ہونے والی کج رویوں اور خامیوں کو نشانہ طنز بنایا ہے۔ ان کی طنز نگاری میں ہمدردی کا جذبہ شامل ہے ان کا ماننا ہے کہ جب تک انسان کسی شہر سے خوب رج کر پیار نہ کرے تب تک اس کی خوبیوں سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ سماج کی ان بے راہ رویوں کی بڑی سنجیدگی کے ساتھ پیش کرتے ہیں جن سے انسانی سماج ہر روز نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔

"آب گم" میں شامل مضمون "اسکول ماسٹر کا خواب" ایک ایسا ہی طنزیہ مضمون ہے جس میں انہوں نے سماج کی ان سچائیوں کو مختلف کرداروں کے ذریعے بے نقاب کیا ہے اور قارئین کو یہ سوچنے کے لیے مجبور کیا ہے کہ سماج میں بے دھڑک جاری اس رشوت خوری کے لیے کون ذمہ دار ہے ہمارا معاشرتی نظام یا انسانی ضرورت۔ جس کے متعلق وہ مکالماتی انداز میں لکھتے ہیں:

"ماسٹر نجم الدین برسوں سے چیتھڑے لٹکائے ظالم سماج کو کوستے پھرتے ہیں۔ انہیں ساڑھے چار سو روپے کھلائے، جب جا کے بھانجے کے میٹرک کے نمبر بڑھے۔ اور رحیم بخش کو چوان سے مسکین کون ہوگا؟ ظلم ظالم اور مظلوم دونوں کو خراب کرتا ہے۔ ظلم کا پہیہ جب اپنا چکر پورا کر لیتا ہے اور مظلوم کی باری آتی ہے تو وہ بھی وہی کچھ کرتا جو اس کے ساتھ کیا گیا تھا۔ اژدھا سالم نگلتا ہے۔ شارک دانتوں سے خون کر کے کھاتی ہے۔ شیر ڈاکٹروں کے بتائے ہوئے اصولوں کے

مطابق اچھی طرح چبا چبا کر کھاتا ہے۔ بلی چھپکلی، مکڑی اور مچھر حسب مقدور خون کی چسکی لگاتے ہیں۔ بھائی میرے بخشا کوئی نہیں۔ وہ یہاں تک پہنچے تھے کہ معاً انہیں انکم ٹیکس کے ڈبل بھی کھاتے یاد آگئے۔ اور وہ بے ساختہ مسکرا دیے۔ بھائی میرے بخشا کوئی نہیں سب ایک دوسرے کے رزق ہیں۔ بڑے جتن سے ایک دوسرے کو چیڑتے پھاڑتے ہیں تب نظر آتی ہے اک لقمۂ تر کی صورت۔'' ۲

مشتاق احمد یوسفی کی ان تحریروں نے معاشرے کی ان سچائیوں کو اجاگر کر دیا جو ہمارے معاشرے کو کسی نہ کسی طرح سے آلودہ کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوعات کے لیے ہمیشہ انسانی زندگی کے روز مرہ کے معمولات اور ان سے متعلق چیزوں سے کام لیا ہے۔ ان کی تحریروں میں پطرس بخاری کی طرح کتے کا اور رشید احمد صدیقی کی طرح چارپائی کا بھی ذکر ہے مگر یہ دونوں مضامین پطرس بخاری کے کتے اور رشید احمد صدیقی کی چارپائی سے کچھ مماثلت رکھتے ہوئے بھی ان سے بہت مختلف ہیں۔ پطرس بخاری اپنے مضمون کتے میں کتوں سے ڈرتے ہیں اس کے برعکس مشتاق احمد یوسفی نے کتے کو پالا ہے اور اسے بہت عزیز رکھتے ہیں۔ اسی طرح جہاں رشید احمد صدیقی کی چارپائی میں بیسویں صدی کے ابتدائی دور کے سماجی سیاسی اور تہذیبی منظر نامے دکھائی دیتے ہیں اس کے برعکس مشتاق احمد یوسفی کی چارپائی پر بیسویں صدی کے نصف میں بدلتے ہوئے کلچر کی عکاسی کی گئی ہے۔ چارپائی اور کلچر، ان کا یہ مزاحیہ اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ وہی چارپائی ہے جس کی سیڑھی بنا کر سگھڑ بیویاں مکڑی کے جالے اور چلبلے لڑکے چڑیوں کے گھونسلے اتارتے ہیں۔ اسی چارپائی کو وقت ضرورت پٹیوں سے باندھ کر اسٹریچر بنا لیتے ہیں۔۔۔۔ اسی طرح جب مریض کھاٹ سے لگ جائے تو تیماردار موخر الذکر کے وسط میں بڑا سا سوراخ کر کے اول الذکر کی مشکل آسان کر دیتے ہیں اور جب ساون میں کالی گھٹائیں اٹھتی ہیں تو اودوان کھول کر لڑکیاں دروازے کی چوکھٹ اور والدین چارپائیوں میں جھولتے ہیں۔ اسی پر نومولود بچے غاؤں غاؤں کرتے اور چندھیاتی ہوئی آنکھیں کھول کر اپنے والدین کو دیکھتے ہیں اور روتے ہیں اور اسی پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے پیاروں کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔'' ۳

اس مضمون میں انہوں نے جہاں چارپائی سے لیے جانے والے مختلف کاموں کا ذکر کیا ہے وہیں اس مضمون میں انہوں نے چارپائی کی مختلف قسمیں اور ان کے نام بھی گنوائیں ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے اس مضمون کو پڑھ کر شاید ہی کوئی شخص نہ ہنسے ورنہ اس کے ہر ہر جملے پر ہنسی کا فوارہ چھوٹنا تو لازمی ہے۔ ان کی مزاح نگاری کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے کہ وہ اپنی ظریفانہ

مشتاق یوسفی مرحوم

مشتاق یوسفی جو تھے عالم میں انتخاب
تھے وہ سپہرِ اردو کے رخشندہ ماہتاب
اردو ادب کو ان پہ ہمیشہ رہے گا ناز
ان کی نگارشات کا کوئی نہیں جواب
برِ صغیر میں ہی نہیں تھے وہ سربلند
تھے وہ جہانِ فکر میں فنکار کامیاب
گلہائے رنگارنگ کی خوشبو سے جا بجا
ہے گلشنِ ادب میں معطر ہر اک کتاب
سب سرگذشت لکھتے ہیں ان کی ہے زرگذشت
عہدِ رواں میں طنز و ظرافت کا احتساب
ادبی نقوش شہرۂ آفاق ان کے ہیں
ہوتے رہیں گے اہلِ نظر جن سے فیضیاب
طرزِ بیاں میں طنز و ظرافت کی روشنی
ہے کوئی ماہتاب تو کوئی ہے آفتاب
عہدِ رواں میں جو بھی ہیں اردو کے قارئین
ان کی نگارشات میں زندہ ہے ان کا خواب
درجات ان کے خلدِ بریں میں بلند ہوں
اردو ادب پہ ان کے ہیں احسان بے حساب

احمد علی برقی اعظمی

تحریروں میں بڑی معصومیت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات کہہ جاتے ہیں۔

انہوں نے چارپائی کے استعارے میں جس طرح اس کی تہذیبی خصوصیت کا ذکر کیا ہے اسی طرح بدلتے ہوئے سماجی دھارے کی بات کہی ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے اشارے اشاریمیں یہ کہہ دیا تھا کہ یہ مضمون اس تہذیب کا قصیدہ نہیں بلکہ ''مرثیہ'' ہے۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی تمام تحریروں کو پرلطف اور دلچسپ بنانے کے لیے ہر طرح کے حربے کو استعمال کیا۔ ان کی تحریروں میں تاریخ، فلسفہ، تلمیحات، کردار نگاری، منظر نگاری، مکالمہ نگاری، اشعار کے برمحل استعمال کے ساتھ ساتھ پیروڈی کی بھی مختلف قسمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ خاص طور سے انہوں نے جو الفاظ اور اشعار کی پیروڈی کی ہے وہ تو قابل داد ہے۔ ''آب گم'' کا یہ پرلطف اقتباس دیکھئے ہیں جس میں مشتاق احمد یوسفی نے اپنی فن کارانہ صلاحیت اور تراشیدہ الفاظ کے ذریعے تحریف نگاری کی ایک عمدہ مثال قائم کردی:

> ''تیسرے بچے کے بعد ان کے شوہرانہ توجہات میں فرق آگیا تھا۔ طبع آزاد نے ایک بیوی پر توکل نہ کیا۔ مدتوں زنان زود یاب کی خوش بستری میں نروان ڈھونڈھا کیے۔ جب تک بدراہ ہونے کی استطاعت رہی تنگنائے نکاح سے نکل نکل کر شب خون مارتے رہے اور بے زبان بیوی یہ سمجھ کر کے سب کچھ انگیز کرتی رہی کہ کچھ اور چاہیے وسعت میری میاں کے لیے۔''۴

اس اقتباس کو دیکھ کر ہم بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشتاق احمد یوسفی نے الفاظ کی تراکیب میں ہلکی سی تبدیلی کر کے کس طرح جملوں کو پُر مزاح بنادیا۔ یہ پیروڈی اپنے اندر جہاں مزاحیہ کیفیت کی روانی لیے ہوئے ہے وہیں اس میں مشتاق احمد یوسفی نے ایسے مردوں پر زوردار طنز کی چوٹ کی ہے جو اپنی آزاد اور عیش پسندی کے باعث اپنے گھروں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔ مشتاق احمد یوسفی کے اسی گہرے سماجی شعور کو دیکھتے ہوئے مجنوں گورکھپوری نے اپنے ایک مضمون میں ان کے متعلق لکھا ہے:

> ''یوسفی کی تحریروں کی ایک ممتاز خصوصیت یہ بھی ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کا تعلق زندگی کے عام حالات وواقعات سے ہوتا ہے، وہ کبھی سبک یا سستی نہیں ہو پاتیں۔ لکھنے والے بشرے کی طرح ان کی تحریریں بھی گھمبیر ہوتی ہیں اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ ان کا خالق زندگی کی اصلیت اور اس کے راز کو اچھی طرح جانتا اور سمجھتا ہے۔''۵

مشتاق احمد یوسفی کی تحریروں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کی تحریروں میں ماضی کی حسین یادوں کے ساتھ سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی کارفرمائیاں بھی موجود ہیں جسے انہوں نے اپنی تخلیقی صلاحیت اور فن کاری سے اردو زبان کے طنزیہ ومزاحیہ ادب کا حصہ بنادیا۔ ان کی ان ادبی کاوشوں کو مقبول بنانے میں ان کے رنگارنگ موضوعات کے ساتھ ان کے دلکش انداز بیان شوخ اور شگفتہ طرز ادا کا بھی ہاتھ ہے۔ اس بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی کی طنز ومزاح نگاری میں ادبی لطافت کی چاشنی کے ساتھ معیاری رنگ وآہنگ بھی شامل ہے۔

حواشی

۱۔ زرگزشت، مشتاق احمد یوسفی، حیدرآباد، ۱۹۹۸ء، ص ۱۵۰

۲۔ صاحب طرز ظرافت نگار مشتاق احمد یوسفی ایک مطالعہ، ڈاکٹر مظہر احمد، کتابی دنیا دہلی، ۲۰۱۳ء۔ ص ۳۳۰

۳۔ آب گم، مشتاق احمد یوسفی، کتاب والا دہلی، ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۰۹

۴۔ چراغ تلے، مشتاق احمد یوسفی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی ۲۰۱۰ء، ص ۱۵۹

۵۔ آب گم، مشتاق احمد یوسفی، کتاب والا دہلی، ۱۹۹۳ء۔ ص ۱۳۴

۶۔ اردو کے اہم مزاح نگار، اسد اللہ نیاز، کتاب سرائے بیت الحکمت لاہور، پاکستان ۲۰۱۲ء۔ ص ۱۶۲

بشکریہ اردو ریسرچ جرنل

احمد حاطب صدیقی

ہمارے یوسفی

یوسفی صاحب سے پہلا تعارف ''خاکم بدہن'' کے ذریعے سے ہوا۔۔۔ تعارف کیا ہوا؟ ہم تو اُن کے دیوانے ہوگئے۔ اُن کی کتابوں سے متعدد اقتباسات اپنی ڈائریوں میں نقل کیے اور دوستوں کو مزے لے لے کر سنائے۔ پورے اجتماع کو مل جل کر ہر فقرے پر غور کرنا پڑتا تھا کہ اس میں مزاح کے کون کون سے خفیہ خزانے پوشیدہ ہیں۔ پھر ہوا یوں کہ یوسفی صاحب کی دی ہوئی بہت سی دلچسپ اصطلاحات ہماری گفتگو کا حصہ بن گئیں۔ ڈھونڈ ڈھانڈ کر ''چراغ تلے'' بھی پڑھی گئی۔ پرانے رسالوں میں سے پرانے مضامین نکال نکال کر پڑھے گئے۔ قصہ مختصر یہ کہ ہماری چوکڑی یا چھکڑی یوسفی صاحب کی تحریروں کا باجماعت مطالعہ کرتی تھی۔ ''باجماعت مطالعہ'' ہماری کمزوری نہ تھی، ضرورت بن گئی تھی۔ وجہ اس کی یہ سمجھ میں آتی ہے کہ یوسفی صاحب کا فقرہ پڑھتے ہی جی چاہنے لگتا تھا کہ فوراً جا کر کسی کو سنایئے۔ ہمارے ایک دوست تو ''یوسفی کے حافظ'' ہوگئے تھے۔ اُن سے آپ کسی وقت بھی اور کوئی بھی معلومات حاصل کرسکتے تھے۔ پوچھ سکتے تھے کہ یوسفی صاحب نے اس موضوع پر جو بات کہی ہے، یا اس فقرے سے ملتی جلتی جو بات کہی ہے وہ کیا ہے؟ حضرت نہ صرف ''فقرہ مطابق اصل'' سنا دیتے تھے۔ بلکہ کوئی لفظ آگے پیچھے کرتے تھے نہ ہونے دیتے تھے۔ اگر کوئی کر بیٹھے تو فوراً تصحیح کرتے تھے۔ متعلقہ کتاب اور متعلقہ مضمون کا حوالہ بھی دیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یوسفی کے فقروں کو پروف ریڈروں جیسی مہارت سے پڑھنا پڑتا ہے۔ ہماری توجہ اس امر کی طرف انھی نے مبذول کرائی تھی کہ کس فقرے کو ہم ہمیشہ یوں پڑھتے رہے کہ۔۔۔ ''کھانے کی ترکیبیں بھی ذہن نشین کراتے جاتے تھے۔'' وہاں غور سے دیکھ کر پڑھو۔ 'ذہن نشین' نہیں ہے، ''ذہن نشین'' لکھا ہوا ہے۔

''زرگزشت'' آئی تو گویا ہر روز روزِ عید اور ہر شب شبِ برأت ہوگئی۔ دن نکلے اور راتیں کالیاں ہوتی گئیں۔ جب تک زرگزشت کے کئی ''ختم'' نہ کرلیے گئے چوکڑی کو چین نہ آیا۔ اصطلاحات کے ذخیرے میں مزید اضافہ ہوگیا۔ 'خمریاں، دف مارنا، خوبصورت وغیرہ وغیرہ۔

''آبِ گم'' کی بابت یاروں کی رائے ملی جلی تھی۔ مگر اس میں ایک نیا ''یوسفی'' دریافت کیا گیا۔ گو کہ جا بجا پرانے یوسفی سے بھی مڈھ بھیڑ ہو جاتی تھی۔ ہنسانے کے ساتھ ساتھ رُلا دینا تو یوسفی کا پرانا وتیرہ ہے۔ ''خاکم بدہن'' میں ''سیزر'' کا قصہ پڑھ لو۔

کراچی میں رہتے ہوئے کئی بار یوسفی صاحب سے بالمشافہ ملاقات کا جی چاہا۔ مگر خالد بھائی (جناب خالد احمد فارقی) نے جو اُس زمانے میں ایک بینک کے ایگزیکٹو تھے، (اور یوسفی صاحب غالباً بینکنگ کونسل کے چیئرمین تھے) یوسفی صاحب کی ''جباری و قہاری'' کا ایسا ''کان لیوا'' نقشہ کھینچا کہ ہمارے ذہن میں یوسفی صاحب ہی کا کھینچا ہوا ''اینڈرسن'' کا نقشہ گھوم گیا۔ ہم تو بس یہ شعر پڑھ کر رہ گئے ؎

بہت حسین تمنا ہے تجھ سے ملنے کی
میں تجھ سے مل کے اسے کیوں تباہ کر ڈالوں

پھر یوسفی صاحب ''ولایت'' کو پیارے ہوگئے۔ اُن کی خبریں وہاں سے آنے لگیں۔ ''ولایت پلٹ'' ہو کر وطن آئے تو

آہ یوسفی

کیا جانیے پھر لفظ کب پائے نُمود
کیا جانیے دنیا کو ہو پھر کب نصیب
مشتاق احمد یوسفی جیسا ادب
مشتاق احمد یوسفی جیسا ادیب

احمؔل سراج

عاداتِ ماسبق کے علی الرغم عوامی مجلسوں میں بھی شرکت فرمانے لگے۔ یوں انھیں کم از کم دیکھنے کا موقع تو مل ہی گیا۔ اُن کے متعلق ہمیں ہدایت یہی ملی تھی کہ

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا

مگر پھر بالمشافہ ملاقات بھی ہوگئی۔ ایک ہی ہوئی۔ لیکن یادش بخیر! سارا خوف کسی خفیہ رستے سے نکل گیا۔ اتنی سی ملاقات بھی خاصی دلچسپ رہی۔ انھیں اسلام آباد میں سید ضمیر جعفری مرحوم کی پہلی برسی کے موقع پر اکادمی ادبیات میں منعقد ہونے والی ایک تقریب کے مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لانا تھا۔ فقیر نے اکادمی کے صدر نشین جناب افتخار عارف سے کانا پھوسی کرتے ہوئے ایک رازدارانہ مشورہ مانگا۔ جس قدر آہستگی سے مشورہ طلب کیا گیا تھا، افتخار عارف صاحب نے اُسی قدر بلند آہنگ آواز میں جوابِ مشورہ دے ڈالا ''ہاں، ہاں! پڑجا پیچھے لٹھ لے کر۔''

(دیکھیے لٹھ بردار وہشت گرد اس طرح بنائے جاتے ہیں)۔ ''چشمۂ افتخار'' کی شہ پاتے ہی یہ عقیدت مندِ حقیر، کراچی سے تشریف لانے والے مہمان کی تشریفات (Protocol) بجا لانے کے لیے ائرپورٹ جا پہنچا۔ جہاز سے اُترتے ہی اِن بزرگ کا بریف کیس تھام کر (کیوں کہ دامن پتلون کے اندر کیے ہوئے تھے تاکہ پرایوں کی دست برد سے محفوظ رہ سکے) اُن سے التجا کی: اِک وقتِ خاص میرے بھی حق میں ''عطا'' کرو۔ از رہِ عنایت درخواست قبول فرمائی اور مُسکرا کر ارشاد کیا ''جب چاہیں مل لیجیے!''

پوچھا کہ ''جب کیسے چاہیں؟ آج تو آپ آرام فرمائیں گے۔ کل برسی کی تقریب میں رات گئے تک مصروف رہیں گے۔ پرسوں مفتی صاحب کے گھر عشائیہ ہے اور اس کے بعد...'' جواب دینے کے بجائے داد دینے لگے: ''آپ تو بہت باخبر معلوم ہوتے ہیں!''

عرض کیا ''آپ کی (مختصر سی) زلفِ گرہ گیر کا اسیر تو اُس وقت سے آپ کی خبر رکھتا ہے، جب آپ صرف ''مشتاق احمد'' کے نام سے لکھا کرتے تھے۔''

چونک کر چلتے چلتے رُک گئے۔ رُک کر سر سے پیر تک اِس حقیر، فقیر، پُر تقصیر اور اپنی زلفِ گرہ گیر کے اسیر کا سراپا بغور دیکھا۔ پھر متحیر ہو کر کہا ''آپ کی عمر تو اتنی نہیں معلوم ہوتی۔''

مجبوراً وضاحت کرنی پڑی ''یا پیر و مرشد! یہ خاک زادہ انگور بننے سے پہلے ہی مُنقّیٰ بن گیا تھا۔ خاکسار نے دورِ طالب علمی ہی میں ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی کے ''خزینۂ اوراق'' (Archives) میں دِن، دِن بھر بیٹھ کر پچاس کی دہائی میں نکلنے والے سب ادبی رسالے چاٹ ڈالے۔''

گفتگو ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ہم دونوں لاؤنج سے باہر پہنچ گئے۔ وہاں افتخار عارف صاحب اپنا استقبالی عملہ لیے ٹہل رہے تھے۔ اس غرض مند کو یوسفی صاحب کے ساتھ پولیس کی کسی ''دُمچی'' کی طرح ''دُمچی الف'' دیکھا تو سارا ماجرا سمجھ گئے۔ اُدھر یوسفی صاحب نے بھی گھگھیا کر کمبل کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہنا چاہا تو افتخار عارف صاحب نے اُن کی سنے بغیر ہی اعترافِ جرم کر لیا ''میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ پڑجا پیچھے لٹھ لے کر (پھر رازدارانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولے) اچھا لکھتا ہے۔''

افتخار عارف صاحب کے ان سفارشی کلمات کا نتیجہ یہ نکلا کہ یوسفی صاحب کے دیے ہوئے وقت پر پہنچ کر کالم نگار نے اپنے کالموں کے انتخاب پر مشتمل مسودہ اُن کی نذر کیا اور 'حرفِ سخن شناس' لکھنے کی درخواست کی۔ یہ درخواست بھی اُنھوں نے از رہِ بندہ پروری فی الفور قبول کر لی۔ پھر فرمایا ''گھر جا کر اطمینان سے

آہ یوسفی

ہماری خوش کلامیاں تو عہدِ یوسفی سے تھیں
ہمارے گنگ گنگ سے قلم سے تعزیت کریں
ہمارے قہقہے یتیم ہو کے رہ گئے ظفر
لواحقین یوسفی ہیں ہم سے تعزیت کریں

نوید ظفر کیانی

پڑھوں گا۔"

مسودہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا اور روانہ۔۔۔ کردیا ہمیں۔ اگلے روز تقریب ہوئی۔ تقریب سے اور دیگر مصروفیات سے فارغ ہوئے تو واپس کراچی چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد فون کیا۔

نہایت نحیف سی آواز آئی "ہلو!"

پوچھا: "یوسفی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

جواب کی بجائے سوال آیا اور قدرے غصے میں آیا "آپ کس یوسفی کو پوچھ رہے ہیں؟ یہاں تو کئی یوسفی ہیں۔"

ہم نے آواز پہچان کر عرض کیا "حضرت! ہمارے ایک دوست ہیں نسیم اختر یوسفی۔ گفتگو میں اُن کا تذکرہ مقصود ہو تو پورا نام لینا پڑتا ہے۔ صرف "یوسفی" کہا جائے تو اُس سے مراد اُردو مزاح نگاری کا وہی مشتاق ہوتا ہے، جس کے 'عہدِ یوسفی' میں ہم جی رہے ہیں۔"

سلامِ شناسائی کے بعد عرض سوال کیا تو بتایا۔۔۔ (دیکھئے اِس ناچیز کے کالم پڑھنے کا انجام)۔۔۔ کہ "آنکھوں میں انفیکشن ہوگیا ہے"۔

مزید بتایا "ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اصل خرابی کانوں میں ہے۔ بھائی! اپنی تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ خدا جانے کیا معاملہ ہے۔"

بہت تعجب ہوا کہ یوسفی صاحب تو کانوں کے کچے بھی نہیں ہیں۔ اور بھلا ایک گمنام اور گوشہ نشین لکھاری کے خلاف (خود اس کے کالموں کے سوا) اُنھیں کون بھڑکا سکتا ہے؟

خیر "زیروزبر" حرفِ سخن شناس کے بغیر ہی شائع ہوگئی اور اچھے مسلمانوں کی طرح اس گناہگار مسلمان نے بھی یہ سوچ لیا کہ چوں کہ ہر کام میں اللہ کی طرف سے کوئی نہ کوئی مصلحت پوشیدہ ہوتی ہے، جو جذباتی اور گناہگار بندوں کو کبھی نظر نہیں آتی، چناں چہ اپنی کتاب کو فرماں روایانِ سخن کی سفارش پر قارئین سے پڑھوانے کے لیے "پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا" یعنی جو ہوا اچھا ہوا۔ اس عاجز کے حق میں بھی اور یوسفی صاحب کے حق میں بھی۔ پس دلِ درد آشنا انور شعور صاحب کا یہ شعر پڑھ کر صبر کر بیٹھا ؎

خدا کا شکر سہارے بغیر بیت گئی
'کہ یہ کتاب' تمھارے بغیر بیت گئی

ہم نے اس دل کو دلاسا دیا کہ "مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔" یعنی عطر وہ ہوتا ہے جو خود چہار جانب خوشبو پھیلا کر (ہر قاری کے) مشامِ جاں کو معطر کردے، نہ کہ وہ جسے عطار بتائے کہ "اے اس کتاب کے قاریو! (کم بختو!) یہ عطرِ مزاح ہے۔" (اسے پڑھ کر ہنسو)۔

یوسفی صاحب کا بھلا یوں ہوا کہ فرض کیجیے یوسفی صاحب کو سن پچاس کی دہائی میں ہی پیغمبرانہ ذرائع سے یہ بات معلوم ہوجاتی کہ "اُردو مزاح کے عہدِ یوسفی" کا عزیزِ مصر بننے پر ایک مشقت لازم آئے گی۔ اُنھیں ہر طرح کے "برادرزادگانِ یوسفی" کی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔ اور اُن میں (مارے مروت کے، اور مارے باندھے) جھوٹ موٹ کی تحسین کے نقرئی پیالے تقسیم کرنے پڑیں گے۔ ایسا ہوجاتا تو شاید وہ اُسی زمانے میں گھبرا کر بقدمِ خود واپس گمنامی کے اندھے کنویں میں کود جاتے اور مزاح نگاروں کی زلیخائی بھگتنے کی بجائے کوئی ایسا آبرو مندانہ مشغلہ اختیار کرتے جس میں تحسینِ بے جا کی دست درازی کے ہاتھوں، بنی بنائی آبرو کے داؤ پر لگ جانے کا دھڑکا نہ لگا رہتا۔

آج اُردو مزاح کا عہدِ یوسفی تمام ہوگیا۔ اللہ مشتاق احمد یوسفی صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کی خطاؤں سے در گزر فرمائے۔ آمین!

بشکریہ روزنامہ جسارت، کراچی

عطاء الحق قاسمی

یوسفی صاحب

مشتاق احمد یوسفی سے گہری نیازمندی کا شرف مجھے بھی حاصل ہے۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ میں کراچی جاؤں اور اپنے دیرینہ دوست اشرف شاہین یا کسی اور کے ساتھ یوسفی صاحب کی طرف نہ جاؤں۔ چلتے چلتے یہ بھی بتاتا چلوں کہ اشرف شاہین جب لاہور ہوتا تھا شاہین اس کے نام کا حصہ تھا مگر جب سے کراچی گیا ہے، وہ اپنے نام کے ساتھ شاہین نہیں لکھتا، میاں لکھا کرو، شناختی کارڈ میں جنس کے خانے میں کبھی دیکھا ہے کہ کسی نام نہاد مرد نے بھی خود کو مرد نہ لکھا ہو، تم تو لاہور میں بھی شاہین تھے، کراچی میں بھی شاہین ہی ہو۔ چلو تمہاری خبر کبھی بعد میں لوں گا، میں یوسفی صاحب کے بارے میں اظہار خیال کرلوں، مگر میرے دوست مجھ سے یہ توقع بالکل نہ رکھیں کہ میں ان کی وفات کے حوالے سے رونے رلانے کے موڈ میں ہوں۔ یہ موڈ مجھ پر تب طاری ہوتا اگر وہ اپنی کتابیں بھی ساتھ لے گئے ہوتے، ان کی کتابیں یعنی وہ تو آج بھی میرے ساتھ ہیں، جب چاہوں ان سے مل لوں۔ میں یہ بھی نہیں کہوں گا کہ اب ہم عہد یوسفی میں نہیں رہے، لاحول ولا، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ان کا عہد ان کے خاکی وجود تک ہی تھا، وہ گئے تو اپنا عہد بھی ساتھ لے گئے۔ ہمارے پنجاب کے بعض دیہات میں ایک عجیب وغریب رسم ہے اور وہ یہ کہ جب کوئی بزرگ طویل العمری کے ساتھ بھرپور زندگی گزارتا ہے تو اس کی وفات پر بینڈ باجے بجائے جاتے ہیں اور اس کے ورثا میت کے آگے بھنگڑے ڈالتے ہوئے اسے قبرستان تک لے کر جاتے ہیں۔

مشتاق احمد یوسفی نے ۹۷ برس ہمارے ساتھ گزارے اور ہنستے ہنساتے رہے، مگر ان کے ہنسانے اور میرے ایسے کے ہنسانے میں بہت فرق تھا، ان کی مزاحیہ تحریر میں گہری معنویت ہوتی تھی۔ میں پہلے دن سے ان کا قاری تھا مگر عاشق ''آب گم'' پڑھ کر ہوا۔ جب میں نے ان کی یہ کتاب پڑھی تو کچھ سمجھ نہیں آئی کہ اسے ادب کے کس خانے میں رکھوں، کیا یہ سرگزشت ہے، کیا یہ محض طنز و مزاح ہے، کیا یہ خاکوں کی کتاب ہے، کیا یہ کوئی ناول ہے اور یا یہ کسی مفکر کی تحریر ہے جو کائنات کے اسرار و رموز پر غور کرتا رہتا ہے کیونکہ ''آب گم'' میں ان تمام اصناف کے اجزا موجود تھے۔ میں اس وقت بھی حیرت زدہ رہ گیا جب میں نے کراچی کے پسماندہ ترین علاقوں کی تصویر کشی اس میں دیکھی، لگتا تھا کہ یوسفی صاحب نے ساری عمر شاید انہیں جگہوں میں بسر کی ہے جن میں دروازوں کی جگہ ٹاٹ کے ٹکڑے لٹکائے گئے ہوتے ہیں۔ مجھے اس حیرت کا سامنا قراۃ العین کو پڑھتے ہوئے بھی ہوا تھا، ایک بڑا ادیب ہر طرح کی زندگی بغیر تجربے کے گزارنے کا اہل ہوتا ہے۔

یوسفی صاحب کو لاہور سے بہت محبت تھی۔ وہ میرے ساتھ یہاں بھی ایسی ایسی جگہوں میں گئے جہاں میں انہیں لے جانے سے کتراتا تھا مگر ایک دن عزیز کی فرمائش پر وہ گڑھی شاہو میں ''حافظ جوس کارنر'' گئے اور ہم نے باہر ایک بنچ پر بیٹھ کر انار کا جوس پیا۔ مجھے یوسفی صاحب کے اس دنیا سے رخصت ہونے کا دکھ ان کے جسد خاکی کے نظروں سے دور ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس لئے ہے کہ ہمارے ادبی گھرانے میں اب فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، پطرس بخاری، انتظار حسین، اشفاق احمد، مختار مسعود، عبداللہ حسین، احمد فراز، ابن انشاء، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، ممتاز مفتی، جوش ملیح آبادی اور قدرت اللہ شہاب کے علاوہ اور کتنے ہی مشاہیر چلتے پھرتے نظر نہیں آئیں گے۔ ان کے دم سے ہمارے آنگن کی رونقیں قائم تھیں۔ اب ہم ان کی کتابوں کو سینے سے لگائیں گے، ان سے سینہ نہیں ملا سکیں گے۔ یہ لوگ صرف ادیب نہیں تھے، یہ ایک تہذیب کے وارث بھی تھے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا ماضی قریب میں یوسفی صاحب اور انتظار صاحب سے ملنے اگر ان

کے گھر گیا ہوں تو وہ باہر گاڑی تک چھوڑنے نہ آئے ہوں اور گاڑی چلنے تک وہاں کھڑے نہ رہے ہوں۔ یہ لوگ ادب میں نئے آنے والوں کو خوشدلی سے خوش آمدید کہتے تھے۔اب ہمارے پاس لاہور میں ظفر اقبال ہی رہ گئے ہیں مگر ان کے ہونہار تخلیقی فرزند آفتاب اقبال انہیں شہر سے کوسوں دور اپنے فارم ہاؤس میں لے گئے ہیں۔ ہر شخص کے لئے کوئی نہ کوئی خوشی ایسی ہوتی ہے جو اسے سب خوشیوں سے عزیز ہوتی ہے۔ مجھے یقیناً اس بات پر فخر ہے کہ مجھے صدرِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ امتیاز، پرائیڈ آف پرفارمنس، ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز ایسے اعلیٰ ترین ایوارڈ میری مزاح نگاری پر مل چکے ہیں، مگر مجھے سب سے زیادہ خوشی اس وقت ہوئی تھی جب ایک دن فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف یوسفی صاحب تھے جو مجلس فروغ اردو ادب قطر کی ایوارڈ کمیٹی کی پاکستانی شاخ کے چیئرمین تھے۔انہوں نے یہ فون مجھے یہ بتانے کے لئے کیا تھا کہ کمیٹی نے اس سال کے ایوارڈ کے لئے آپ کا نام فائنل کیا ہے۔ مجھے یہ تسلیم کرنے دیں کہ مجھے کچھ دیر کے لئے لگا جیسے میں خواب دیکھ رہا ہوں کیونکہ اس سے پہلے یہ ایوارڈ ان صاحبانِ قلم کو ملا تھا جن سے ہم نے لکھنا سیکھا تھا۔

یوسفی صاحب صرف کتابوں ہی میں نہیں، اپنی گفتگوؤں میں بھی پھلجھڑیاں چھوڑتے تھے۔ وہ اگر میں لکھنے بیٹھ جاؤں تو یہ ایک کالم میں نہیں کسی کتاب ہی میں سما سکتے ہیں۔ میں چلتے چلتے کراچی آرٹس کونسل کے ''مستقل'' مدارالمہام احمد شاہ کو خراجِ تحسین اور شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ وہ اپنی دلنواز شخصیت کے سبب یوسفی صاحب کو اس سال بھی اپنی سالانہ ادبی کانفرنس میں لانے میں کامیاب ہو گئے اور یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی تاہم تحریروں سے ملاقات کا سلسلہ جاری ہے، چلیں آخر میں آپ کی ملاقات بھی یوسفی صاحب سے کرائے دیتا ہوں۔

''مونگ پھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا، ختم کیسے کرے۔''

''دنیا میں غالب واحد شاعر ہے جو سمجھ نہ آئے، تو دوگنا مزا آتا ہے۔''

''جس بات کو کہنے والا اور سننے والا دونوں ہی جھوٹ سمجھیں، اس کا گناہ نہیں ہوتا۔''

''انسان کو موت ہمیشہ قبل از وقت اور شادی بعد از وقت معلوم ہوتی ہے۔''

''خدا جانے حکومت آلو کو بزورِ قانون قومی غذا بنانے سے کیوں ڈرتی ہے، زنانہ لباس کی طرح یعنی برائے نام۔''

''صاف اِدھر سے نظر آتا ہے اُدھر کا پہلو۔''

''مسلمان کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔''

''محبت اندھی ہوتی ہے چنانچہ عورت کیلئے خوبصورت ہونا ضروری نہیں، بس مرد کا نابینا ہونا کافی ہے۔''

''گالی، گنتی، سرگوشی اور گندہ لطیفہ اپنی مادری زبان ہی میں مزا دیتا ہے۔''

''انسان واحد حیوان ہے جو اپنا زہر اپنے دل میں رکھتا ہے۔''

''بدصورت انگریز عورت نایاب ہے، بڑی مشکل سے نظر آتی ہے، یعنی ہزار میں سے ایک۔ پاکستانی اور ہندوستانی اسی سے شادی کرتا ہے۔''

''تماشے میں جان تماشائی کی تالی سے پڑتی ہے، مداری کی ڈگڈگی سے نہیں۔''

''یورپین فرنیچر صرف بیٹھنے کے لئے ہوتا ہے جبکہ ہم کسی ایسی چیز پر بیٹھتے ہی نہیں، جس پر لیٹا نہ جا سکے۔''

''بڑھاپے کی شادی اور بینک کی چوکیداری میں ذرا فرق نہیں، سوتے میں بھی ایک آنکھ کھلی رکھنی پڑتی ہے۔''

''پاکستان کی افواہوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ سچ نکلتی ہیں۔''

''لاہور کی بعض گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ اگر ایک طرف سے عورت اور دوسری طرف سے مرد آ رہا ہو تو نکاح کے علاوہ گنجائش ہی کوئی نہیں۔''

بشکریہ روزنامہ جنگ، راولپنڈی

رحمٰن فارس

مشتاق احمد یوسفی سے ایک ملاقات

اِدھر کچھ ماہ قبل ایک شوخ چنچل لڑکی ہمیں ملی۔ آدھ پون گھنٹے کی گفتگو کے بعد کہنے لگی کہ یوسفی صاحب! بات چیت میں تو آپ بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں مگر تحریر میں بالکل لُچے لگتے ہیں"۔

صاحبو! یہ جملہ ان درجنوں قہقہہ آور غیر مطبوعہ جملوں میں سے ایک ہے جو ہم نے یوسفی صاحب سے ملاقات کے دوران انھی کی زبانی سنے اور آپ کو سنانے والے ہیں۔ جب برسوں پرانے کسی خواب کی تعبیر مل جائے تو انسان خوشی سے گنگ، حیرت سے گم سم اور بے یقینی سے ہکا بکا رہ جاتا ہے۔ مشتاق احمد یوسفی سے مل کر ہم پر یہ تینوں شدتیں ایک ساتھ نازل ہوئیں۔ یہ کہنے میں کیا تکلف اور تامل کریں کہ یوسفی نے ہمارے بچپن کی گھنگھور اداسیوں کو سہلایا، نوجوانی کے گھٹاٹوپ شب و روز کو گرمایا اور گنجلک آلامِ روزگار کو آسان بنایا ہے! ہم ان سے ملے بغیر ان کے ان گنت احسانوں تلے دبے تھے۔ سو جب ملے تو ہمارا ساکت و ششدر رہ جانا ہی بنتا تھا۔

معروف و بے مثال شاعرہ ڈاکٹر عنبرین حسیب عنبر کا یہ احسان شاید ہم ساری زندگی نہ چکا پائیں کہ انہوں نے ہمیں یوسفی سے ملوایا۔ حسیب بھائی یعنی عنبر کے شوہر نامدار بھی ہمراہ تھے۔ ہم گھر ڈھونڈ ڈھانڈ کر پہنچے تو دروازے پر ایک عدد جید کتے کو چشم براہ پایا۔ دیدہ و دل ہی نہیں بلکہ دندان و دم بھی فرشِ راہ کیے بیٹھا تھا۔ یوسفی کا مرحوم کتا (اللہ بخشے) سیزر یاد آ گیا۔ یہ موجودہ سگ اس تاریخی سیزر کا سگا پڑپوتا ہے شاید۔ اس کا نام البتہ یوسفی نے ''زار'' رکھ چھوڑا ہے۔ واضح رہے کہ یہ زار و قطار رونے، آہ و زاریاں کرنے یا ''پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں'' والا زار نہیں، روسی شہنشاہوں والا زار ہے۔ نام تو تھا ہی شہنشاہوں والا، عادات بھی ہو بہو ویسی ہی تھیں۔ دم سادھے فرش پر یوں پڑا تھا جیسے تختِ پر نشئی بادشاہ۔ ''جو نا خلف دکھائیں سونا چار دیکھنا۔''

کتے نے (کہ جس کو کتا کہنا بدتہذیبی ہوگی) انگڑائی لی تو عنبر سہم کر کہنے لگیں کہ ''ارے ارے دیکھیے! ہمیں ہی کاٹنے کی تیاری کر رہے ہیں یہ!''

خانساماں نے آکر ترنت اس نانہجار کو طوق در گلو کیا تو ہماری گلوخلاصی ہوئی اور ہم اندر گھسے۔

یوسفی کے گھر کے ڈرائنگ روم سے جمالیات کا ہر پہلو ہویدا تھا۔ روشنی، رنگ، خوشبو، مصوری، موسیقی، مجسمے اور محبت! ہر شے ترتیب سے رکھی ہوئی۔ یوسفی داخل ہوئے تو ہم سمیت سب اسبابِ جمالیات نے تعظیم سے استقبال کیا۔ شلوار قمیص میں لپٹا چھیانوے سالہ انتہائی لاغر و نحیف جسم، ستا ہوا مگر ہنستا مسکراتا مطمئن چہرہ، آواز ایسی موہوم، ملائم اور مدہم کہ کان لگائے بغیر سننا مشکل (ہم تو خیر ان کے حرف حرف کے لیے ہمہ تن گوش تھے)۔ اٹھک بیٹھک اور چلت پھرت میں نقاہت مانع تھی مگر جب بولنے لگے تو چست و چاق و چوبند چٹکلے تھے کہ رنگ برنگ پھلجھڑیوں کے مانند ان کے لبوں سے پھوٹ رہے تھے۔ باتیں ایسی کہ مارے

خوشی کے دل دو چھانک ہو جائے۔ آتے ہی وہ صوفے پر بیٹھ گئے تو ہم بھی ہاتھ باندھے دھڑکتے دل لیے بیٹھ گئے۔

کمرے میں ایک دم گھمبیر خاموشی چھا گئی۔ ہم نے سوچا شاید لیجنڈ کی موجودگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ کافی دیر تک یوسفی ٹکٹکی باندھ کر فرش کو اور ہم ایک دوسرے کا منہ تکتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے نگاہ اٹھائی اور عنبر سے کہنے لگے "بھئی آپ کے جوتے بہت خوبصورت ہیں۔"

عنبر اس غیر متوقع جملے (حملے) کی تاب نہ لا کر شکریہ ادا کر کے ہنسنے لگیں۔ یوسفی بولے "آپ ہی کی عمر کی ہوں گی وہ لڑکی جو ہم سے ملیں۔ ڈاکٹر بن رہی تھیں شاید۔ رخصت ہوتے وقت اٹھلا کر کہنے لگیں کہ یوسفی صاحب! ایک بات تو بتایئے۔ آپ جیسے عمر رسیدہ مرد جب مجھ جیسی نوجوان لڑکیوں سے ملتے ہیں تو جاتے جاتے یہ کیوں کہتے ہیں کہ بھئی! ملتی رہا کرو۔"

اب قہقہوں کا دور شروع ہوا۔ ہم نے از راہ تلطف پوچھا کہ "سرکار! آج کل طبیعت کیسی ہے؟"

کہنے لگے "میاں! اپنے آپ پر پڑا ہوں۔ زندگی میں تو غم سے چھٹکارا نہیں ملنے کا۔"

ہم نے عرض کیا کہ "جی ہاں! غالب نے بھی یہی کہا تھا کہ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

ایک دم سنبھل کر بیٹھ گئے اور بولے کہ "نہیں! قیدِ حیات و بنتِ عم اصل میں دونوں ایک ہیں۔"

ایک اور قہقہہ لگا۔ ہم نے کریدنے کی خاطر پوچھا کہ "مرشد! آپ کی کتابوں میں سے کون سی آپ کے دل کے بہت نزدیک ہے؟"

آنکھوں میں شرارت بھری چمک لیے بولے کہ "کتابوں کی تو خبر نہیں البتہ کچھ چہرے ضرور دل کے نزدیک ہیں جن کا نام لینے میں ہمیں تکلف ہے۔"

جملے کی داد دیجیے، صاحبو! ایسے جملے بولنے والے اب ایک ہاتھ کی ایک انگلی پر گنے جا سکتے ہیں۔ یوسفی کے معاملے میں ہم ایک سے آگے کی گنتی کے قائل نہیں کیونکہ ان کا کوئی ثانی ہے ہی نہیں۔

ہم نے سگِ زار کا ذکر چھیڑا کہ ماشا اللہ سے بہت صحت مند، چوکس اور ہوشیار کتا ہے۔ اللہ نظرِ بد اور مست ماداؤں سے بچائے۔

سوچ میں پڑ گئے۔ پھر فرمایا "ایک فرانسیسی ادیبہ کا قول ہے کہ "میں مردوں کو جتنا قریب سے دیکھتی ہوں، اتنا ہی مجھے کتے اچھے لگتے ہیں۔"

اِس سے پہلے کہ ہمارا فلک شگاف قہقہہ ان کی سماعت پر گراں گزرتا، بولے "مرزا کے ایک دوست ہیں جو کتیا کو کتیا نہیں کہتے، از راہِ احترام وعقیدت فی میل (Female) کہتے ہیں۔ مرزا کو جب سے اس بات کی خبر ہوئی ہے وہ بھی احتیاطاً اپنی بیگم کو فی میل کہنے لگے ہیں۔"

بلند بانگ قہقہے ذرا تھمے تو یوسفی پینترا بدل کر عنبر سے پوچھنے لگے "آپ کہاں ہوتی ہیں؟ اور کیا شغل فرماتی ہیں؟"

عنبر نے بتایا کہ "ہم کراچی ہی میں ہوتے ہیں اور شاعری کرتے ہیں۔"

نسیان کے باعث یوسفی بار بار بھول جاتے تھے کہ وہ عنبر سے یہ سوال پہلے پوچھ چکے ہیں لہٰذا اگلے ڈھائی گھنٹے میں بہت معصومیت سے بتیری بار یہ سوال پوچھا اور ہر بار عنبر نے مسکرا کر وہی جواب دیا۔ اور تو اور "لچے" والے جملے سے بھی ہم بارہا شاد کام ہوئے اور یوسفی کے انداز و ادا کچھ ایسے شاداب ہیں کہ ہر بار پہلے سے زیادہ ہنسی آئی۔

ایک بار تو ہم نے جی کڑا کر کے پوچھ ہی لیا کہ "مرشد! جس لڑکی نے آپ کو لچا کہا، آپ اس پر برہم نہیں ہوئے؟"

معصوم سی شکل بنا کر کہنے لگے: "نہیں، میاں! کہتی تو وہ ٹھیک ہی تھی!"

پھر کمرے کے اطراف واکناف پر ایک یوسفیانہ نظر ڈال کر بولے کہ "وہ سامنے راجستانی آرٹ کے دو نایاب نمونے ہیں۔ راجستانی راجہ اور رانی کی ایسی انوکھی شبیہیں جو ننھے ننھے موتیوں سے بنائی گئی ہیں۔ ہماری کتاب آبِ گم کا ہندی میں ترجمہ ہوا۔ پبلشر موصوف ہم سے ملنے آئے تو کہنے لگے کہ یوسفی صاحب! رقم

کی صورت میں نذرانہ تو ہم دے نہیں پائیں گے سو یہ دو نادر پینٹنگز نذر ہیں۔ گر قبول افتد وغیرہ۔ سو ہم نے رکھ لیں کہ ''نہیں جو مال میسر، مصوری ہی سہی۔''

ہم نے قریب سے جا کر مصوری کے وہ شاہکار دیکھے۔ واقعی شاہکار تھے۔ واپس آکر صوفے پر بیٹھے تو یوسفی کہنے لگے کہ ''آئل پینٹنگ اور ادھیڑ عمر عورت دور ہی سے دیکھنے پر اچھی لگتی ہیں۔''

ہم اس جملے کی ادھیڑ بن میں گم تھے کہ عنبر نے پوچھ لیا کہ ''یوسفی صاحب! آج کل آپ انٹرویو دیتے ہیں کیا؟''

بولے ''کچھ دن قبل ایک محترمہ انٹرویو لینے آدھمکیں۔ پہلا سوال ہی یہ کیا کہ یوسفی صاحب! آپ نے کبھی عشق کیا ہے؟ ہم نے کہا بی بی! ابھی تو آپ ٹھیک سے بیٹھی بھی نہیں اور یہ مطالبہ؟''

ہنس ہنسا چکنے کے بعد ہماری باری تھی کچھ کہنے اور (کھری کھری) سننے کی۔ سو ہم نے پوچھ لیا کہ آج کل کیا مصروفیات ہیں؟

کہنے لگے کہ ''میاں! انسان اس وقت تک کلچرڈ نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنی ہی کمپنی سے محظوظ ہونا نہ سیکھ لے۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال۔''

ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا کہ ''مرشد! آپ ہی نے لکھا ہے کہ کلچرڈ آدمی کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ مارلین منرو کے سراپا کی گولائیوں کو ہاتھ ہلائے بغیر بیان کر سکے۔''

کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ اتنے میں عنبر نے پوچھا کہ ''یوسفی صاحب! پھلوں میں کیا پسند ہے؟''

بولے ''ڈرائی فروٹ۔ خاص کر نکاح کا چھوارا۔ ویسے تو مونگ پھلی بھی پسند ہے مگر مونگ پھلی اور آوارگی میں خرابی یہ ہے کہ آدمی ایک دفعہ شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ ختم کیسے کرے۔'' تھوڑا سا ہنس ہنسا کر بولے ''بھئی آجکل مونگ پھلی پھانکنے کا وقت کس کے پاس؟ اب تو کمپیوٹرائزڈ تیز رفتار دور ہے۔ ہماری یہ حالت ہے کہ ایک اچھا جملہ تین چار دن تک نہال اور سرشار کیے رکھتا ہے۔''

ڈیڑھ گھنٹے کی لذت آمیز و قہقہہ آور گفتگو کے بعد ہم اور عنبر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اٹھنے کے اشارے کرنے لگے کہ یوسفی زیادہ دیر بیٹھ کر کہیں تھک نہ جائیں سو ہمیں چلنا چاہیئے اب۔

یہی بات ان سے کہی تو بولے ''بھئی جانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کرو۔''

عنبر بولیں کہ ''یوسفی صاحب! ہم تو جانے کا نام نہیں لیں گے۔ آپ ہی کی تھکان کا خیال ہے۔''

جواب میں عنبر سے کہنے لگے ''بھئی آپ کی قمیص بہت خوبصورت ہے۔ (پھر ہلکے سے توقف کے ساتھ) اب ہم قمیص سے دھیرے دھیرے شمال کی جانب جائیں گے۔ (ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ) یہ قمیص اتنی خوبصورت ہے کہ ہمارا بھی ایسے کپڑے پہننے کو دل چاہ رہا ہے۔''

یوسفی اب مکمل چارج ہو چکے تھے۔ عنبر نے پوچھا کہ ''اپنی کمپنی انجوائے کرنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟''

بولے ''ایسے دوست بنایئے اور ایسی کتابیں پڑھیے کہ جو آپ کو سوچنے کی تحریک دیں۔''

عنبر بولیں ''اور اگر ایسے دوست نہ ہوں تو؟''

''ایسی حالت میں عام طور سے لڑکیاں شادی کر لیتی ہیں۔''

حسیب بھائی کافی دیر سے خاموش بیٹھے تھے۔ ہم نے کہنی سے ٹہوکا دیا کہ کچھ کہیے تو کہنے لگے کہ ''یوسفی صاحب! ہم نے اور عنبر نے شادی تک ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا۔''

یوسفی بولے ''پرانے زمانے میں بھی دلہا دلہن کو ایک دوسرے کے چہرے آئینے میں دکھانے کی رسم (آرسی مصحف) نکاح کے بعد ہوا کرتی تھی۔ نکاح سے پہلے چہرے دکھانے میں کسی ایک یا دونوں فریقوں کے بدکنے اور نکاح کینسل ہو جانے کا ڈر تھا۔''

ہم نے ہنستے ہوئے کہا ''حالانکہ آپ نے خود ہی لکھا ہے کہ نکاح مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں۔''

کہنے لگے ''بھئی ہمارے ہاں کراچی میں مردِ مومن کو مردِ میمن کہا جاتا ہے۔''

باتوں باتوں میں انور مقصود، فاطمہ ثریا بجیا اور زبیدہ آپا کا ذکر

آیا تو کہنے لگے کہ ''زبیدہ آپا کو دال بگھارنے کی رائلٹی ملتی ہے جبکہ ہمیں شیخی بگھارنے کی۔''

قہقہے لگ چکے تو ہم نے پوچھا کہ ''آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟''

ہلکے سے تبسم کے ساتھ فرمایا ''انگریزی ادب زیرِ مطالعہ ہے۔ کیونکہ اردو کا فکشن اور بیشتر ناول ایسے ہیں کہ بندہ بیوی کو منہ دکھانے کے لائق نہیں رہتا۔''

حبیب بھائی دوبارہ گفتگو میں تشریف لائے ''یوسفی صاحب! آپ کو کون سا موسم اچھا لگتا ہے؟''

فرمایا ''اپنے اندر کا موسم۔ اس سے جڑ جائیں تو باہر کی گرمی سردی کی کیا فکر!'' پھر عنبر سے کہنے لگے ''اقبال کا مصرعہ ہے کہ گوہر تابدار کو اور بھی تابدار کر۔ اس میں آپ گوہر کے لفظ کو شوہر سے بدل کر اپنے شوہر کو سنا سکتی ہیں۔''

ہر ہر جملہ ایسا تھا کہ قربان جایئے۔ ہم نے پوچھا کہ ''آپ نے اپنی تمام تصنیفات میں کھانے پینے کا بہت ذکر کیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟''

کہنے لگے ''لڑکپن اور جوانی میں جب بدمعاشی کے تمام ذرائع بزرگوں نے بند کر دیے تو کھانا پینا ہی بچا تھا۔''

عنبر نے موقع دیکھ کر کہا کہ ''فارس! بہت باکمال شاعر بھی ہیں۔''

ہمیں دیکھ کر کہنے لگے: ''میاں! کچھ ہو جائے پھر؟''

ہم ایک دم گڑبڑا گئے، کہاں یوسفی جیسا نابغۂ روزگار، کہاں ہماری تک بندیاں۔ عرض کی کہ ''یوسفی صاحب! اب آپ کو بھلا ہم کیا سنائیں۔''

کہنے لگے ''اچھا! تو آپ ہمیں اس قابل نہیں سمجھتے۔''

ہم نے ڈرتے ڈرتے تین شعر پیش کیے۔ پہلے دو پر بھرپور داد دی جو تا عمر ہمارا اثاثہ رہے گی۔ شعر یوں تھے ۔

خوشبوئے گُل نظر پڑے، رقصِ صبا دکھائی دے
دیکھا تو ہے کسی طرف، دیکھیے کیا دکھائی دے
تب مَیں کہوں کہ آنکھ نے دید کا حق ادا کیا
جب وہ جمالِ کم نما دیکھے بِنا دکھائی دے!

تیسرا شعر پڑھا تو یوسفی نے ایک تاریخی جملہ کہا۔ شعر تھا کہ

دیکھے ہوؤں کو بار بار دیکھ کے تھک گیا ہوں مَیں
اب نہ مجھے کہیں کوئی دیکھا ہوا دکھائی دے!

شعر سن کر مسکرائے اور فرمایا ''بھئی! مردوں کی بدنیتی کی کیا خوب شاعرانہ تاویل لائے ہیں آپ۔''

ہم عش عش کر اٹھے حالانکہ غش کھانے کا مقام تھا۔

ڈھائی گھنٹے کی نشست کے بعد بھی یوسفی کے وہی چٹکلے تھے، وہی ٹھٹھے اور وہی ولولے۔ ہم نے یوسفی کے ساتھ ڈھیر ساری تصاویر بنائیں اور رخصت چاہی۔ اٹھتے اٹھتے عنبر نے مشہور جملہ داغنے کی کوشش کی کہ ''ہم اردو مزاح کے عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں۔''

کہنے لگے: ''جو کہتا ہے کہ ہم اردو مزاح کے عہدِ یوسفی میں زندہ ہیں وہ خود کو زلیخا سمجھتا ہے''

ہم قہقہے لگاتے اٹھے اور کمرے سے دالان تک آنے کے لیے مرشد کو اپنے کاندھے کا سہارا پیش کیا۔ ہمارے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دوسری طرف کھڑی عنبر سے کہنے لگے ''بھئی! آپ بھی تو سہارا دیجے۔''

پھر عنبر کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے ''ہماری عمر میں لاکھوں میں سے ایک آدھ مرد میں شرارت اور بدمعاشی بچتی ہے۔ ہم وہی ایک آدھ ہیں۔''

رخصتی قہقہے سے ان کے گھر کا دالان گونج اٹھا۔ ہم بے اختیار یوسفی صاحب کے گلے لگ گئے۔ پاؤں چھوئے۔ عقیدت آنسو بن کر آنکھوں سے جاری تھی۔ مشتاق احمد یوسفی کروڑوں لوگوں کے دلوں میں بستے ہیں مگر ہم ان کے خاص الخاص عاشق ہیں۔ مولائے سخن ان کو عمرِ خضر عطا فرمائے کہ ریاکار لکھاریوں، شاعر نما مداریوں اور شہرت کے پجاریوں کے دور میں یہ شخص سچا، سچا، کھرا اور خالص فنکار رہا ہے!

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں، ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم، اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

بشکریہ ''ہم سب''

مشتاق احمد یوسفی

ضمیر جعفری مرحوم کی رحلت پر خصوصی تحریر

ضمیر حاضر ضمیر غائب

غالبؔ کا ایک بہت مشہور مصرع ہے:

ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

اس مصرع کو گزشتہ ۱۵۰ برسوں سے ہر اچھا آدمی اور ہر بری حکومت اپنے دفاع میں پیش کرتے آئے ہیں۔

شعر کا اگر پہلا مصرع نہ پڑھا جائے تو پہلی نظر میں یہ مصرع سوالیہ معلوم ہوتا ہے مگر درحقیقت ہے استفہام انکاری۔ اس کا مطلب ہم یہ سمجھے کہ اگر آپ سے پوچھا جائے، کیا آپ نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جسے سبھی اچھا کہیں تو آپ کے ذہن میں اپنے سوا کسی اور کا نام نہ آئے! اس کا سبب اپنی ذات سے عقیدت کی زیادتی ہوتا ہے۔ اب ذرا دیر کو اس نقیض یعنی الٹ پر بھی غور کیجیے۔ فرض کیجیے میں ورڈلی وزڈم (فراستِ ارضی) سے لبریز اور بحر سے خارج مصرع اس طرح کہتا

ایسا بھی کوئی ہے کہ برا جس کو سب کہیں

تو ذہن میں ایسے ایسے اور اتنے سارے نام آئیں گے کہ انھیں لب پہ لاتے ہوئے اپنے معصوم بال بچوں کا خیال آ جائے گا۔ مطلب یہ کہ دوسروں کے بارے میں اچھی بری رائے معلوم کرنے کی خاطر دنیا جہاں سے 'پنگا' تھوڑا ہی لینا ہے۔

یہ تو ہوا غالب کے مصرعے کا الٹا سیدھا لیکن مجھے تو اس مصرعے میں استفہام اقرار و استثنائی بھی نظر آتا ہے۔ میں اپنے بائی پاس شدہ دل اور اپنی چاروں کتابوں پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں۔۔۔ جسے کسی اعتبار سے مختصر نہیں کہا جا سکتا... ایک ایسا بھی خدا کا بندہ دیکھا ہے جسے اس کی زندگی میں اور اس کے رخصت ہونے کے بعد بھی کسی نے برا نہیں کہا۔ یہ فوزِ عظیم اور رتبہ بلند جسے ملا اسے سب کچھ مل گیا۔ سید ضمیر جعفری مرحوم و مغفور کو سب نے اچھا اس لیے کہا کہ وہ واقعی اچھے تھے۔ انھوں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا، کسی کو برا نہیں کہا۔ کسی کے برے میں نہیں تھے اور ایسا کسی مصلحت عافیت بینی یا صلح جوئی کی پالیسی کے تحت نہیں کیا بلکہ انھوں نے سب سے محبت کی جو بے لاگ، بے غرض اور غیر مشروط تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ لوگ ڈنر یا محفل ختم ہو جانے کے بعد بھی اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ انھیں یہ کھٹکا لگا رہتا ہے کہ اگر ہم چلے گئے تو عزیز ترین دوست ہماری غیبت شروع کر دیں گے مگر اللہ کے ایسے بھی منتخب بندے ہیں جن کے نام اور کام کا غلغلہ ان کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اور زیادہ بلند ہوتا ہے۔ ضمیر جعفری انھی نیک نام اور نایاب و عجوبۂ روزگار بندوں میں سے ایک تھے۔

مجھے ان سے قربت، گاڑھی، دوستی یا گستاخانہ بے تکلفی کا دعویٰ نہیں۔ میری نیاز مندی کی مدت کم و بیش ۵۰ برس بنتی ہے۔

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

میں نے یہ وضاحت آغازِ گفتگو میں کرنی اس لیے بھی ضرور سمجھی تھی کہ میری ارادت اور تعلقِ خاطر کی مدت کے تعین کے ساتھ ساتھ سامعین کو میرے سنِ پیدائش تک پہنچنے میں ذہن پر زیادہ زور نہ دینا پڑے۔ ہماری عمروں میں اتنا زیادہ تفاوت نہیں تھا کہ وہ مجھے

’’جیسے رہو لکھتے رہو‘‘ کہہ کر میرے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیریں اور نہ یہ فرق اتنا کم تھا کہ میں ان کے ہاتھ یا زانو پہ ہاتھ مار کے یا تین منٹ بعد ان کے چٹخارے دار فقرے کی داد دوں۔ تین منٹ کی وقفہ بندی اس لیے کہ پیر و مرشد کے ملفوظات اور گل افشانی گفتار کی رفتار کا یہی عالم تھا۔

نصف صدی کی طویل مدت بالعموم ایک دوسرے سے بے زار ہونے کے لیے کافی ہوتی ہے اس لیے کہ اتنے عرصے میں سارے عیب و ہنر کھل جاتے ہیں۔ امریکا میں ایک حالیہ سروے سے یہ دل چسپ انکشاف ہوا ہے کہ ۵۰ فی صد جوڑوں کی طلاق شادی کے تین سال کے اندر ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتے۔ بقیہ ۵۰ فی صد کی طلاق ۴۰ سال بعد ہوتی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایک دوسرے کے مزاج سے بہت اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ ۵۰ برس میں دوستانہ تعلق کا وہی حال ہو جاتا ہے جس کی تصویر غالب نے مرزا تفتہ کے نام اپنے خط میں کھینچی ہے۔ لکھتے ہیں:

’’جیسے اچھی جورو برے خاوند کے ساتھ مرنا بھرنا اختیار کرتی ہے۔ میرا تمھارے ساتھ وہ معاملہ ہے۔‘‘

یوں تو غالب کا ہر قول حرفِ آخر کا درجہ رکھتا ہے لیکن مجھے اس میں تھوڑا سا اضافہ کرنے کی اجازت ہو تو عرض کروں گا کہ تعلقات میں مزید پیچیدگی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب دونوں فریق ایک دوسرے کو اپنی مظلوم زوجہ تصور کر کے اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنے لگتے ہیں مگر ضمیر جعفری کے کیس میں ایسا جوگ نہیں پڑتا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا، ان کے خلوص کی گہرائی اور شفافیت زیادہ واضح اور آشکارا ہوتی جاتی۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا، میں نے انھیں کبھی کسی کی برائی، غیبت یا مذمت کرتے نہیں دیکھا۔ دوستانہ ملاقاتوں میں کبھی اپنے اشعار سناتے نہیں دیکھا۔ اپنے کسی دکھ، تکلیف، پریشانی یا الجھن کا ذکر کر کے اوروں کو مغموم کرنا انھوں نے نہیں سیکھا تھا۔ ہمیشہ مسکراہٹیں اور خوشیاں ہی خوشیاں بانٹیں۔ اپنے دکھ درد میں کسی کو شریک نہیں کیا۔

جیسے ہی میں یہاں اپنی آمد و فراغت کی اطلاع دیتا، وہ سارے کام چھوڑ چھاڑ کر ہوٹل آ جاتے۔ دیرینہ بے تکلفی و بے تعلق خاطر کے پیش نظر وہ کرنل محمد خاں کو متروک روزمرہ کے مطابق اپنے ساتھ لوا لاتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے چقماق کا درجہ رکھتے تھے۔ نئی نسل کے جن پڑھنے والوں نے چقماق نہیں

مشتاق احمد یوسفی

چار مہینے ہونے آئے تھے۔ شہر کا کوئی لائق ڈاکٹر بچا ہوگا جس نے ہماری مالی تکالیف میں حسب لیاقت اضافہ نہ کیا ہو۔ لیکن بائیں کہنی کا درد کسی طرح کم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ علاج نے جب شدت پکڑی اور مرض نے پیچیدہ ہو کر مفلسی کی صورت اختیار کر لی تو لکھنؤ کے ایک حاذق طبیب سے رجوع کیا جو صرف مایوس اور لب گور مریضوں پر عمل مسیحائی کرتے تھے۔ مریض کے جانبر ہونے کا ذرا بھی امکان نظر آئے تو بگڑ جاتے اور اسے دُھتکار کر نکلوا دیتے کہ جاؤ، ابھی کچھ دن اور ڈاکٹر سے علاج کراؤ۔ اللہ نے ان کے ہاتھ میں کچھ ایسا اعجاز دیا تھا کہ ایک دفعہ ان سے رجوع کرنے کے بعد کوئی بیمار خواہ وہ بستر مرگ پر ہی کیوں نہ ہو، مرض سے نہیں مر سکتا تھا۔ دوا سے مرتا تھا۔

دیکھی، ان کی آسانی کے لیے یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے پر اپنی ماچس رگڑ کر پھلجھڑیاں چھوڑتے۔ پھر یہ قول نظیر اکبرآبادی تماشا دیدنی ہوتا۔

یوں تو ہم کچھ بھی نہ تھے مثل انار و مہتاب
جب ہمیں آگ لگائی تو تماشا نکلا!

شروعات ضمیر جعفری کرتے تھے۔ وہ شوشہ چھوڑنا جانتا تھے اور کرنل محمد خاں اس پر شگوفہ کھلانا جانتے تھے۔ ضمیر جعفری کی چٹکی سے چبھن کے بجائے گدگدی ہوتی تھی۔ ایک دن انھوں نے مجھے ہشکارا کہ آج کل کرنل صاحب اپنی کتاب ''بجنگ آمد'' میں سے

بعض اوقات احباب اس بات سے بہت آزردہ ہوتے ہیں کہ میں اُن کے مشوروں پر عمل نہیں کرتا حالاں کہ اُن پر عمل پیرا نہ ہونے کا واحد سبب یہ ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا خون کسی عزیز دوست کی گردن پر ہو اس وقت میرا منشا صلاح و مشورہ کے نقصانات گنوانا نہیں (اس لیے کہ میں دماغی صحت کے لیے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ انسان کو پابندی سے صحیح غذا اور غلط مشورہ ملتا رہے اسی سے ذہنی توازن قائم رہتا ہے۔

مشتاق احمد یوسفی

اپنے فیورٹ الفاظ چن چن کر نکال رہے ہیں۔ آج صبح سویرے سے اس میں جتے ہوئے ہیں۔ آپ گھما پھرا کر پوچھیے گا۔ میں نے کرنل صاحب سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ کسی کرم فرمانے مجھے مطلع کیا ہے کہ ''بجنگ آمد'' میں، میں نے لفظ ''دھڑلے'' ۳۷ مرتبہ استعمال کیا ہے۔ صبح سے میں ۲۵ ''دھڑلے'' تو نکال چکا ہوں۔

وہ واقعی اتنے ہی نظر آرہے تھے جتنا کہ کوئی بھی معقول اور

خانہ مجھ پر چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے۔ خیر گزری کہ برطانیہ میں کل تین مہینے ٹھہرے، ورنہ لاکھوں گھر بگڑ جاتے۔

پھر کہنے لگے کہ کرنل صاحب آج کل نئے ایڈیشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ آپ ان سے کہیے کہ آپ نے سفرنامے میں میمیں بہت ڈال دی ہیں۔ خدارا، ان کی تعداد چار سے نہ بڑھنے دینا۔

مرزا غالب تو ڈھلتی جوانی میں کلکتہ گئے تھے جب کہ کرنل محمد

کراچی میں موسم ہر لحظہ روئی کے بھاؤ کی طرح بدلتا رہتا ہے۔ ہم نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک ہی عمارت کے کرایہ دار ایک منزل سے دوسری منزل پر تبدیلی آب و ہوا کی غرض سے جاتے ہیں۔ یہاں آپ دسمبر میں ململ کا کرتہ یا جون میں گرم پتلون پہن کر نکل جائیں تو کسی کو ترس نہیں آئے گا۔ اہل کراچی اس موسم کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ اگر یہ دو تین گھنٹے تبدیل نہ ہو تو وحشت ہونے لگتی ہے اور بڑی بوڑھیاں اس کو قربِ قیامت کی نشانی سمجھتی ہیں۔

صحت مند آدمی ۲۵ دھڑلے خوردبین اور چمٹی کی مدد سے نکالنے کے بعد لازمی طور پر نڈھال ہو جائے گا۔

اسی طرح جب کرنل صاحب کا سفرنامہ 'برطانیہ 'بسلامت روی'' شائع ہوا تو ضمیر بھائی نے مجھ سے کہا کہ اس کے ہر تیسرے صفحے پر ایک نئی حسینہ ایمان، فارن ایکسچینج اور بڑھاپے کی آزمائش کے لیے جلوہ افروز ہوتی ہے۔ حسیناؤں کی مجموعی تعداد ''دھڑلوں'' سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ برطانیہ کا نام آتے ہی ان کا وہی حال ہوتا ہے جو غالب کا کلکتے کے ذکر سے ہوتا تھا۔ ایک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے! لندن تو ایک طرف رہا، اگر میں کوہاٹ یا ڈیرہ غازی خاں کے سفر کا بھی ذکر کر دوں تو سارا اپری

خاں ریٹائرمنٹ کے بعد بڑھاپے کے گلابی جاڑے میں میموں کی زیارت کرنے کے لیے نکلے۔ بڑی ہمت اور حوصلے والے تھے، ورنہ اس مرحلۂ عمر میں بعضا بعضا تو ڈھنگ سے ہائے ہائے کرنے کے لائق بھی نہیں رہتا۔

سہ پہر کو کرنل صاحب سے ضمیر بھائی اور بریگیڈیر صدیق سالک کی موجودگی میں ملاقات ہوئی تو میں نے جی کڑا کر کے عرض کیا۔ ''کرنل صاحب! کتاب میں نازنینوں کی تعداد آپ کی ذاتی ضرورت سے زیادہ ہے۔ آخر کو مقامی انگریزوں کا بھی حق شفعہ بنتا ہے! نئے ایڈیشن میں تعداد کم از کم نصف کر دیجیے۔''

بولے ''مجھے خود بھی احساس ہے مگر کیا کروں، جس کو بھی نکالتا

ہوں، وہ روتی بہت ہے۔“

پنڈی اور اسلام آباد کی صحبتوں کو بریگیڈیر صدیق سالک بھی ایک زمانے میں باقاعدہ بے قاعدگی سے رونق بخشتے تھے۔ پھر وہ جنرل ضیاء الحق کی تقریریں لکھنے پر مامور ہو گئے اور ہمیں صبر آ گیا۔ ایک دن ضمیر جعفری نے وضاحت کی کہ صدیق سالک جنرل صاحب کی تقریروں میں مزاح اس طرح ڈالتا ہے جیسے کرنل محمد خاں نے اپنے سفرنامے میں میمیں ڈالی تھیں۔

ہمیں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جنرل صاحب بھی مزاح کے اثر اور رکاوٹ کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔

مزاح مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

ایک مرتبہ میرے پر اشتیاق بلاوے پر ضمیر بھائی کو آنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے دبے الفاظ میں کربِ انتظار کی شکایت کی تو بولے ”ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔“ معلوم ہوا کہ باعثِ تاخیر وہ اپنے سن پیدائش کو گردانتے ہیں۔ یہ تو نہیں کہا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بس اتنی اطلاع دی کہ اب میں جوان نہیں رہا۔

میں نے کہا ”آپ Understatement سے کام لے رہے ہیں۔“

بولے ”بڑھاپے میں یہ بھی مزہ دیتا ہے۔“

میں نے پوچھا ”ضمیر بھائی! کبھی ڈاڑھی رکھنے کا خیال آتا ہے؟“

بولے ”کیوں نہیں۔ دشمنوں نے کئی مرتبہ Suggest کیا ہے۔ مگر میں پہلے ہی بہت Overweight ہوں۔ میرے گھٹنے مزید بوجھ نہیں اٹھا سکیں گے۔“

اس پر میں نے انھیں تازہ لطیفہ سنایا جو انگریزی محاورے کے مطابق مجھ تک Horse mouth سے براہِ راست پہنچا تھا۔ ہوا یہ کہ ہمارے کرم فرما میجر ابن الحسن نے جو بہت اچھے ادیب، شگفتہ کالم نگار اور بذلہ سنج تھے، اچانک ڈاڑھی رکھ لی۔ ان کی ملاقات شاہ احمد نورانی سے ہوئی تو مولانا نے پوچھا ”ڈاڑھی رکھنے کے بعد آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں؟“

میجر ابن الحسن نے جواب دیا ”روحانی اعتبار سے کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا لیکن بھوک بہت لگنے لگی ہے۔“

اس مضمون کے سلسلے میں ضمیر جعفری سے نصف صدی قبل ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتوں اور صحبتوں کی یادوں اور باتوں کو ذہن میں تازہ کرنے بیٹھا تو عجیب کیفیت سے دوچار ہوا جس کا قطعاً اندازہ یا اندیشہ نہیں تھا۔

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب دینے دفتر کو
ورق جب اس کا اڑا لے گئی ہوا ایک ایک

پھر خیال آیا کہ پورٹریٹ نہ سہی، عکس رخِ یار سے پس منظر بھی تو دمک اٹھتا ہے، تو پھر ایامِ رفتہ اور ان بزم آرائیوں کی ایک ہلکی سی جھلک کیوں نہ دکھا دوں جب پہلے پہل ان سے کراچی میں ملاقات ہوئی۔

میں آج مر کے بھی بزمِ وفا میں زندہ ہوں
تلاش کر مری محفل مرا مزار نہ پوچھ

جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے اور میرا حافظہ بہت دور تک کام کرتا ہے۔ صرف قریب کی باتوں اور واقعات کو یاد رکھنے سے انکاری ہے تو جہاں تک یاد پڑتا ہے۔ ضمیر بھائی سے میرا تعارف ۱۹۵۱ء کے اواخر میں نہایت عزیز دوست میاں فضل حسن مرحوم کے توسل سے ہوا۔ فضل صاحب شعر و ادب، شکار اور موسیقی کے رسیا تھے۔ جامع الحیثیات شخصیت، کئی ہزار کتابوں اور ایک مل کے مالک تھے۔ شاعروں اور ادیبوں کو اس طرح جمع کرتے تھے جیسے بچے ڈاک کے استعمال شدہ ٹکٹ یا خارج المیعاد یعنی پرانے سکے جمع کرتے ہیں۔ وہ ہر اتوار کو سات آٹھ شاعروں کو گھیر گھار کر گارڈن ایسٹ میں اپنے دولت کدے پر لاتے جہاں ایک بجے تک گپ اور لنچ کے بعد مشاعرے کا رنگ جمتا۔ لنچ کا ذکر اس لیے بھی کرنا پڑا کہ من جملہ دیگر لذائذ کے دسترخوان پر چنیوٹ کا اچار بھی ہوتا تھا جس میں مجھ سے فرق ناشناس کو بس اتنا ہی فرق معلوم ہوتا تھا کہ زیادہ کھٹا ہوتا ہے اور سرسوں کے تیل میں اٹھایا جاتا ہے جس کی بو مجھے اچھی نہیں لگتی۔ فضل صاحب کہتے تھے جس کیری پہ چنیوٹ کا طوطا بیٹھ جائے وہ بڑی جلدی پکتی اور گدر ہوتی ہے۔

مرزا کہتے ہیں کہ طوطا اگر انڈسٹری پہ بیٹھ جائے تو وہ بھی خوب پھل دیتی ہے۔ ہمارے ناپسندیدہ تیل کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس میں الھڑ مٹیاروں کے ہاتھوں کی مست مہک آتی ہے جو سنہرے کھیتوں میں سرسوں چنتی ہیں! ہمیں آج بھی اس تیل کا اچار کھانا پڑا تو یہ سمجھ کے کھاتے ہیں گویا سنہرے کھیتوں میں مذکورہ بالا ہاتھوں سے مصافحہ کر رہے ہیں۔

ان کے ہاں بھینس کا گھی بھی چنیوٹ سے آتا تھا جس کے مخصوص خواص شاہی حکیموں کے نسخوں سے کشید کیے گئے تھے۔ چنیوٹ کی جس بھینس کے گھی میں سالن بنتا تھا، وہ "پہلن" بتائی جاتی تھی یعنی پہلی بار بیاہی ہوئی۔ اس نہلے پر ایک مرتبہ ضمیر صاحب نے یہ دہلا لگایا کہ میں تو صبح ناکتخدا یعنی کنواری بھینس کا مکھن توس پر لگا کر کھاتا ہوں۔ اس دعوے کے ثبوت میں اتنا تن و توش پیش کیا جو ہم جیسے بناسپتی خوروں کے برابر تھا۔ مولانا ماہر القادری کسی ایسے میزبان کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے جس کے گھر میں کھانا بناسپتی گھی میں پکتا ہو یا جہاں فرش پر بیٹھ کر کھانا پڑے۔ میرے یہاں دونوں فقیرانہ قباحتیں تھیں۔ چناں چہ کبھی ان کو مدعو کرنے ہمت نہ پڑی۔ فرماتے تھے، کبھی کوئی دھوکے سے بناسپتی گھی میں بنے سالن کا ایک لقمہ بھی کھلا دے تو دوسرے دن پتا چل جاتا ہے۔ لاکھ سر ماروں مصرع موزوں نہیں ہوتا۔ شعر میں کبھی سکتہ پڑتا ہے اور کبھی شتر گربہ ہو جاتا ہے۔ طبیعت میں انشراح کے بجائے قبض محسوس ہوتا ہے۔ شعر رک رک کر آتا ہے۔ فرش پر دسترخوان بچھا کر کھانے کے بارے میں مولانا فرماتے تھے کہ اس طرح بیٹھ کر کھانے سے دائرۂ شکم پچک جاتا ہے اور اشتہا اور معدے کا مکعب انچ cubic inch رقبہ آدھا رہ جاتا ہے۔ ضمیر جعفری خوش خوراک ضرور تھے مگر رئیسانہ نفاستوں اور نخروں سے دور رہتے تھے۔ فرشی نشست انھیں بھی پسند نہیں تھی مگر وجہ دوسری تھی۔ تشنہ لب را تشنہ تر کردن روا ست (تشنہ لب کو تشنہ تر کرنا روا ہے)۔

جو شعرائے کرام ان ہفتہ وار محفلوں میں شریک ہوتے یا کھینچ بلائے جاتے، ان میں سید ضمیر جعفری، سید محمد جعفری، ظریف جبل پوری، ادیب سہارن پوری، ماہر القادری، اقبال صفی پوری اور بہزاد لکھنوی نمایاں تھے۔ یوں تو عندلیب شادانی، مجنوں گورکھ پوری، نشور واحدی بھی دو تین بار ان محفلوں کو رونق بخش چکے تھے۔ ہانکا کرنے والوں میں سید محمد جعفری، مسرت علی صدیقی اور راقم الحروف پیش پیش تھے۔ جو ملاقات آٹھ نو گھنٹے سے کم دورانیہ کی ہو، فضل صاحب اس کا شمار حادثاتی مڈبھیڑ میں کرتے تھے۔ کچھ شاعر اس لیے کتراتے تھے اور ضمیر جعفری ان میں سے ایک تھے۔ وہ کہتے تھے کہ لذیذ غذا کے بعد ہزار بار سنی ہوئی غزلوں سے ہاضمے پر بہت برا اثر پڑتا مگر نیند اچھی آتی ہے۔ دوسری وجہ جو انھوں نے بتائی وہ یہ تھی کہ ان دنوں ان کے پاس حفیظ جالندھری مقیم تھے جو اپنی بیوی کے ساتھ یک جائی اور ضمیر سے ایک گھنٹے کی بھی جدائی برداشت نہیں کرتے تھے۔ متروک سے محاورے کے مطابق صاحبِ خانہ لنچ پر جو سونے کا نوالہ کھلاتے، اسے اسی جگہ بٹھا کر ذاتی نگرانی میں ہضم کرواتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ میاں فضل حسن خوش باش اور محفل باز آدمی تھے اور اپنی صحبت زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ضمیر لنچ سے پہلے اٹھ جاتے یا سہ پہر کو کھڑے کھڑے آتے۔ صبح نو بجے کے پکڑے ہوئے شاعر کو شام چھ بجے

پالتو جانوروں میں کتوں سے پیار ہے۔ پہلا کتا چوکیداری کے لیے پالا تھا۔ اسے کوئی چرا کر لے گیا۔ اب بربنائے وضع داری پالتا ہوں کہ انسان کتے کا بہترین رفیق ہے۔ بعض تنگ نظر اعتراض کرتے ہیں کہ مسلمان کتوں سے بلاوجہ چڑتے ہیں حالانکہ اس کی ایک نہایت معقول اور منطقی وجہ موجود ہے۔ مسلمان ہمیشہ سے ایک عملی قوم رہے ہیں۔ وہ کسی ایسے جانور کو محبت سے نہیں پالتے جسے ذبح کر کے کھا نہ سکیں۔

سے پہلے رہائی نصیب نہیں ہوتی تھی اور شام کو بھی محض اس لیے کہ میاں فضل حسن کے والد گرامی حاجی احمد حسن صاحب غروب آفتاب کے بعد شعر سننے کو مکروہ اور منحوس تصور کرتے تھے۔ بیٹے سے فرماتے تھے کہ اگر ایسا ہی شوق ہے تو مشتاق صاحب کے گھر ان کو لے جا کر باقی ماندہ خرافات سن لو۔ ترنم سے شعر سننے کو بدچلنی کا مترنم آغاز سمجھتے تھے۔ خراب شعر اور خراب ترنم کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ایسی شاعری اور ترنم سے طبیعت میں اشتعال پیدا نہیں ہوتا۔ گھر پر محفل موسیقی کے سخت خلاف تھے۔ اس زمانے میں دوالے کے بعد جب کسی کا گھر قرق یا نیلام ہوتا تھا تو عدالت کا بیلف اس گھر کے سامنے ڈھول بجوا کر دوالے اور نیلامی کا اعلان کرتا تھا۔ حاجی صاحب فرماتے تھے کہ جس گھر میں طبلے پر تھاپ پڑا یا ٹھیکا لگا اس کے سامنے نیلامی کا ڈھول بجے ہی بجے۔ اپنے بیٹے سے کہتے تھے کہ تمھیں فریدہ خانم کا گانا سننا ہے تو مشتاق صاحب کے یہاں شوق سے طبلہ سارنگی بجواؤ۔ دن میں دھوتی تہمد اور رات کو شلوار پہننے کے خلاف معلوم ہوتے تھے۔ انگریزی فلم دیکھنے کو وہ نری بدمعاشی گردانتے تھے۔ لہٰذا جب سنجرے کو بیٹا انگلش فلم کا میٹنی شو دیکھنے جاتا تو قبلہ خود ساتھ جاتے اور ذاتی نگرانی میں مخرب اخلاق فلم ملاحظہ کرواتے۔ میں اور محمد جعفری باری باری باپ اور بیٹے کے درمیان حدِ ادب بن کر بیٹھتے۔ ہم دونوں کا کام پدر و پسر کے درمیان ایک پردے کا سا تھا اور پردہ بھی وہ جسے اس زمانے میں کانا پردہ کہتے تھے یعنی صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں۔ جیسے اسکرین پر کوئی ایسا ویسا سین آتا تو پہلے قبلہ اپنے صاحبزادے کی طرف دیکھتے، پھر ہماری طرف دیکھتے کہ عینک کے پیچھے ہماری آنکھیں کھلی ہیں یا فرط لذت سے بند ہو گئی ہیں۔ وہ بھی صاحب کمال بزرگ تھے۔ ان کی آنکھ Three dimentional تھی۔ مطلب یہ کہ وہ بیک وقت خود وہ سین دیکھتے، کن انکھیوں سے بیٹے کو دیکھتے اور ہماری بدنظری پر بھی نظر رکھتے۔ کسی ایکٹریس کا نیم برہنہ لباس میں کلوز اپ آتا تو صاحبزادے سے کوئی اہم کاروباری سوال پوچھنے لگتے مثلاً آج جو ڈیڑھ سو روئی کی گٹھریاں خریدی ہیں، انھیں ترپال سے ڈھک دیا ہے کہ نہیں۔ ان پر غصہ اس لیے اور زیادہ آتا تھا کہ اس روئی کی ایک بھی گٹھری نہیں خریدی گئی تھی اور گزشتہ سو برس سے اس مہینے میں کبھی بارش نہیں ہوئی تھی اور یہ دونوں باتیں قبلہ کے علم میں تھیں! انھیں انگریزی نہیں آتی تھی۔ نظر انگریزی سے بھی زیادہ کم زور تھی! جیسے ہی اسکرین پر کوئی عورت نظر آتی تو ہم سے پوچھتے ''مشتاق صاحب اس کی کیا عمر ہو گی؟'' ہم دس بارہ برس کم کر کے بتاتے تو اکثر فرماتے کہ امریکن لڑکے لڑکیاں اتاولے باؤلے ہوتے ہیں۔ روزے فرض ہونے کی عمر سے پہلے ہی بدمعاشی شروع کر دیتے ہیں۔

> اور یہ منزل بھی عجیب ہے۔ بقول صاحب ''کسکول'' ایک وقت تھا کہ ہمارا تعارف بہو بیٹی قسم کی خواتین سے اس طرح کرایا جاتا تھا کہ فلاں کے بیٹے ہیں۔ فلاں کے بھانجے ہیں اور اب یہ زمانہ آ گیا ہے کہ فلاں کے باپ ہیں اور فلاں کے ماموں۔ اور ابھی کیا گیا ہے۔ عمر رسیدہ پیش رو زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے آگے مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں۔
>
> **مشتاق احمد یوسفی**

امریکن مستورات شوہر کے مرنے کا انتظار نہیں کرتیں! ایک مرتبہ اسکرین پر ایک انتہائی جذباتی سین آیا۔ بوس و کنار ہوا چاہتا تھا۔ حاجی صاحب نے میرا اچھلتا ہوا ہاتھ اپنے کانپتے ہاتھ میں لے کر پوچھا ''یہ زنانی اتنی پریشان اور بے قرار کیوں ہے؟'' میں نے کہا ''محبت ہو گئی ہے'' بولے ''تو پھر نکاح کیوں نہیں کر لیتی؟''

جو مقامات آہ و فغاں میں اپنی ناقص اردو حاجی صاحب کو نہیں

سمجھا پاتا تھا وہ محمد جعفری ٹھیٹ پنجابی میں ذہن نشین کرا دیتے تھے۔ وہ پنجابی اور فارسی بہت روانی سے کھرے اور کرارے لہجے میں بولتے تھے۔

ضمیر جعفری کہتے تھے کہ جتنی دیر آپ حضرات فلم دیکھ کر بنانے والے پر لعنت بھیجتے ہیں اتنی دیر میں تو آدمی پنڈی سے مری اور مری سے نتھیا گلی جا سکتا ہے۔ مغز ملی نہاری کھا کر ۳ گھنٹے سو سکتا ہے۔ کسی دوست کا سچا خاکہ لکھ کر اسے ہمیشہ کیلیے گنوا سکتا اور اسی قسم کے بہت سے مفید کام کر سکتا ہے۔

لیکن صرف فلم دیکھنے سے کس روسیاہ کو غرض تھی۔ اس زمانے میں ایر کنڈیشننگ عام نہیں تھی۔ صرف ہسپتالوں کے آپریشن تھیٹرز ایر کنڈیشنڈ ہوتے تھے لیکن اس سے مستفید ہونے کے لیے پہلے بے ہوش ہونا ضروری تھا البتہ سینما ہال میں یہ شرط نہیں تھی۔ لہٰذا رمضان کے مہینے میں کوئی فلم قضا نہیں ہوتی تھی۔ اس عمل کو روزہ بہلانا کہتے تھے۔ ضمیر جعفری کہتے تھے کہ آپ لوگ فلم کو چسنی کی طرح استعمال کرتے ہیں، جب کہ محمد جعفری فرماتے تھے کہ ایسے ویسے سین کے بعد اگر تین مرتبہ قرأت سے لاحول پڑھ لی جائے تو معافی و مغفرت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔

حاجی صاحب سرد و گرم چشیدہ اور جہاں دیدہ بزرگ تھے۔ اپنے بیٹے کے دوستوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ عاجز کو بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس لیے کہ میری قلیل تنخواہ، خراب صحت اور ۱۲۰ پاونڈ وزن کو بد چلنی کے لیے نا اہلی کا سرٹیفکیٹ تصور کرتے تھے۔ بیٹے کو نصیحت کی تھی کہ جو شخص بہت اچھے کپڑے پہن کر یا دھوپ کا چشمہ لگا کر آئے اسے ادھار مال ہرگز نہ بیچو۔ اسی طرح جو شخص تم سے بلا وجہ بہت اخلاق و انکسار سے پیش آئے اس سے ہوشیار رہو۔ وہ ایک نہ ایک دن تم سے قرض ضرور مانگے گا۔ ضمیر بھائی سے ان کی خوب بنتی تھی۔ اس کی کئی وجہیں تھیں۔ ضمیر سگریٹ نہیں پیتے اور زیادہ دیر نہیں بیٹھتے تھے۔ جہلم کے تھے۔ وہی جہلم جہاں کے لوگ بہ قول ان کے خدا کے تصور کے لیے تھانے دار کو دیکھتے ہیں۔ حاجی صاحب جہلم کو چنیوٹ خورد گردانتے اور ضمیر جعفری سے خوردوں کا سا برتاؤ کرتے۔

ضمیر جعفری، حاجی صاحب کو اپنے بزرگ حضرت میاں محمد بخش کے پنجابی اشعار ترنم سے سناتے۔ وہ یعنی حاجی صاحب ضمیر جعفری کی ''لکڑی کی ہٹ'' اور محمد جعفری کی ''بھنگیوں کی ہڑتال'' بڑے شوق سے سنتے۔ اکثر فرماتے کہ ایسی شاعری میں کوئی حرج نہیں۔ نقصان نہیں پہنچاتی۔ ان کے صاحبزادے میاں فضل حسن بھی ہومیو پیتھک دوائیں محض اس لیے کھاتے تھے کہ نقصان نہیں پہنچاتیں! اس کی تصدیق تو ہم بھی کریں گے کہ مرض کے جراثیم کو نقصان نہیں پہنچاتیں۔ ضمیر جعفری ان سے لطیفے نہیں سنتے تھے۔ انھیں بات میں بات نکالنے کا فن آتا تھا۔ ان سے مل کر آپ کو اپنی اور ان کی عمر کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک سے جھک کر ملتے مگر بچھتے کسی سے نہیں تھے۔ وہ پہلے فوجی تھے جس نے اپنی درویشی چھپانے کے لیے یونی فارم پہنی۔

جس دن مولانا ماہر القادری، ضمیر جعفری اور محمد جعفری یک جا ہوں تو کمرے کی ہر دیوار و دیوار قہقہہ بن جاتی۔ شعر و شاعری ملتوی، نوک جھونک، فقرے بازی اور قہقہوں کے سوا کچھ نہ سنائی دیتا۔ بعض اوقات مولانا کو اپنا مذاق اڑوانے اور چاند ماری کا ہدف بننے میں بھی مزہ آتا تھا اور ادبدا کر اس کا مواد و جواز خود مہیا کرتے۔ شاید یہ بھی اللہ کے بندوں کا دل شاد کرنے کی ایک صورت نکالی تھی۔ اتوار کے دن مولانا لباس کے معاملے میں لاپروا نظر آتے تھے۔ ہفتے کے بقیہ دنوں کے بارے میں کچھ عرض نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ ان دنوں ان سے صرف اتواری کو ملاقات ہوتی تھی (وہ مجھے بھری محفل میں دو مرتبہ ٹوک چکے تھے کہ لاپروا غلط ہے صحیح بے پروا ہے مگر مجھے تو آج بھی بے پروا میں وہ لاپروائی والی شان اور بے ڈھنگا پن نظر آتا تھا) گرمیوں میں مولانا ململ کے مسلے کرتے اور پاجامے میں بھی بارعب نظر آتے تھے۔ ازار بند اکثر لٹکا رہتا اور کرتے کے نیچے صاف نظر آتا۔ ایک مرتبہ ضمیر جعفری نے ٹوکا تو فرمایا ''گرہ تو مضبوط ہے۔''

ضمیر بولے ''آپ کے عقیدے کی طرح۔۔۔!''

سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

ایک دن مولانا ذرا تاخیر سے آئے تو گھبرائے، گھبرائے

ہے۔ میں ایک ایسے بڑے افسر سے واقف ہوں جو ایک زمانے میں میرے فدویانہ خلوص میں لتھڑے ہوئے ہاتھ کو مصافحہ کے لیے اپنی انگشتِ شہادت کی پہلی پور سے اس طرح چھوتے تھے جیسے ٹب میں انگلی ڈال کر کھولتے پانی کا ٹمپریچر دریافت کر رہے ہوں، نہاؤں کہ نہ نہاؤں؟ اب انہیں بھی ریٹائرڈ ہوئے ۱۴ برس ہو گئے۔ کبھی ملتے ہیں تو خود بڑھ کر بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوتے ہیں۔

اگر آپ کسی بڑے سرکاری Reception میں ایک کونے میں کھڑے ہو کر صرف یہ دیکھتے چلے جائیں کہ مایا سے مایا کر کر لمبے ہاتھ کیسے مل رہی ہے۔ کون کس سے کس طرح ہاتھ ملا رہا ہے تو آپ کو کھڑے کھڑے پتہ چل جائے گا کہ کون صاحب اختیار و اقتدار ہے۔ کون اہل غرض اور حاجت مند ہے۔ کس کی کور کس سے دبتی ہے۔ کس کی گدی چڑھتی ہے اور وہ جو شامیانے سے باہر قنات کے بانس کا سہارا لیے کھڑا ہے، وہ پرسوں ہی او ایس ڈی بنایا گیا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب کارِ جہاں تمام ہوگا اور عالم بالا میں ان سے ملاقات ہوگی تو وہ اسی روح کو گرما دینے والے نعرے سے خیر مقدم کریں گے۔ جناب! جنت تو ادھر ہے۔ آپ دوسری طرف کیوں جا رہے ہیں؟ ممتاز حسن مرحوم

جب بھی اسلام آباد جاتے تو ضمیر جعفری اور Limerick والے نذیر احمد شیخ کے ساتھ ایک بے تکلف اور پر لطف شام ضرور گزارتے۔ ''راندے ووُ'' اگر وہ کینٹ ہوتا تو ممتاز حسن صاحب فرمائش کر کے دال پکواتے جسے دری پر دسترخوان بچھا کر نوش کیا جاتا۔ ضمیر جعفری نے ایک ڈنر میں میرا تعارف شیخ صاحب سے کرایا۔ وہاں انہوں نے اپنی مشہور لمرک ''ارتقائے زبان'' سنائی۔ آپ بھی سنیئے۔

بس گئے پنجاب میں روئی کوروں کہنے لگے
دلبران لکھنؤ ''اوئی'' کو ''اوں'' کہنے لگے
آج کل رنگِ زباں کچھ اور ہے
شوخی و حسن بیاں کچھ اور ہے
آپ کو تم، تم کو تو اور تو کو توں کہنے لگے

اسلام آباد میں ایسی ہی ایک صحبت میں ممتاز حسن صاحب نے اپنے دوست پنڈت ہری چند اختر کا ایک شعر سنایا ۔

خدا تو خیر مسلماں تھا، اس سے کیا شکوہ
مرے لیے مرے پرماتما سے کچھ نہ ہوا

دورانِ گفتگو ضمیر جعفری نے بیان کیا کہ پنڈت ہری چند کی کسی سے ملاقات ہوتی تو کبھی آداب عرض، مزاج شریف، مزاج عالی، کیسی طبیعت ہے یا کیسے ہو؟ نہیں کہتے تھے، اس کے بجائے چھوٹتے ہی پوچھتے تھے ''کیا تکلیف ہے؟'' ان کی دیکھا دیکھی ان کے

ایک دفعہ میں نے منظور الٰہی صاحب سے عرض کیا ''آپ نے اپنی دونوں کتابوں میں فارسی کے نہایت خوبصورت اشعار نقل کیے ہیں۔ لیکن میری طرح قارئین کی نئی نسل بھی فارسی سے نابلد ہے۔ یونہی شد بد اور اٹکل سے سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں تو مطلب فوت ہو جاتا ہے۔ اگر اگلے ایڈیشن میں بریکٹ میں ان کا مطلب اردو میں بیان کر دیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔'' سوچ میں پڑ گئے۔ پھر آنکھیں بند کر کے، بند ہونٹوں سے اپنے دلآویز انداز میں مسکرائے، فرمایا ''مگر بھائی صاحب، پھر مقصد فوت ہو جائے گا!''

برصغیر کے بعض پسماندہ علاقوں میں اب تک یہ دستور چلا آرہا ہے کہ برادری کی تمام بوڑھیاں کسی کے ہاں غمی میں شریک ہوتی ہیں تو لمبا سے گھونگھٹ کاڑھ کے بیٹھ جاتی ہیں اور اپنے اپنے پیاروں کے نام لے کر بین کرتی دھاڑتی ہیں۔سب اپنے اپنے مردوں کی خوبیاں بیان کر کے خشک آنسوؤں سے روتی ہیں۔اگر کوئی ناواقف حال پہنچ جائے تو وہ ایک گھنٹے بین سن کر بھی یہ فیصلہ نہیں کرسکتا کہ اس مجلس آہ وبکاہ میں دوڈھائی سو مردوں میں * آج کا مرحوم خصوصی کون ہے۔

مداحین و مقربین بھی مزاج شریف کے بجائے ''کیا تکلیف ہے؟'' کہنے لگے۔

ہمیں یہ انداز پرسش حال کہیں زیادہ سچا، ہمدردانہ وحقیقت پسندانہ اور ڈائریکٹ لگتا ہے۔ اس کی تہہ میں صداقت پر مبنی یہ مفروضہ ہے کہ اگلے کو تکلیف تو یقیناً ہے۔صرف اس کی نوعیت معلوم کرنی مقصود ہے۔

ہمارا بس چلے تو مزاج شریف اور کیسی طبیعت ہے؟ کے بجائے کیا تکلیف ہے؟ کو National ordinance for salvation کے ذریعے کم از کم ۹۰ دن کے لیے قانوناً لازمی قرار دے دیں۔پچھلے تیس، چالیس برسوں میں ہمارا جو احوال ہوا، اس کی پرسش اور مداوا کے لیے اس سے بہتر حال پرسی کا کوئی فقرہ نہیں ہوسکتا۔ٹریجڈی یہ ہے کہ بنی نوع انسان کے مصائب کی تمام تر ذمہ داری انسان پر ہی عائد ہوتی ہے جو آپ اپنا مسبب المصائب ہے!

کچھ عرصے بعد میں نے اس تجویز کا ذکر ضمیر جعفری سے کیا تو اپنے مخصوص انداز میں ''اوہو ہو'' کہنے کے بعد فرمایا کہ Ordinance کے sub section 5 (c) میں یہ شرط لگا دی جائے کہ جواب میں کوئی شخص ایک سے زیادہ تکلیف بیان نہ کرے ورنہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ ہاتھ میں لیے گھنٹوں کھڑے تکلیفیں گنواتے رہیں گے۔

ان کی انسان دوستی، محبت، رواداری اور درگزر ایک ایک سطر سے جھلکتی ہے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ خاکوں پر مشتمل ان کی پانچ کتابیں ہیں جن میں کم وبیش ۵۰ خاکے ہیں۔شخصیت کا کوئی تضاد اور بوالعجبی، معاشرے کی ناہمواری اور کردار کی مضحک پہلوان کی نظر سے نہیں بچتا۔لیکن وہ تصویر بناتے وقت سیاہ رنگ استعمال نہیں کرتے۔ بلکہ دھیمے، گاتے، گنگناتے، پیسٹل رنگوں سے پورٹریٹ بناتے ہیں۔ باس اور ماتحت کا رشتہ بہت پیچیدہ، اکثر ناہموار اور بعض اوقات صبر آزما اور بہت جلد آگ پکڑنے والا ہوتا ہے۔ جس کے لیے بالعموم Hate and love relationship کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔یعنی پیار، پھنکار، لاچاری وناچاقی کا ناتا ہوتا ہے۔ضمیر جعفری کا اوج کمال، وسیع القلبی اور حسِ مزاح کا شاہکار دیکھنا ہو تو ''حفیظ نامچہ'' پڑھیئے۔اردو ادب میں اگر کسی کو Boswell یا Pepys کہا جاسکتا ہے تو وہ صرف اور صرف ضمیر جعفری ہیں۔ انہوں نے حفیظ جالندھری کو اپنی تمام دل آویز کم زوریوں کے ساتھ نظروں کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ یہی اعجازِ مسیحا ''سنگاپور کا میجر حسرت'' والے چہچہاتے خاکے میں نظر آتا ہے۔ میں ان کے انداز بیان کو Tongue in the cheek تو نہیں کہوں گا کہ اس میں طعن کا شائبہ محسوس ہوتا ہے۔ان کا قلب بین السطور مسکراتا رہتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ ان کے ہاں پولیٹیکل کمنٹ نہیں ملتا اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔وہ کہنے کی سب باتیں ہنسی ہنسی میں کہہ جاتے ہیں۔یوں بھی اردو غزل کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ

حکومت میں، میرا مطلب ہے ہر حکومت میں، جتنی بھی خوبیاں اور خرابیاں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب اردو غزل کے معشوق سے مستعار لی گئی ہیں؟ مثلاً دوست، دشمن میں تمیز نہ کرنا، خیر خواہوں سے دور رہنا، ملاقات سے ڈرنا، رقیبوں اور خوشامدیوں میں گھرے رہنا، وعدہ کر کے صاف مکر جانا، سچے عاشق کے مرنے کے بعد اس کا سوگ منانا اور تعریف کرنا وغیرہ۔ غرضیکہ ہر شعر چسپاں ہوتا ہے۔

> مزاح کو میں دفاعی میکنزم سمجھتا ہوں۔ یہ تلوار نہیں، اس شخص کا زرّہ بکتر ہے جو شدید زخمی ہونے کے بعد اسے پہن لیتا ہے۔ زین بدھ ازم میں ہنسی کو گیان کا زینہ سمجھا جاتا ہے۔ لیکن سچ پوچھیے تو اونچ نیچ کا سچا گیان اس سمے پیدا ہوتا ہے جب کھبے پر چڑھنے کے بعد کوئی نیچے سے سیڑھی ہٹا لے۔ مگر ایک کہاوت یہ بھی سنی کہ بندر پیڑ کی پھننگ پر سے زمین پر گر پڑے تب بھی بندر ہی رہتا ہے۔

شخصیت کے نمایاں Contours ہوں یا کسی سچویشن کے مضحک پہلو، فوجی یا دیہی زندگی کی عکاسی ہو یا بوالعجبیوں اور تضادات و ناہمواریوں کا ذکر۔ وہ چند لفظوں میں پوری تصویر کھینچنے اور سماں باندھنے پر حیرت انگیز قدرت رکھتے۔ فضا بندی کے لیے وہ لمبے چوڑے میورل یا فریسکو نہیں بناتے بلکہ کسی ترچھے اور تیکھے چغل خور زاویے سے لیے گئے چند اسنیپ شاٹس سے صحبت یاراں کی گل فشانی، گفتار، اسلوب حیات اور زندگی کے مختلف قرینوں کا ہنستا بولتا مرقع پیش کر دیتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو کراچی نے چند برس قبل ان کے اعزاز میں جو یادگار تقریب منعقد کی تھی اس میں انہوں نے ایک بہت دلچسپ تقریر کی۔ اب ذرا اس کمال فن کی داد دیجئے کہ قلم برداشتہ لکھی ہوئی ۷ سطروں، جی ہاں کل ۷ سطروں میں کتنا کچھ سمو دیتے ہیں۔

''روئیں میں ستار کے تاروں کی طرح بولنے لگی... اور میں مسرت کی سرشاری سے گویا نڈھال ہو گیا... صرف 3 موقعوں پر محسوس ہوا۔۔۔ اول اس دن جب میرے گاؤں کے مڈل اسکول کے طلبہ۔۔۔ جس کے پھٹے پرانے ٹاٹوں پر بیٹھ کر میں نے ''گاچنی مٹی'' سے پوچی ہوئی تختی پر اپنی زندگی کا پہلا ''الف'' لکھا تھا... میرے استقبال کے لیے ڈھول کی سنگت پر دھمال ناچتے ہوئے۔۔۔ کھیتوں میں نکل آئے اور پھر ہیڈ ماسٹر کی سرپرستی میں ان بچوں نے۔۔۔ مٹی کی چاٹیوں میں رڑکی ہوئی گھر کی بھینسوں کا تازہ مکھن سے مالا مال لسی کے ساتھ تازہ دیسی مکھن میں گتھے شرابور اسی طرح کے سہ منزلہ پراٹھے کھلائے جیسے تقریباً ۷۰ برس قبل میری ''بے جی'' مجھے مدرسہ کو روانہ کرتے وقت رومال میں باندھ کر آدھی چھٹی میں کھانے کے لیے دیا کرتی تھی۔ پھر گزشتہ برس نومبر ۱۹۹۲ء میں وہ موقع میری عظیم مادر علمی اسلامیہ''

اس تقریر اور اس شام کا اختتام جو ان کے نام تھی اپنے ہی اس شعر پر کیا۔

کتنی تصویروں کے ساتھ آئی ہے شام زندگی
وقت جب کم رہ گیا تو کام یاد آئے بہت

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اپنے کرنے کے کام وہ تمام کر گئے اور ہر کام بڑی رسان سے ہنستے بولتے کیا۔ بحسن و خوبی کیا اور شعر و ادب کا اتنا بڑا اور وقیع و نادر ورثہ چھوڑ گئے کہ ہم سے سنبھالے نہیں سنبھلتا۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے

ارمغانِ ابتسام کا اگلا شمارہ نئے قہقہوں کے ساتھ

اُردو طنز و مزاح پر مبنی دو ماہی برقی مجلّہ

ارمغانِ ابتسام

ستمبر، اکتوبر ۲۰۱۸ء

مُدیر:

نوید ظفر کیانی